دامانِ خلافت ذی النورین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے
شواہدِ تقدس
حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ
محدث، فقیہ، مؤرخ، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کتب کثیرہ

داماد خلافت ذی النورین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے

شواہدِ تقدس

اور

تردیدِ الزامات

مودودی صاحب کی کتاب "خلافت و ملوکیت" کے جواب میں
بصیرت افروز محققانہ مباحث کا مجموعہ

از

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ
محدث، فقیہ، مورخ، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کتب کثیرہ

متصل مسجد پائیلٹ ہائی سکول، وحدت روڈ، لاہور۔ فون: ۰۴۲-۵۴۲۷۹۰۱-۲
E-Mail: julpak@wol.net.pk

Shawahide Taqadus
By
Maulana Mohammad Mian
ISBN: 978-969-8793-73-9

ضابطہ

نام کتاب	شواہدِ تقدس
اشاعتِ جدید	مارچ ۲۰۰۸ء
اشاعت دوم	اپریل ۲۰۱۰
تالیف	مولانا سیّد محمد میاں رحمہ اللہ تعالیٰ
ناشر	محمد ریاض درانی
کمپوزنگ	جمعیۃ کمپوزنگ سنٹر، وحدت روڈ لاہور
مطبع	اشتیاق اے مشتاق پریس' لاہور
قیمت	-/250 روپے

بہ اہتمام	محمد بلال درانی
قانونی مشیر	سید طارق ہمدانی (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

فہرست

عرضِ ناشر

اُمت مسلمہ کی تاریخ میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کو خیر القرون تسلیم کیا جاتا ہے۔ صحابہ اس عہد کے لوگ تھے انھیں ان کے رب نے اپنے رسول اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لیے چن لیا تھا۔ ان عظیم المرتبت لوگوں کو تاریخ ہمیشہ حیرت سے تکتی رہی ہے۔ یہ لوگ کردار اور عمل کی اُن بلندیوں پر فائز تھے کہ لوگ اس مقام پر پہنچنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ پھر کبھی ایسے لوگ نہ دنیا میں آئے، نہ اس بات کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ

لوگ تھے جن کے بارے میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ لوگ ستاروں کی مانند ہیں جس کسی کی اقتداء کرلو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ یہ نجوم ہدایت تاریخ کے اُفق پر آج بھی جگمگا رہے ہیں۔

برصغیر میں کالونیل معاشرہ کیا پیدا ہوا کہ لوگوں کا ذوق اور ضمیر ہی بدل گیا۔ اب ایسے لوگ پیدا ہونے لگے کہ ان صحابہ کے عہد کی تاریخ لکھنے بیٹھے اور ان عظیم المرتبہ لوگوں پر نقد کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ ایک زمانہ تھا کہ محدثین **الصحابة کلهم عدول** کہہ کر بات ختم کردیتے تھے۔ اب انہی صحابہ پر نقد کرنے والے لوگ بھی سامنے آئے۔ یہ لوگ منکر اسلام سمجھے جاتے تھے اور ان میں سے ایک شخصیت سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی تھی۔ مولانا ایک طرف خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کے دعویدار تھے۔ دوسری طرف ان کے نزدیک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غنی خلافت راشدہ کے معیار مطلوب پر پورے نہ اُترتے تھے۔ قارئین سوچتے ہوں گے کہ الٰہی مولانا مودودی کا یہ کیسا بلند معیار ہے یہ کبھی برسر اقتدار آ گئے تو کیا کارنامے سرانجام دیں گے۔ اہل نظر ڈرتے تھے کہ کہیں یہ برسر اقتدار نہ آ جائیں۔ اگر آ گئے تو ان کا معیار بہت

خوفناک ہوگا۔ انتہائی بلندیوں کے دعویدار عملاً پستیوں پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ یہی ہوا کہ جماعت اسلامی کے معیار مطلوب پر جنرل ضیاء الحق پورے اُترے اور اپنے ریفرنڈم سمیت پورے اُترے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خلافت پر معروف مگر نامقبول کتاب خلافت وملوکیت جب سے آئی ہے اس پر بہت سے بزرگوں نے قلم اُٹھایا ہے۔ ان بزرگوں کا مقصد مولانا مودودی کی تردید نہیں تھا، صحابہ کی تعدیل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تردیدی کتابیں اکثر محبت وعقیدت میں سرشار لوگوں نے لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔ جماعت اسلامی کے لوگوں کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ کوئی شخص مولانا ابوالاعلیٰ پر نقد کرے۔ اس سلسلے میں یہ دلائل کی معقولیت کو مدنظر نہیں رکھتے، مولانا سے عقیدت میں مبتلا رہ کر سوچتے ہیں۔ مولانا محمد میاں کی تحریر صحابہ کی تعدیل بھی ہیں، مولانا ابوالاعلیٰ کی ذہنی غلامی میں مبتلا لوگوں کے لیے دعوت حق بھی۔ مولانا محمد میاں صحابہ کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگ مولانا مودودی کی ذہنی غلامی کے ابتلا سے نکل کر صحابہ کی ذہنی غلامی میں آ جائیں کہ یہ غلامی دراصل ان کے محبوب ومطلوب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذہنی غلامی ہے۔ کاش ہم سب کو یہ غلامی عطا ہو جائے۔

پروفیسر امجد علی شاکر ایک جدید سکالر ہیں جنھوں نے عہد جدید کی سیاسی اور فکری تحریکوں کا وسعت نظر اور عمیق فکری سے مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کے مقدمے میں مولانا ابوالاعلیٰ کے ذہن اور فکر کا تجزیہ کیا ہے۔ خلافت وملوکیت میں مولانا مودودی کے تجزیے اور تبصرے کا تعلق ان کے فکری نظام سے قائم کیا اور یوں یہ مقدمہ مولانا ابوالاعلیٰ کی فکر اور نظریات کو سمجھنے میں مدومعاون ہو جاتا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے قارئین اس کتاب اور مقدمے سے استفادہ کریں گے اور یقیناً صحابہ کی عظمت اور اسلام میں ان کی اہمیت کو تسلیم کر کے راہِ حق کے راہرو بن جائیں گے۔

والسلام

محمد ریاض درانی

مسجد پائلٹ ہائی سکول وحدت روڈ' لاہور

حرفِ چند

حامداً ومصلیاً ومسلما

خاکسار امجد علی شاکر عرض پرداز ہے کہ جہاں تک تاریخ وسیاست کا مطالعہ کیا جائے، یہی نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ سرمایہ داری نظام کا یہ بنیادی اصول ہے کہ سرمایہ دار اپنی انسانیت رضا کارانہ طور پر چھوڑ دیتا ہے اور وہ صرف سرمایہ دار رہ جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مزدور سے اُس کی انسانیت چھین لیتا ہے اور اُسے انسان سے کمتر سطح پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ واضح رہے کہ سرمایہ، سرمایہ داری اور سرمایہ دار کی اصطلاحات جدید علم معاشیات کے عطا کردہ مفہوم میں استعمال کی جا رہی ہیں۔ ان کے لیے انگریزی میں Capitalism, Capital اور Capitalist کی اصطلاحات مروج اور متعارف ہیں۔ یہ اصول کچھ مزید واضح، مزید کڑا اور خوفناک ہو جاتا ہے جب سرمایہ داری نظام کے ممالک سامراج (Imerialist) بن جاتے ہیں۔ سامراج نو آبادی یعنی Colony کے لوگوں کی انسانیت بہت بری طرح مسخ کر دیتا ہے اور نہ صرف مسخ کرتا ہے، بلکہ ایک ایسا طبقہ بھی پیدا کرتا ہے جو پیدائشی طور پر اسی نو آبادی کے باشندے ہوتے ہیں، مگر فکر کے اعتبار سے سامراج کے گماشتہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ پورے خلوص سے نوبآادی کے باشندوں کو اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ وہ نہ صرف انسان نہیں ہیں، بلکہ اچھی قسم کے جانور بھی نہیں ہیں۔ اُن کے مقابلے میں سامراجی آقا نہ صرف انسان ہیں، بلکہ اعلیٰ تر قسم کی مخلوق ہیں اور انھیں آقائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ آقا بھی انسان نہیں اور غلام بھی۔ آقا عام انسان سے کہیں برتر قسم کی مخلوق ہیں اور غلام بدترین قسم کی مخلوق۔ اس صورتِ حال میں یہ وقت کا تقاضا ٹھہرتا ہے کہ یہ دعا کی جائے کہ آقا کی حکومت ابدالآباد

تک قائم رہے۔اس کی بے شمار عملی مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔سر سیّد احمد خاں کی تقریریں اور مضامین پڑھ لیجیے کہ وہ غلام ہندوستان کے باشندوں کو کیا ٹھہراتے ہیں اور انگریز آقاؤں کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔

برصغیر کے غلام مسلمانوں کی موجودصورتِ حال تو یقیناً قابل رشک نہ تھی، مگر ان کی تاریخ تو بہت عمدہ اور اعلیٰ معیار کی تھی۔خلافت راشدہ کا عہد تو اب تک مسلمانوں کے خوابوں میں بسا ہوا تھا۔قرآن مجید کی آیات تو مسلمانوں کے لیے ہمیشہ ذہنی سہارا رہی ہیں:

محمدٌ رسول الله والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم تراهم رکعًا سجداً یبتغون فضلا من الله ورضواناً

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے صحبت یافتہ وہمراہی ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔اے مخاطب تو (ان کو کبھی) رکوع اور (کبھی) سجدے کی حالت میں دیکھے گا۔ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔''

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے والذین معه کا مصداق سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو، اشدا علی الکفار کا مصداق سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو رحماء بینهم کا مصداق سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اور تراهم رکعاً سجداً کا مصداق سیّدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کو ٹھہرایا۔انھی چار صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کا دور خلافت راشدہ کہلاتا ہے اور تاریخ انسانی میں مسلمانوں کا واحد سرمایہ ہے۔غلامی میں تاریخ ہی حوصلہ دیتی رہی ہے۔یہود اب تک حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام کی حکومتوں کے خواب دیکھتے اور انھی سے حوصلہ تلاش کرتے ہیں۔مسلمانوں کے پاس یہی خلافت راشدہ ایک ذہنی سہارا ہے اور اسی سے وہ زندہ رہنے کا حوصلہ پاتے ہیں۔گویا مسلمانوں کے لیے صحابہ کرام صحرا کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کی طرح ہیں جو انھیں زندہ رہنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔

سامراجی حکمرانوں نے مقامی لوگوں کو اقتدار سے محروم کیا تھا۔سامراجی انتظامیہ نے

نظامِ حکومت سنبھال لیا۔ ایک کام ان مغربی علماء کے کرنے کا تھا جو مشرقی علوم کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ جنھیں مستشرقین کہا جاتا ہے۔ یہ بظاہر بہت مخلص، بہت ہمدرد، بہت ماہرین تھے۔ یہ بیچارے مغرب میں پیدا ہوئے۔ پورے خلوص سے مشرق کا مطالعہ کیا اور پوری ہمدردی سے مشرق پر اپنے مطالعات پیش کیے۔ ان علماء نے عہد صحابہ پر کام کیا اور خوب ہاتھ صاف کیا۔ لے دے کے مسلمانوں کے پاس خلافت راشدہ کا سہارا بچا تھا۔ اب اُس عہد کا تحقیقی مطالعہ یہ سامنے آیا:

کس کو جرأت ہے کہ اس کو لکھے کہ ''حضرت عثمانؓ نے سب چیزوں کو غارت کر دیا۔ حضرت ابو بکر تو برائے نام بزرگ آدمی تھے''۔ (خطوط سرسیّد، صفحہ:۱۸۳)

لیجیے صاحب اسلامی تاریخ میں ایک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ باقی بچے۔ گویا عہد صحابہ کا ذہنی سہارا بھی رخصت ہوا۔ یہ تھا عہد سرسیّد کا فکری حاصل۔ اب مسلمانوں کے لیے راہ ہدایت صرف یہی باقی رہی تھی کہ وہ سرسید کی بات مانیں اور انگریز پرنسپل جو کچھ کہہ رہے ہیں، اُس کو تقدیر کا لکھا خیال کریں۔ گویا علی گڑھ کے انگریز پرنسپل مسٹر بیک کی بات ہی آخری بات ہے۔ ورنہ ان کے لیے نہ تاریخ سے سہارا رہا ہے اور نہ سیاسیات کی دنیا سے۔ یہ تھی کالونیلزم کی نظریہ سازی کا حاصل۔

بیسویں صدی شروع ہوئی تو دنیا بدلنے لگی۔ اب سرسیّد کے علی گڑھ سے بھی آزادی کی آوازیں اُٹھنے لگیں۔ علی گڑھ کے پرنسپل جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں دیوبند تشریف لائے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ سے متاثر ہوئے اور ان کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ نظارۃ المعارف دہلی میں مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ نے علی گڑھ کے طلبہ کو قرآن پڑھانا شروع کیا اور دیوبند والوں کو انگریزی۔ لیجیے صاحب! دنیا ہی بدلنے لگی۔ اب سرسید کی سادگی کی جگہ افادات مہدی والے مہدی افادی الاقتصادی اور محشر خیال والے سجاد انصاری کی نثر کا چرچا ہو رہا تھا۔ اردو ادب میں رومانی تحریک ابھر رہی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ غلام ہندوستان کے لوگوں نے کروٹ لی اور کچھ نوجوان جنگ میں شرکت اور ترکی کی مدد کے لیے ترکی کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت شیخ الہند کے تلامذہ نے ریشمی رومال کی تحریک کے

ذریعے ہندوستان کو آزاد کرانا چاہا۔ گویا اس صدی میں ایک نئی دنیا کے آفتاب و ماہتاب کے طلوع کی اُمید جنم لینے لگی۔

۱۹۱۷ء کے اکتوبر انقلاب میں ایک نیا نظام وجود میں آیا۔ اس نظام کے بارے مین خبر آئی کہ روس اور دیگر ریاستوں نے مل کر سوویت یونین کی بنیاد ڈالی ہے۔ قفس کے مکینوں کو باہر سے آنے والی خبریں بہت لبھاتی ہیں۔ فیض احمد فیض نے کیا خوب کہا ہے:

ہم اہل قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیم صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

سوویت یونین کس نے دیکھا تھا، بس ایک بات تو یہ سننے میں آئی کہ وہاں مزدوروں نے حکومت قائم کر لی ہے۔ لیجیے صاحب! ایک طبقہ اسی بات پر لہلوٹ ہو گیا۔ حسرت موہانی نے سوویت کو عربی لفظ سویہ قرار دیا اور کہا:

لازم ہے یہاں غلبہ آئین سوویٹ
دو چار برس میں کہ دس بیس برس میں

اسی طرح علامہ اقبال نے لینن کو خدا کے حضور میں لا کھڑا کیا اور مارکس کے بارے میں کہا:

''نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب''

ایک اور خبر آئی کہ سوویت یونین میں مذہب، دین دھرم ممنوع ٹھہرا ہے۔ امام بخاری کے دیس میں مسجدیں مقفل ہو گئی ہیں۔ یہ سُن کر ایک دوسرا گروہ سخت ناراض ہو گیا۔ ان کی نظر میں اب اسلام کا متضاد کفر نہیں سوشلزم تھا۔

خیر سوویت یونین کا غلغلہ ابھی فضا میں گونج رہا تھا کہ اٹلی اور جرمنی کی آمریتیں وجود میں آئیں۔ ان کا شور بھی بہت رہا۔ انھوں نے اُس امپریلزم کو للکارا جو ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا۔ غلام ملک کے باسیوں کو اس بات سے حوصلہ ملا۔ اس سے کہیں بڑی حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ مزدوروں کی جماعت نے زار کا تختہ اُلٹ کر وہاں زیردستوں کی حکومت قائم کر لی ہے۔ اب کیا یہ ممکن نہیں کہ برصغیر میں امپریلزم کی جگہ قومی حکومت قائم کر دی جائے۔ حوصلہ افزا باتیں تو اور بھی بہت تھیں۔ جاپان نے ۱۹۰۵ء میں روس پر حملہ کر کے جنگ جیتی تھی تو بھی حوصلہ ہوا تھا

اور یہ خیال بھی ذہنوں پر دستک دینے لگا تھا کہ ایشیا والے یورپ والوں سے جنگ لڑ بھی سکتے ہیں، جیت بھی سکتے ہیں۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے دوسری بار حوصلہ دیا۔ تیسری بار مسولینی اور ہٹلر نے کیا خوب حوصلہ افزا بات کی تھی کہ مغربی یورپ کو للکارا تھا۔ علامہ اقبال نے مسولینی کی زبان سے مغربی یورپ کو کہا تھا:

پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھتے تھے تم، میں روا رکھتا ہوں آج

خیر دو باتیں ایسی کھل کر سامنے آئیں کہ غلام ہندوستان کے لوگوں کی سوچ کے زاویے متعین کر دیے۔ پہلی بات تو یہی تھی کہ مغرب نے بتا دیا تھا کہ اُس کے پاس نظام ہیں، جن کے سہارے وہ حکومت کا نظام چلا سکتا ہے جبکہ ایشیا ان نظاموں سے محروم رہا ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اصل چیز دنیاوی شان و شوکت اور غلبہ و ترقی ہے۔ جب یہ نہیں تو باقی سب کہانیاں ہیں۔ ان دو سوالوں میں سے دنیاوی ترقی والا سوال تو انیسویں صدی میں ہی سامنے آ گیا تھا اور سر سیّد احمد خاں اسی حوالے سے سوچ رہے تھے۔ بیسویں صدی میں نظاموں والا سوال سامنے آ گیا۔ غلام ہندوستان کے مسلمانوں نے اس حوالے سے سوچا تو نئی طرح کے نتائج فکر سامنے آئے۔

یہ حقیقت ہے کہ مغرب کی تعمیر و ترقی، شان و شوکت اور غلبہ و قوت جدید علوم اور جدید افکار کی رہین منت ہے۔ مغرب میں یہ ساری ترقی رینساں کی مرہونِ منت ہے۔ رینساں کا ترجمہ احیاءِ علوم اور نشاۃ ثانیہ کیا گیا۔ اب ضروری ٹھہرا کہ ہم بھی احیائے علوم جیسی کوئی تحریک برپا کریں، مگر مغرب کی یہ تحریک تو یونانی علوم کے احیاء کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ ہمارے پاس کیا ہے۔ نتیجہ یہاں بھی ماضی میں جھانک کر دیکھا گیا اور عہد تاریک کا تعین کیا گیا۔ مغرب والوں کی ہو بہو نقل کرنے کے لیے ضروری ٹھہرا کہ ماضی کا شاندار دور، عہد تاریک اور پھر احیائے علوم کے تین ادوار مقرر کیے جائیں تا کہ ہم بھی مغرب والوں کی طرح ایک نئے دور کا آغاز کر سکیں۔ ادھر بیسویں صدی کے آغاز میں ہی رومانی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہونے والے شبلی نے مسلمانوں کا ماضی سے رشتہ جوڑنے کے لیے الفاروق، المامون، الغزالی، سیرۃ

النعمان، سوانح مولانا روم وغیرہ کتب لکھی۔ انھوں نے ان کتب کے ذریعے بتایا تھا کہ مسلمان سیاست، فکر و فلسفہ، قانون سازی، تصوف اور علم الکلام میں کیا کیا کارنامے سرانجام دے چکے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہی ماضی رومان بن گیا تو اسلامی تاریخی ناول لکھے گئے۔ خیر روشن ماضی تو جو ہوا سو ہوا، دیکھنا یہ ہے کہ عہد تاریک کب شروع ہوا۔ اس سوال کا جواب ایک دوسرے سوال سے جڑا ہوا تھا کہ مغرب کے پاس تو اپنے نظام میں کیپٹلزم، سوشلزم، کمیونزم، فاشزم، جمہوریت وغیرہ کتنے ہی نظام ہیں جن کے ذریعے مغرب بڑی اچھی اجتماعی زندگی بسر کر سکتا ہے، مگر کیا ایشیا والوں کے پاس خصوصاً مسلمانوں کے پاس بھی اپنا کوئی نظام ہے۔ اس کا جواب بھی آیا اور خوب آیا۔ مثلاً علامہ مشرقی فاشزم سے متاثر تھے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں آمریت ہے۔ انھوں نے فاشزم کو اسلام سمجھ لیا تھا۔ پرویز صاحب بھی آمریت کو اسلام بنا کر پیش کرتے رہے اور آمر کو مرکز ملت کا نام دے کر اس کے قیام کی دعوت دیتے رہے۔ خیر یہ بات تو لمبی ہے۔ ہم یہ بات یہیں چھوڑتے ہیں۔ بہر حال یہ تو طے ہوا کہ بیسویں صدی کی فکری دنیا میں ان دو سوالات کا غلبہ تھا۔ یہی وہ صدی ہے جب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی دنیا میں آئے اور عمر گزار کر چلے گئے۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء) اس صدی کے آغاز میں کتم عدم سے عالم وجود میں آئے۔ انھوں نے دہلی کا اشرافیائی ماحول دیکھا اور حیدر آباد دکن کی وہ دنیا دیکھی جہاں نظام حیدر آباد کی حکومت تھی۔ مسلمان اشرافیہ اس حکومت سے اپنی ساری اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے تھا۔ ان کے افکار کا حاصل یہ تھا کہ نظام کی حکومت تا ابد قائم رہے۔ کیونکہ وہ غلبہ اسلام کی علامت بنا ہوا تھا۔ جدید جمہوری عہد میں اس کی تائید کیوں کر کی جا سکتی تھی اور اس کی Justification کیا تھا، یہ کسی نے سوچا نہ تھا۔ سوچا تھا تو ذکر بھی نہ کیا تھا۔ ہاں سوال یہ تھا کہ وہ کون سے افکار ہیں جن سے نظام کے ناظم و حاکم رہنے کا جواز میسر آتا۔ بس وہی افکار درست ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اپنی جوانی میں تاج جبلپور کے مدیر رہے۔ پھر الجمعیۃ کے مدیر شہیر ہو گئے۔ اس دورِ ادارت میں اُن کے قلم سے جو اداریے اور مضامین نکلے وہ مولانا مودودی کے مابعد کی فکر سے زیادہ مناسبت رکھنے کی بجائے جمعیۃ علماء ہند کے اُس وقت کے افکار اور

نظریات کے ترجمان تھے۔ جناب خلیل حامدی نے ان اداریوں اور مضامین کو ۱۹۹۳ء میں
بانگ سحر، آفتاب تازہ، جلوۂ نور اور صدائے رستاخیز کے عنوانات سے مرتب کر کے شائع کیا
جب مولانا مودودی کو دنیا سے گئے چودہ سال بیت گئے تھے اور جماعت اسلامی سیاست کے کئی
موڑ کاٹ چکی تھی۔ ان مضامین کو مولانا مودودی کی سوانح کا حصہ تو کہا جا سکتا ہے، افکار کا
نہیں۔ اسی لیے تو ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۷ء، ۱۹۲۸ء، کی تحریریں ۱۹۹۳ء میں مرتب ہو کر شائع ہوئیں۔
مولانا مودودی نے الجمعیۃ میں شائع شدہ جن تحریروں کو کبھی Disown کرنے کی ضرورت نہ
سمجھی، وہ اُن کی معروف الجہاد فی الاسلام تھی جو الجمعیۃ میں بالاقساط شائع ہوئی۔

مولانا مودودی ۱۹۳۰ء کی دہائی میں فکر کا ایک نیا موڑ کاٹ چکے تھے۔ وہ اسلام کا ایک
منفرد مفہوم متعین کر چکے تھے۔ اسی مفہوم کی بنیاد پر انھوں نے جماعت اسلامی کی نیو اُٹھائی۔ وہ
اسلام کے جس مفہوم اور جس تعبیر کو درست سمجھتے تھے، ان کے خیال میں اس دور کی کوئی جماعت
یا پارٹی، دینی ہو یا سیکولر اس مفہوم کی قائل اور عامل نہ تھی۔ یہیں سے انھوں نے الگ راہ پر چلنا
شروع کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ سیاست کے بعض وقتی تقاضوں نے انھیں اُن جماعتوں کے
ساتھ اتحاد پر مجبور کر دیا جو ان کی فکر سے ۱۸۰ درجے کے زاویے پر تھیں۔ ایسے ہی کمیونسٹ اور
نیشنلسٹ پارٹیوں سے مختلف ادوار میں اُن کا اتحاد وقتی ضرورتوں کا تقاضا تھا۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اپنی الگ راہ پر چلنا
شروع کیا اور اکثر اُن کی یہ الگ راہ روایتی علماء کی سخت تنقید کا ہدف بنی۔ اس سلسلے میں بہت
سے مباحث ابھرے اور فکر کی سطح پر کئی معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ مولانا منظور نعمانی مرحوم نے
الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر مرتب کیا تو مولانا مودودی کو مضمون لکھنے کی دعوت دی۔ مولانا اب
روایتی قسم کی مضمون نگاری تو کر نہیں سکتے تھے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی فکر و فلسفہ پر روشنی ڈالتے
اور اپنی فکر کو ایک طرف رکھتے۔ انھوں نے اس مضمون کے ذریعے تجدید کے متعلق اپنا فلسفہ بھی
پیش کر دیا۔ اسلامی تاریخ میں تجدید کا لفظ تو بہت عام ہونے کے حسب معروف اور متعارف تھا۔
احیاء کا لفظ نیا تھا اور مغرب کا عطاء فرمودہ لفظ تھا۔ یہ اصل میں توریناساں کے ترجمے احیاء العلوم
یا نشاۃ ثانیہ سے کاٹ کر تجدید کے ساتھ جوڑا گیا تھا۔ ورنہ ملت اسلامیہ میں یہ لفظ خاصا اجنبی

تھا۔ یہ لفظ اکیلا تو آیا نہیں تھا، اپنے ساتھ فکری پس منظر بھی رکھتا تھا اور مخصوص مفہوم بھی۔ تجدید تو یہ ہے کہ مجدد اُس تقدمی عمل کو روک دیتا ہے جسے بدعت کہا جاتا ہے اور امت کا رابطہ واپس اصل دین سے قریب کر دیتا ہے۔ یعنی وہ سنت پر اصرار کرتا ہے اور بدعت کا خاتمہ کرتا ہے۔
اب رہا احیاء تو اس کے مفہوم کے حوالے سے مارٹن لنگز (ابوبکر سراج الدین) یوں فرماتے ہیں:

''لفظ احیاً Reniasssance کے ساتھ چند ناگوار وابستگیاں بھی ہیں کیونکہ اگر ہم یورپی نشاۃ ثانیہ کے نام سے موسوم تحریک کا بنظر عمیق مطالعہ کریں تو ہمیں یہ تحریک سوائے قدیم یونان و روما کے الحاد کے احیاء، قدیم روایتی عیسوی تہذیب کے خاتمے اور جدید مادیت پسند تہذیب کے آغاز کے کچھ اور دکھائی نہیں دیتی۔ (احیاء سے کیا مراد ہے، احیاءِ علوم لاہور شمارہ ا)

مولانا مودودی جب تجدید کے ساتھ احیاء کا لفظ جوڑ رہے تھے تو جدید مادیت پسند تہذیب کا کون سا حصہ تجدید میں شامل کر رہے تھے، اس کے بارے میں صرف دو حوالے کافی ہیں۔ مولانا ولی اللٰہی تحریک کے متعلق لکھتے ہیں:

''مرضِ صوفیت کے جراثیم سے یہ تحریک پاک نہ رہ سکی۔'' (تجدید احیائے دین، صفحہ ۱۲۲)

آگے چل کر حضرت سیّد احمد شہید کے بارے میں اس ناکام آرزو کا اظہار فرماتے ہیں:

''سیّد صاحب اور شاہ اسماعیل شہید جو عملاً اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے اُٹھے تھے، انھوں نے سارے انتظامات کیے، مگر اتنا نہ کیا کہ اہل نظر علماء کا ایک وفد یورپ بھیجتے اور یہ تحقیق کرتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھائی چلی جا رہی ہے اور نئے آلات و نئے وسائل، نئے طریقوں اور نئے علوم وفنون سے کام لے رہی ہے، اس کی اتنی قوت اور اتنی ترقی کا کیا راز ہے؟'' (تجدید واحیائے دین، صفحہ: ۱۲۸)

تجدید کے مقابلے میں تجدید واحیاء کی ترکیب آئی تو نئی ترجیحات بھی لائی۔ نئے مفاہیم بھی لائی۔ اس ترکیب میں تجدید سنت پر کتنا زور تھا اور دنیاوی غلبے پر کس قدر زور تھا، یہ ایک

تحقیقی مطالعے کا موضوع ہے۔ اس لیے فی الحال اس سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اتنی بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ تجدید کی اصطلاح جب ادھوری قرار پائی اور ایک نئی اصطلاح تجدید و احیائے دین سامنے آئی تو قدیم تاریخ تجدید اور مجددین کے کارنامے ادھورے پڑ گئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے تصوف کی ''چنیا بیگم'' سے قطع تعلق نہ کیا، بلکہ اسی کو فروغ بھی دیا۔ اب تو القول الجلی کی اشاعت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حضرت شاہ صاحب تصوف کے مراسم و مشاغل میں بہت حد تک دلچسپی لیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ان کا تجدیدی کارنامہ صرف اُن کے احترام میں منسوخ کرنا مناسب نہ سمجھا ورنہ اس کی حیثیت تو نظر انداز کیے جانے کے قابل تھی۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے دین کی جو نئی تعبیر اخذ کی، وہ روایتی علماء سے بہت حد تک مختلف تھی۔ اجزاء تو پرانے اسلام کے ہی تھے، مگر ترتیب و ترکیب اپنی تھی۔ مولانا مودودی جیسی اصطلاحیں تو دوسرے لوگ بھی استعمال کرتے رہے مگر اُن کا مفہوم اور ان کی ترجیحات مختلف تھیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام کی جو تعبیر پیش کی، وہ کچھ یوں بیان کی جا سکتی ہے۔

(۱) اسلام بنیادی طور پر ایک سیاسی نظریہ ہے، اس لیے تحریک کے طور پر سامنے آیا۔

(۲) اسلام کا بنیادی کنسرن سیاست کے ساتھ ہے اس لیے سیاست کے ذریعے ہی ملت کی صحیح راہنمائی کی جا سکتی ہے۔

(۳) اسلام سیاسی نظام کے طور پر ہی اپنا درست اظہار کر سکتا ہے۔ اس لیے مخصوص اسلامی ریاست کے بغیر اسلام پر پورے طور پر عمل کرنا ممکن نہیں۔

یہ تین باتیں ممکن ہے کہ یکجا اور لوگوں کے ہاں بھی موجود ہوں، مگر ہمارے علم کی حد تک صرف مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور پرویز صاحب کے ہاں یکجا ملتی ہیں۔

یہ ایک نئی فکر تھی یا کم از کم مختلف فکر تھی۔ اس لیے مولانا مودودی کو قرآن مجید کی بنیادی اصطلاحات کی تعبیر پر کام کرنا پڑا۔ انھوں نے الہ، رب، عبادت اور دین کا ایک خاص مفہوم

متعین فرمایا اس مقصد کے لیے انھوں نے ۱۹۴۱ء میں مکتبہ جماعت اسلامی پٹھان کوٹ سے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں کے عنوانات سے ۹۵ صفحات کی مختصر کتاب شائع کی۔ اس کتاب نے بہت سے مباحث اُٹھائے نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے فکری مناقشے پیدا ہوئے۔ مولانا منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس کتاب پر نقد و بحث کے لیے کتابیں لکھیں۔ یہ بات واضح ہے کہ مولانا دین کی چار بنیادی اصطلاحات کا جو مفہوم اخذ کرتے ہیں، وہ علمائے اُمت میں مقبول کیا ہوتا، کبھی متعارف بھی نہیں ہوا تھا۔

دین کی بنیادی اصطلاحات کا مفہوم ہی الگ ہو گیا تو روایتی علماء سے مولانا کے سیاسی راستے بھی جدا ہو گئے۔ اب تک علماء سیکولر لوگوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ علماء کانگریس میں شامل تھے یا مسلم لیگ میں، بہرحال سیکولر لوگوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کر رہے تھے۔ علماء ہند کا فتویٰ نصرۃ الابرار تو کانگریس میں شمولیت کو جائز قرار دے چکا تھا۔ اس فتوے پر دیو بند اور بریلی کے برگزیدہ علماء و اکابر کی تائید و تصدیق موجود تھی۔ مولانا نے خالصتاً اسلامی ریاست کے قیام کو اُمت کا واحد بنیادی فریضہ ٹھہرایا۔ اس کی قیادت و سیادت تو صرف مسلمان عالم ہی کر سکتا تھا اور یہ کام صرف ایک صالح جماعت ہی پایہ تکمیل کو پہنچا سکتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی ہند کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے پہلے مولانا مودودی مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کے سلسلہ مضامین میں کانگریس اور مسلم لیگ کے دونوں راستوں کو راہِ ضلالت قرار دے چکے تھے۔ اس صالح جماعت کے لیے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جو دستور پیش کیا، اُس کی ایک شق نے روایتی علماء کو بہت حد تک چونکا دیا۔ شق یہ تھی:

> ''رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالا تر نہ سمجھے۔ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اس معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجے میں ہو، اس کو اُسی درجے میں رکھے۔'' (دستور جماعت اسلامی، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم، صفحہ: ۱۷۰)

توضیح اس کی یہ سامنے آئی کہ صحابہ بھی تنقید سے بالا و بلند نہیں۔ اُن پر نقد و جرح نہ صرف

جائز ہے، بلکہ مستحسن سمجھ کر اس عمل کو رواج دیا گیا تا کہ لوگ صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ذہنی غلامی سے باہر آ سکیں۔ اب صحابہ ہی معیارِ حق نہ رہے تو سوال پیدا ہو کہ یہ جو حدیث وفقہ کا سارا ذخیرہ ہے، یہ تو اس اصول پر مرتب اور مدون ہوا ہے:

الصحابه كلّهم عدول

''صحابہ تمام کے تمام عادل ہیں''۔

کسی محدث کی کبھی مجال نہیں ہوئی کہ صحابہ میں ثقہ وغیر ثقہ کی تفریق کرے۔ اس لیے کہ وہ سارے کے سارے ثقہ تھے۔ قرآن مجید اُن کی تصدیق وتائید کرتا ہے:

اٰمِنُوْا كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ

صحابہ کبار کے بارے میں کسی محدث نے نہ تو کلام کیا، نہ کسی پر انگلی اُٹھائی۔ اب یہ نیا معیار سامنے آیا تو حدیث کا سارا ذخیرہ کہاں جائے گا اور سنت کا تعین نئے سرے سے کون کرے گا۔ یہ کام بے حد کٹھن نظر آیا تو یہ کہہ دیا گیا کہ صحابہ کی عدالت صرف روایت حدیث تک ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ چلو اہل حدیث تو مطمئن ہوئے، مگر یہ اہل سنت والجماعت کدھر جائیں جو جماعت صحابہ کے عمل کو حجت مانتے ہیں۔ اجماعِ صحابہ تو کاملاً حجت ہے۔ اگر یہ عمل ہی حجت اور دلیل شرعی نہیں تو قرآن مجید کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو صحابہ کے اجماع سے مستند ٹھہرا ہے۔ اس طرح کے کتنے ہی سوالات ہیں جن کا جواب مولانا مودودی اور اُن کے رفقا نے دینے کی کوشش وکاوش تو کی، مگر امت کو مطمئن نہ کر سکے۔ یہ عدم اطمینان تو اس وقت بہت بڑھ گیا جب مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے سیدنا حضرت عثمان غنی اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما پر نقد و جرح کا باب کھولا۔ پھر تو بحث مباحثہ کا وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ اب تک فرو نہ ہو سکا۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے حکومت الٰہیہ کا ایک خاص مفہوم متعین کیا اور اس مفہوم کا اسلام کی ابتدائی تاریخ پر اطلاق کرنا چاہا تو انھیں بہت حد تک ناکامی ہوئی۔ نتیجتاً انھیں کہنا پڑا:

''حضرت عثمان جن پر اس کارِ عظیم (یعنی خلافت) کا بار رکھا گیا تھا، ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو آن کے جلیل القدر پیشروؤں کو عطا

ہوئی تھیں۔ اس لیے جاہلیت کو اسلام کے نظام اجتماعی میں گھس آنے کا راستہ مل گیا۔" (ترجمان القرآن دسمبر ۴۰، جنوری ۴۱، صفحہ ۳۴، ۳۵)

یہی وہ زمانہ تھا جب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جماعت اسلامی کی بنیاد رکھنے میں مصروف تھے۔ نتیجتاً وہ اگست ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی بنا اُٹھانے میں کامیاب وکامران ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ یہ بات لکھ چکے تھے کہ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔" کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ تنقید تو صرف مولانا ہی لکھ سکے۔ جماعت کے لوگوں نے اُن کی تائید میں جو کچھ لکھا، لکھا۔ کسی سے یہ تک نہ ہوا کہ ان کی وفات پر اُن پر تنقیدی کتاب ہی لکھ دیتا۔ چلو ان پر نہ سہی، میاں طفیل محمد پر ہی تنقیدی کتاب لکھ ڈالتا۔ یہ بھی نہ سہی، حضرت قاضی حسین احمد پر ہی لکھ کر سرخرو ہو جاتا اور ہم سمجھ لیتے کہ جماعت کے لوگ یقیناً کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہیں اور کسی کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے۔

بات آگے بڑھانے سے پہلے ہم ایک بات کی تردید ضروری سمجھتے ہیں، وہ یہ کہ مولانا محترم نے شاہ ایران کو خوش کرنے کے لیے خلافت وملوکیت نہیں لکھی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کتاب سے وہ طبقہ بہت خوش ہوا تھا جو شاہِ ایران کی لابی خیال کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا حضرت عثمان غنی کے بارے میں شرح صدر سے یہ خیال فرماتے تھے کہ حضرت عثمان تمام خصوصیات خلافت کے حامل نہ ہونے کی وجہ سے جاہلیت اسلام کے نظامِ اجتماعی میں گھس آئی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا ودودی نے ۱۹۶۶ء میں خلافت وملوکیت لکھی تھی اس میں وہ کس سوال کا جواب دے رہے تھے۔ سوال یہ تھا کہ

وہ کیا عوامل تھے کہ اسلام کا نظامِ خلافت حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ملوکیت میں بدل گیا؟ اس کے اسباب کیا تھے؟

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کے اسباب عہد عثمانی میں تلاش کیے اور وہ بات جو ۱۹۴۱ء میں بالاجمال کہی تھی ۱۹۶۶ء میں ۳۵۱ صفحات کی ضخیم کتاب کی شکل میں پیش کر دیا۔

اس سوال کو زیر بحث لانے سے پہلے یہ بھی تو طے کر لیا جائے کہ اسلام کسی خاص نظام

کے قیام کا مطالبہ بھی کرتا ہے یا نہیں؟ اسلام میں یقیناً سیاسی زندگی کے بارے میں ہدایات موجود ہیں۔ یقیناً ایسے احکام موجود ہیں جو ریاست کی انتظامیہ پر عائد ہوتے ہیں، مگر کسی مخصوص سیاسی ڈھانچے کا قیام بھی مقصود و مطلوب ہے یا نہیں۔ آسان لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کی حدود و تعزیرات کے احکام صرف ریاست کی قوت کے ذریعے ہی نافذ کیے جا سکتے ہیں اور جہاد کا فریضہ بھی ریاست کے ذریعے ہی ادا کیا جا سکتا ہے، مگر کیا سیاسی نظام کا کوئی مخصوص ڈھانچہ بھی مطلوب ہے۔ کیا ہم خلافت کو پارلیمانی، صدارتی یا آمرانہ نظام کی طرح کا کوئی نظام کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا کہنا یا تو اسلام سے ناواقفیت کا نتیجہ ہوگا یا ان جدید سیاسی نظاموں سے ناواقفیت کا نتیجہ۔ مثلاً سیاسی نظام میں عزل اور نصب یعنی حکومت کے منصب پر بٹھانا اور معزول کرنا دو بنیادی سوالات ہیں۔ اسلام میں ان دونوں کو حالات کی ضرورت کے حوالے سے دیکھا جائے گا۔ یہ فیصلہ کرنا اُمت کا کام ہے کہ وہ خلیفہ کو یا امیر کو کس طرح منصب پر بٹھاتی ہے اور اسے کس طرح معزول کرتی ہے۔ سیاسی جماعتوں کا تصور ہی لے لیں۔ پرویز صاحب سیاسی جماعتوں کے وجود کو غیر اسلامی سمجھتے تھے (خصوصاً ایوب خاں کے عہد میں وہ سیاسی جماعتوں کو قطعاً غیر اسلامی کہتے تھے) اُن کے زیر اثر حنیف رامے سیاسی جماعتوں خصوصاً حزب اختلاف کو ہر لحاظ سے غیر شرعی خیال کرتے تھے، البتہ ایوب خاں کی کنونشن لیگ میں شمولیت میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ کچھ لوگ اسلام میں جمہوریت تلاش کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی اسلام میں آمریت تلاش کیے بیٹھے تھے۔ یہ دونوں باتیں اسلام تو نہیں تھیں، ہاں اسلام کی تعبیر کہلا سکتی تھیں۔ ویسے عملاً ایسی تعبیریں تعبیر فاسد کا درجہ رکھتی تھیں۔ ان حضرات نے بعض وہ باتیں لازم ٹھہرادی تھیں جو اسلام نے فرض نہیں کیں اور بعض ایسی باتوں سے صرف نظر کر لیا تھا جو اسلام میں فرض کا درجہ رکھتی تھیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے مدنظر یہ سوال تھا کہ وہ کیا عوامل تھے کہ اسلام کا خلافت کا نظام ملوکیت کے نظام میں بدل گیا۔ اگر وہ یہ بات فرض نہ کر لیتے کہ اسلام میں ایک سیاسی نظام کی ایک خاص ہیئت ترکیبی مقصودِ اصلی ہے تو وہ یقیناً اس سوال پر کسی اور انداز سے غور کر

سکتے تھے۔

دوسرا مفروضہ جو مولانا مودودی کے ہاں مستقل موجود رہا یہ تھا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسلمانوں نے خلافت کو ترک کر کے ملوکیت کا نظام قائم کر لیا تھا۔ پھر یہی نظام بارہ سو سال تک مسلمانوں میں مسلسل موجود رہا۔ گویا مسلمانوں کی تاریخ ساری کی ساری جاہلیت کی تاریخ ہے۔ نتیجتاً انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو الگ الگ کرنے پر بالخصوص اصرار فرمایا۔ ان دو مفروضوں کو لے کر آپ تاریخ کا سفر کریں تو حاصل سفر خلافت و ملوکیت کی کتاب کے علاوہ کیا ہو گا۔

اب اگر تاریخ اسلام کو دیکھا جائے تو دراصل مسلمانوں میں اس قسم کی ملوکیت کبھی کسی دور میں قائم نہیں ہوئی جس طرح کی ملوکیت غیر مسلموں کے ہاں رائج رہی ہے۔ مسلمانوں کی بارہ سو سالہ سیاسی تاریخ میں یہ باتیں ہمیشہ رائج رہی ہیں:

(۱) قانون کی بالادستی، خصوصاً اسلامی شریعت کی بالادستی۔ کبھی کسی حکمران نے اس میں مداخلت نہیں کی۔ اسلام میں یہ خاص بات نظر آتی ہے کہ اسلامی قانون سرکار دربار کی مداخلت سے بے نیاز لوگوں نے مرتب کیا تھا۔ قانون کی تشریح کا کام مفتی کرتا تھا اور مفتی سرکاری دباؤ سے آزاد تھا۔ یہ بات کسی غیر مسلم حکومت میں نظر نہیں آتی۔

(۲) اسلامی حکومتیں حدود و تعزیرات بھی نافذ کرتی تھیں اور اکثر جہاد کا فریضہ بھی سرانجام دیتی تھیں۔ ہاں اس اسلسلے میں بعض ایسی کوتاہیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بعض حکمران آپس میں لڑتے رہے اور وراثت کے جھگڑے جنگوں کی صورت اختیار کرتے تھے۔

(۳) مسلمان حکمرانوں نے عوام کو امن مہیا کیا اور انھیں بہت سے شہری حقوق عطا کیے۔

(۴) مسلمان حکمران تعلیم کے فروغ اور مساجد کی آبادی کے لیے اوقاف قائم کرتے رہے۔

(۵) مسلمانوں کے ہاں جہاد ہمیشہ افضل فریضہ رہا۔ ابتدائی صدیوں میں کیا پوری تاریخ اسلام میں جہاد کا فریضہ کبھی ساقط نہیں ہوا۔ مسلمان بادشاہوں نے ہی صلیبی جنگوں میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے یادگار کارنامے سرانجام دیے۔

(۶) مسلمان حکمران کبھی کسی Imperial کا آلہ کار بن کر کسی Assignment پر کام کرنے کو جہاد نہ کہتے تھے جیسا ہمارے عہد میں ہوا۔ اس لحاظ سے وہ ہم سے بہت بالا و بلند تھے۔

(۷) مسلمان عوام ہمیشہ منصب خلافت کا احترام کرتے رہے۔ خلیفہ ترکی سے مسلمانوں کا اس وقت تک روحانی تعلق قائم رہا جب تک یہ ادارہ زندہ رہا۔ گویا خلافت کا ادارہ مسلمانوں کی وحدت کی ضمانت رہا۔

(۸) حضرت شاہ اسحاق دہلویؒ نے خلافت ترکیہ سے سیاسی تعلق رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے پر ایک عمر عمل ہوتا رہا ار علماء دین نے اس فیصلے پر خوش دلی سے عمل کیا اور خلافت ترکیہ کے خاتمے تک مسلمان علماء نے خلافت کو ہمیشہ اپنا سیاسی مرکز تسلیم کیا۔

(۹) خلافت اموی و عباسی تاریخ اسلام کے ایسے ادوار ہیں جب اہل سنت والجماعت کے چاروں بڑے فقہاء نے اپنی اپنی فقہ مرتب کی۔ ان ادوار میں بعض خامیوں کے باوجود احکامِ اسلامی پر صدقِ دل سے عمل کیا جاتا رہا۔ بعض خلفاء علم و عمل کے اعتبار سے مثالی حقیقت رکھتے تھے۔ علم و عمل کی نیا میں اُن جیسی مثالیں پیش کرنا خاصا مشکل ہے۔

جاوید احمد غامدی کہتے ہیں:

اگر آپ تاریخ کو حقیقی طور پر پڑھیں گے تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ بنو اُمیہ کی حکومت میں ایسے ایسے جلیل القدر لوگ پیدا ہوئے ہیں کہ آپ تصور نہیں کر سکتے اور جور فا ہی حکومت انہوں نے قائم کی ابھی تک، ہاں

دنیا میں کوئی حکومت اس کے مماثل نہیں ہو سکی۔ ہوا یہ ہے کہ آدمی بعض اوقات ایک جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک چیز پامال ہو گئی ہے، اس کا ہمیں اعتراف کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی رائے سے جو حکومت بننے اور ٹوٹنے کا عمل تھا، اس کو وہ ایک انسٹی ٹیوشن میں نہیں بدل سکے اور یہ چیز ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ہم نے ساری کالک اُٹھا کر ان کے منہ پر مل دی۔ آپ میرے پاس بیٹھ جائیں میں آپ کو تاریخ کے ناقابل تردید شواہد سے یہ بات ثابت کر دوں گا کہ لوگوں کی فلاح کا سب سے زیادہ خیال رکھنے والی حکومت بنو اُمیہ نے قائم کی تھی۔ اس کے بعد بنو عباس نے اس کی اعلیٰ روایات کو قائم رکھا۔ بنو عباس کے ہاں ایسے ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان میں اور خلفائے راشدین میں بس قدرے فاصلہ ہے۔

(انٹر یو جاوید احمد غامدی، افضل ریحان، اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب، صفحہ ۴۴)

ان سب باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا کہ خلافت ملوکیت میں بدل گئی کسی طرح بھی روا نہیں ہو سکتا۔ ملوکیت تو وہ ہے جو قانون سازی میں ہر طرح آزاد ہو۔ اُسے کسی شرع و شریعت کے سامنے سر نہ جھکانا پڑے۔ مسلمان ملوک تو وہ تھے کہ وہ کچھ دیر خود کو فقیر سمجھ لیتے تھے اور اُن کے دور کے فقیر خود کو بادشاہ سمجھتے تھے۔ رہے خلفائے بنی امیہ و بنی عباس تو انھوں نے خود کو نہ کبھی ملوک سمجھا، نہ علماء نے انھیں ایسا قرار دیا۔ اب یہاں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ خلافت بنی امیہ و بنی عباس خلافت راشدہ سے مختلف نظر کیوں آتی ہے؟ اس سوال کا ایک جواب امام انقلاب مولانا سندھی نے دیا ہے۔ وہ سن لیجیے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خلافت راشدہ تو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت تھی اور صحابہ کرام حضور اقدس کے نمائندے کے طور پر حکومت چلا رہے تھے۔ مسلمانوں کی اپنی حکومت تو عہد بنی امیہ میں شروع ہوئی۔ امت مسلمہ خود جس قسم کی حکومت چلا سکتی تھی وہ عہد خلافت راشدہ کے بعد شروع ہوئی۔

مولانا سندھی کی اس بات کے علاوہ ایک اور بات کہی جا سکتی ہے کہ عہد خلافت راشدہ تو

صحابہ کرام کا عہد تھا۔ صحابہ کرام مثالی لوگ تھے۔ خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کے تربیت یافتہ تھے۔ ان کی عظمت تو خود کتاب اللہ بیان کر رہی ہے۔ مثالی لوگوں کا دور بھی مثالی تھا۔ اب مثالی لوگوں کا دور تو ختم ہونا تھا۔ اس مثالی دور میں مرکز سے ایک فاصلے پر غیر مثالی لوگ بھی تھے۔ کم تربیت یافتہ لوگ بھی تھے۔ یہ لوگ کوفے اور بصرے میں بستے تھے۔ ان لوگوں نے ایام حج میں ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا اور انھیں محصور کر کے شہید کر دیا۔ انھیں مدینہ اور مکہ کے لوگوں کی کسی طرح بھی تائید حاصل نہیں تھی۔ ان لوگوں نے حرم رسول میں اور حرمت والے مہینے میں خلیفہ وقت کا خون بہایا اور یوں اُمت کو ایک بڑی برکت سے محروم کر دیا۔ ان لوگوں نے خلیفہ ثالث پر کچھ الزامات عاید کیے۔ ان الزامات کو نہ صحابہ میں سے کسی نے اُس وقت مانا، نہ کسی دوسرے سلیم العقل نے الزامات کو تسلیم کیا اور نہ ہی مابعد کے علماء اُمت میں سے کسی صحیح العقیدہ عالم دین نے ان الزامات کی تصویب کی۔ اب اچانک مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو ادراک ہوا کہ الزامات درست تھے۔ اس پر بعض لوگوں نے اسے ان کا نسلی تعصب ٹھہرایا، کسی نے کچھ اور وجہ تلاش کی۔ خیر ان باتوں کو بھی ہم مفروضہ سمجھتے ہیں، مگر اس بات کا کیا جواز ہے کہ آپ نے کس بے تکلفی سے تمام صحابہ کو ایک ساتھ مسترد کر دیا ہے۔ حضرت عثمان غنی کوئی تنہا حکمران تو تھے نہیں۔ سابقون الاولون میں سے کئی لوگ ان کے مشیر تھے۔ سیّدنا حضرت علی کے علاوہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین دنیا میں تشریف فرما تھے۔ امہات المومنین موجود تھیں۔ حضرت سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا زندہ موجود تھیں۔ ان میں سے کسی نے بھی ان الزامات کی تائید نہیں کی۔ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی قدم نادرست ہوتو کوفہ وبصرہ کے غیر تربیت یافتہ نوجوان آ کر خلیفہ سے جواب طلب نہ کرتے، صحابہ کرام خود احتساب کے لیے بہت کافی تھے۔ وہ حق شناسی اور اظہارِ حق میں دوسری دنیا سے کہیں برتر لوگ تھے۔ وہ احقاق حق کے لیے سب سے بہتر تھے۔ حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تمام صحابہ کے عمل سے صرف نظر کر لیا اور غیر ذمہ دار مؤرخین پر انحصار کر لیا۔ یہاں ایک واقعے کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ مولانا محمد علی لکھوی کے ہاں خلافت وملوکیت کا تذکرہ آیا تو کسی نے مولانا موصوف کی صفائی میں کہا:

''انھوں نے کون سا اپنی مرضی سے لکھا ہے۔ انھوں نے بدایہ نہایہ کے

حوالے سے لکھا ہے۔"

مولانا محمد علی نے پرجوش لہجے میں کہا:

"بدایہ نہایہ معتبر ہے یا قرآن۔ جب قرآن نے کہہ دیا رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ تو پھر بدایہ نہایہ کیا ہوا کہ اُس کے حوالے سے صحابہ پر تنقید کی جائے۔"

ہمیں مولانا سے ایک اور بھی شکایت ہے کہ انھوں نے جن کتابوں کے حوالے دیے ہیں، وہاں وہ عبارتیں بعض جگہ موجود نہیں ہیں۔ بعض جگہ ان کا مفہوم مختلف ہے اور بعض جگہ ذرا سا مختلف ہے۔ مزید برآں بعض مآخذ معتبر نہیں ہیں اور بعض مآخذ میں مولانا مودودی کے حوالے تو موجود ہیں، مگر ان سے مختلف روایات بھی موجود ہیں۔ ایسا بھی ہے کہ ایک کتاب میں مولانا کا نقطۂ نظر موجود ہے تو کسی دوسرے ماخذ میں اس کا رد بھی موجود ہے۔ ایسے بہت سے سوالات ہیں جو مولانا کی زندگی میں اُٹھائے گئے۔ انھیں مختلف نقطہ نظر سے لکھی گئی تاریخ بھی پیش کی گئی، مگر مولانا اور اُن کے اتباع نے ان سوالات کے رد کرنے اور مختلف نقطہ نظر سے لکھی گئی تاریخ کی تردید کرنے کو کافی سمجھا۔ بہتر تھا کہ وہ ان باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے۔ اپنے نقطہ نظر پر دوبارہ غور کرتے۔ ممکن تھا کہ ان کے نقطہ نظر میں کسی حد تک یا بہت حد تک تبدیلی ہوتی اور اُمت ایک بڑے اختلاف سے بچ جاتی، مگر ایسا نہ ہو سکا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خلافت وملوکیت کا ہدف جہاں عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی تھی، وہیں دوسری شخصیت جو خصوصی نقد کا ہدف ٹھہری تھی، وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی تھی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد معدلت گستر میں یورپ کے بعض علاقے فتح ہوئے تھے۔ مغرب کی کینہ پروری تو ہمیشہ مثال رہی ہے۔ یورپ نے انھیں کبھی معاف نہ کیا۔ یوں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کالونیل دور میں تنقید کا خصوصی ہدف بنے تھے۔ اُن پر خلافت وملوکیت میں بھی خصوصی طور پر مہربانی کی گئی ہے۔ ان کی ذات گرامی پر جو نقد وتبصرہ کیا گیا ہے، راقم اس کی تفصیل میں نہیں جاتا، اس لیے کہ خلافت وملوکیت پر تبصرہ راقم کے موضوع سے خارج ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ خلافت وملوکیت میں اُن کی شخصیت کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے، وہ خاصا افسوسناک ہے۔ خلافت وملوکیت کا بیان نہ صرف

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ زیادتی ہے، بلکہ خود تاریخ سے بھی زیادتی ہے۔
حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کس قسم کی شخصیت تھے، اس حوالے سے ایک جدید مفکر کا حوالہ پیش کرنا چاہوں گا۔ قدیم علماء تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عقیدتمند رہے ہیں۔ ایک جدید مفکر کے خیالات بھی پڑھ لیں۔ جناب جاوید غامدی فرماتے ہیں:

> ''جس شخص (سیّدنا امر معاویہ) کا معاملہ یہ ہو کہ وہ اپنی بوڑھی ماں کے رشتے کی بات کرنے والے آدمی کو تخت پر بیٹھے ہوئے یہ جواب دیتا ہو کہ ہمارے بزرگوں کے ہاں جو روایات ہیں، ان کے تحت میں ان سے بات کر کے دیکھوں گا ہوسکتا ہے وہ مان جائیں، جس شخص کا عالم یہ ہو کہ وہ لوگوں کو عطیات دیتا ہو اور ایک آدمی جواب میں یہ کہتا ہو کہ معاویہ نے مجھے جتنا ردی عطیہ دیا ہے اگر اس سے میری ملاقات ہوئی تو میں اس کی چٹیا پر تھپڑ ماروں گا اور وہ اس کو بلا کر یہ کہتا ہو کہ چچا آپ مجھ سے بڑے ہیں، میں اپنی پگڑی اُتارتا ہوں آپ تھپڑ ماریں جس کے حلم پر عربی ادب میں بے شمار چیزیں کلاسیک بن گئی ہیں۔''

(انٹرویو جاوید غامدی، افضل ریحان، اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب، صفحہ:۴۳)

اب ذرا سوچیے یہی وہ سیّدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں جو خلافت وملوکیت کے صفحات پر نظر آتے ہیں۔ ہمیں تو حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے بارے میں خلافت وملوکیت کا بیان پڑھ کر حیرت ہوتی تھی کہ یہ کس شخص کا تذکرہ ہے۔ یہ کون شخص ہے جو بیت المال اُٹھا اُٹھا کر اپنے اعزہ واقارب کو دے رہا ہے۔ ہم نے تو ساری عمر یہی پڑھا تھا کہ انھوں نے اپنا ذاتی مال اُٹھا اُٹھا کر اُمت میں تقسیم کیا تھا۔ یہ تو مال کے معاملے میں ہمیشہ غنی رہے ہیں۔ اُمت ہمیشہ ان کے زیر بار احسان رہی ہے۔ قحط کے زمانے میں اپنا پورا تجارتی قافلہ لا کر امت میں مفت تقسیم کر دیں۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ وقت دگنی قیمت کی آفر کریں تو ٹھکرا دیں کہ زیادہ قیمت پر بیچنا ہے۔ زیادہ قیمت کیا تھی کہ مدینہ میں اعلان ہو رہا تھا کہ لوگ آئیں اور ضرورت کا غلہ لے جائیں۔ یہ تھے وہ کشادہ دست وکشادہ دل عثمان جنھیں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سے غنی کا لقب بھی ملا تھا اور ذوالنورین کا مقام ومرتبہ بھی۔ اب کیا ان کے بارے

میں یہ مان لیا جائے کہ وہ امت کا مال اُٹھا اُٹھا کر اپنے اعزہ میں تقسیم کر رہے ہیں۔ یہ تھا بلوائیوں کا الزام اور مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اس الزام کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اب بھلا کوئی سلیم الطبع شخص یہ الزام تسلیم کر سکتا ہے۔ اگر یہ الزام درست مان لیا جائے تو کیا انھیں رحماء بینھم کا مصداق بھی تسلیم کیا جائے گا۔ پھر اس آیت کا مصداق کون ہوگا......؟

یہی معاملہ بہت سے دوسرے اکابر صحابہ کے ساتھ ہوا تھا جن صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی رفاقت کی، وہ تو خلافت وملوکیت میں خصوصی ہدف رہے ہیں اور ان پر وہ الزامات عاید کیے جا رہے ہیں جو ایک صحابی کے مقام کے شایاں تو کیا ہوتے، کسی صالح مسلمان سے بھی ایسے عمل کی توقع ممکن نہ تھی۔ مولانا مودودی اگر یہ سوچ لیتے کہ آیا وہ خود اس عمل کے مرتکب ہوتے؟ اس کے جواب میں ہی انھیں اپنی تحریروں کا جواب مل سکتا تھا۔ قرآن مجید نے افک کی تصدیق کرنے والوں سے صرف یہی مطالبہ کیا ہے کہ تم خود اپنے بارے میں سوچو کیا تم ایسا عمل کر سکتے تھے، پھر تم دوسروں سے ایسے عمل کی توقع کیوں رکھتے ہو۔ یہ سوچ ہمیں اکثر سوئے ظن سے بچا سکتی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم اور دوسرے لوگ اس سوئے ظن سے محفوظ رہیں۔ اسی میں ہمارے ایمان بھی محفوظ رہ سکتے ہیں اور ہم حبط اعمال سے بھی بچ سکتے ہیں۔ پھر جب مطالعے کا موضوع رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے رفقاء واصحاب ہوں تو معاملہ بہت نازک ہو جاتا ہے۔ یہاں تو ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں ادب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ میر تقی میر نے کیا خوب کہا تھا:

دُور بیٹھا غبارِ میر اُن سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحقیق خلافت وملوکیت ہمیشہ سوالیہ نشان رہی ہے۔ اُن کی تحقیق کی کمزوریوں پر علماء نے اُنگلی اُٹھائی اور نقد وتبصرہ فرمایا۔ مولانا کی حمایت میں قلم اُٹھانے والوں نے مولانا کی بات کو کسی نہ کسی طور درست ثابت کرنے کی کوشش کی۔ درست بات کو تسلیم کرنے کی کوشش نہ کی۔ انھوں نے یہ سب کچھ کرتے ہوئے یہ تو ثابت کر دیا کہ صحابہ معیارِ حق نہیں، لیکن عملاً کس کو معیارِ حق ثابت کیا، یہ بات جاننا کچھ مشکل نہیں۔

مولانا کی مختلف تصانیف پر تردیدی کتب بھی لکھی گئیں، تنقیدی کتب بھی۔ شاید سب

سے زیادہ تردیدی کتابیں خلافت و ملوکیت کے خلاف لکھی گئیں۔ اس لیے کہ اس کتاب میں مولانا کے قلم کا ہدف ایک برگزیدہ صحابی کی ذات والا صفات تھی۔ بہت سے دوسرے صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی نقد و تبصرہ کی زد میں آئے تھے۔ مولانا محمد میاں کی کتاب شواہد تقدس انھی کتب میں سے ایک ہے۔ جو علمی خوبی اور ادبی خوبصورتی کے حوالے سے زندہ کتاب ہے۔

یہاں ایک جملہ معترضہ ہی سہی، مگر ایک بات عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ مولانا کی ذات میں بہت سے تضاد نظر آتے ہیں۔ گستاخی معاف انھیں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ میں تو خلافت کی سو فیصد اہلیت نظر نہیں آئی، مگر اُن کی جماعت کو ضیاء الحق کی ذات میں کبھی کوئی خامی نظر نہیں آئی۔ حتیٰ کہ میاں طفیل محمد اور جماعت اسلامی نے ضیاء صاحب کے جعلی ریفرنڈم کی دل و جاں سے تائید کی تھی۔

حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے سیّد عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے طنز و تعریض کے کتنے ہی حربے آزمائے تھے، مگر فاطمہ جناح کی حمایت میں مدح و تحسین کے کئی مراحل حل کیے۔ اس تضاد کی آخر کیا وجہ ہے:

کوئی بتلائے کہ ہم بتائیں کیا

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ملوکیت کی کس قدر مخالفت کی، اس کے بارے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہوگا، مگر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ وہ ان عرب ممالک سے گہرے تعلقات رکھتے تھے جہاں ملوکیت قائم تھی۔ انھیں سعودی حکومت کی ملوکیت نے شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا تھا۔ مولانا نے صدق دل سے یہ ایوارڈ قبول کرلیا۔ عرب ملوک کے سائے میں ترقی کی منازل طے کرنے والی جماعت اسلامی کو صرف سیّدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ملوکیت سخت ناپسند تھی۔ کیا صرف اس لیے کہ وہ صحابی رسول تھے اور صحابہ پر تنقید کرنا بہت ضروری ہے تاکہ ان کی ذہنی غلامی سے بچا جاسکے:

بریں عقل بسوخت زِ حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

اب بات کرتے ہیں مولانا محمد میاں اور اُن کی تصنیف شواہد تقدس کی۔

مولانا محمد میاں ہمارے عہد کے وہ بزرگ اور برگزیدہ ہستی ہیں جنھوں نے علم اور قلم کی خدمات کے لیے خود کو وقف کیے رکھا۔ وہ مفتی بھی تھے شیخ الحدیث بھی۔ حضرت شیخ الاسلام

مولانا حسین احمد مدنی کے مسترشد بھی تھے اور خلیفہ مجاز بھی۔ انھوں نے سیرۃ پر بھی لکھا اور تاریخ پر بھی قلم اُٹھایا۔ اپنے شیخ کے سوانح بھی لکھے اور علمائے اُمت کے مجاہدانہ کارنامے بھی۔ ان کا ایک کارنامہ ''شواہد تقدس'' ہے۔ یہ تردید الزامات کے لیے لکھی گئی۔ اس کا موضوع خلافت و ملوکیت میں صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین پر کیے گے نقد و جرح کا جواب دیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی اور خوبصورتی یہ ہے کہ آپ نے صحابہ کرام پر الزامات کی صفائی پیش کرتے ہوئے جواباً کسی دوسرے برگزیدہ اور خدارسیدہ صحابی پر کسی قسم کا کوئی الزام عاید نہیں کیا۔ یہ صرف صحابہ کی مدح کے لیے وقف ہے۔ اس لیے اس میں صرف صحابہ کے تقدس کی شہادت دی گئی ہے۔ الزامات کی تردید کی گئی ہے۔ یہی اس کتاب کا امتیاز ہے۔ یہی اس کے مطالعے اور اشاعت کا جواز بھی۔

راقم الحروف نے خلافت وملوکیت کے مصنف کے فکری ارتقاء اور علمی سرگزشت کو سمجھنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں کسی بھی تعصب سے گریز کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ کہیں ایسا جملہ زبان قلم سے سرزد نہ ہو جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ راقم اس معاملے میں انیس کا ہم خیال ہے:

خیالِ خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

آخری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ ہماری لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ہمیں حق کو حق دیکھنے اور دکھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

۱۶ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ

والسلام
امجد علی شاکر
- لاہور

سوالات

(۱) مودودی صاحب نے کتاب ''خلافت وملوکیت'' جو تصنیف کی ہے، اُس کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

(۲) جماعتِ اسلامی قرآن وحدیث کی روشنی میں کیسی جماعت ہے؟

(۳) کیا اِسلام کی روشنی میں مودودی صاحب پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟

(۴) بعض دیوبندی علماء جو مودودی صاحب کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں وہ کیسے ہیں؟

حافظ محمد افضل معرفت شیخ نذیر حسین
لیڈر مرچنٹ، ریلوے روڈ، رحیم یار خاں
مغربی پاکستان

جوابات

جواب سوال نمبر ۱: یہ کتاب حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سوء اعتقاد اور بدگمانی کا تخم ہے، کتاب کا حاصل یہ ہے کہ وہ ملوکیت جس نے خلافتِ راشدہ کے وجود کو صفحہ سیاست سے نیست و نابود کیا، اس کے آغاز کی ذمہ دار سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی پالیسی ہے، آپ نے وہ پالیسی اختیار کی جس کا لازمی اور قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ قبائلیت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سلگ اُٹھیں جن کا شعلہ خلافت راشدہ کے نظام ہی کو پھونک کر رہا۔ (خلافت ملوکیت ص ۱۰۰، باب سوم فصل ۶ کا آخری فقرہ)

ہم سمجھتے ہیں کہ مودودی صاحب نے اس انقلاب کا کہ ''خلافت کی جگہ ملوکیت آئی'' وہ سبب تجویز کیا ہے جس کی تلاش کرنے کے لیے آپ کو نئی قسم کی دوربین استعمال کرنی پڑی اور کھلے ہوئے واضح اسباب جو بلا کسی خاص جستجو کے تاریخ کی کتابوں میں ہر صاحب بصیرت کے سامنے آجاتے ہیں، جن کی تائید آیات کتاب اللہ اور حدیث سے بھی ہوتی ہے ان سب کو نظر انداز کر کے ایسا سبب تلاش کرنا کہ فرق باطلہ کے سوا کوئی صحیح العقیدہ فرقہ یا کوئی انصاف پسند عالم اس کی تائید نہیں کر سکتا، تحقیق حق نہیں ہے بلکہ مسموم ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

مودودی صاحب کا ارشاد ہے: ''جو تاریخی مواد اس بحث میں پیش کیا گیا ہے وہ تاریخ اسلام کی مستند کتابوں سے ماخوذ ہے، جتنے واقعات میں نے نقل کیے ہیں، ان کے پورے پورے حوالے درج کر دیے ہیں اور کوئی ایک بات بھی بلا حوالہ نہیں ہے''۔ (ص ۲۹۹ ضمیمہ)

ہم اس ارشادِ گرامی کی تردید نہیں کرتے، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جو آپ نے لکھا ہے، اس کا حوالہ دیا ہے مگر ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے اور واقعات کی جو توجیہ آپ

نے کی ہے وہ صحیح ہے، وہی واقعہ ہے ''وانتم سکاریٰ'' کو چھوڑ کر صرف ''لاتقربوا الصلوٰۃ'' کا لکھنے والا یہی کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ قرآن میں ہے، جو حوالہ دے رہا ہوں وہ صحیح ہے، مگر اس کو تحقیق حق کہا جائے گا یا نسخ و تحریف اور تلبیس بالباطل۔

بظاہر مودودی صاحب کا احساس یہ ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے متعلق مسلمانوں کا حسن اعتقاد حد اعتدال سے بڑھا ہوا ہے، وہ اتنی تعظیم و تکریم کے مستحق نہیں ہیں جتنی مسلمانوں کے عقائد کا جزو بنی ہوئی ہے، بس آپ کے اصلاحی مشن کا اہم یا تمام تر مقصد یہ ہے کہ اس عقیدتمندی کو ختم کیا جائے، چنانچہ جب آپ نے جماعتِ اسلامی کی بنیادی رکھی تو اس کے دستور اساسی میں یہ حق اپنے لیے تسلیم کرالیا۔

''رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بتائے ہوئے اس معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے''۔

ایک اور موقعہ پر آپ نے فرمایا۔

''اگر کسی شخص کے احترام کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس پر کسی پہلو سے تنقید نہ کی جائے تو ہم اس کو احترام نہیں سمجھتے بلکہ بت پرستی سمجھتے ہیں اور اس بت پرستی کو مٹانا منجملہ ان مقاصد کے ایک اہم مقصد ہے جس کو جماعتِ اسلامی اپنے پیش نظر رکھتی ہے۔''

(رسالہ ترجمان القرآن ص ۳۲۷ بحوالہ اصلی قول ←)

مودودی صاحب نے اپنی اس تصنیف ''خلافت وملوکیت'' میں اپنے اس حق کو آزادی سے استعمال کیا ہے۔ مثلاً آپ کا ارشاد ہے:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی کا یہ پہلو بلاشبہ غلط تھا اور غلط کام بہر حال غلط ہے خواہ وہ کسی نے کیا ہو، اس کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضا ہے اور نہ

دین کا یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے۔"

(خلافت وملوکیت ص۱۱۶)

دوسرے موقعہ پر فرماتے ہیں:

"بلاشبہ ہمارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ واجب الاحترام ہیں اور بڑا ظلم کرتا ہے وہ شخص جوان کی کسی غلطی کی وجہ سے ان کی ساری خدمات پر پانی پھیر دیتا ہے اوران کے مرتبہ کو بھول کر گالیاں دینے پر اُتر آتا ہے، مگر یہ بھی کچھ کم زیادتی نہیں ہے کہ اگر ان میں سے کسی نے غلط کام کیا ہو تو ہم محض صحابیت کی رعایت سے اس کو اجتہاد قرار دینے کی کوشش کریں"۔ (خلافت وملوکیت ص۱۴۳)

پھرایک اور موقعہ پر فرماتے ہیں۔

"بعض حضرات اس معاملہ میں نرالا قاعدہ کلیہ پیش کرتے ہیں کہ ہم صحابہ کرام کے بارے میں صرف وہی روایات قبول کریں گے جوان کی شان کے مطابق ہوں اور ہراس بات کو رد کردیں گے جس سے ان پر حرف آتا ہو خواہ وہ کسی حدیث میں ہی وارد ہوئی ہو لیکن میں نہیں جانتا کہ محدثین، مفسرین وفقہاء میں سے کسی نے یہ قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے اور کون سا محدث یا مفسر یا فقیہ ہے جس نے کبھی اس کی پیروی کی ہے۔" (ص۳۰۵)

صحابہ کرام پر تنقید کا حق:

ہم اس سے پہلے کہ اور باتوں پر بحث کریں، مودودی صاحب کے اس آخری فقرہ پر بحث ضروری سمجھتے ہیں۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ "میں نہیں جانتا کہ محدثین ومفسرین وفقہاء میں سے کسی نے یہ قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے۔"

حضرت مودودی صاحب! گزارش یہ ہے کہ یہ ایسا قاعدہ نہیں ہے جو محدثین و

مفسرین یا فقہاء کے بیان کا محتاج ہو بلکہ یہ اجماعی عقیدہ چلا آ رہا ہے، عقائد کی کتابیں دنیا بھر میں پڑھی پڑھائی جاتی ہیں اور ان پر تمام دنیا کے علمائے اہل سنت کا اتفاق چلا آ رہا ہے، آپ کو سب سے پہلے اس ''قاعدہ'' کی تحقیق کرنے کے لیے کتب عقائد کی طرف رجوع کرنا چاہیے تھا تا کہ آپ کو معلوم ہو جاتا کہ یہ قاعدہ ہے یا اس سے بھی بڑھ کر عقیدہ ہے۔ شرح عقائد نسفی میں ہے۔

ویکف عن ذکر الصحابة الا بخیر...... الی ان قال فسبهم والطعن فیهم ان کان یخالف الادلة القطعیة فکفر کقذف عائشة والافبدعة وفسق.

صحابہ کرام کو صرف بھلائی کے ساتھ ہی یاد کیا جائے۔
اس کے کچھ بعد فرماتے ہیں:
انہیں برا کہنا، ان کے بارے میں طعن کرنا (یا کفر ہے یا فسق و بدعت) اگر دلائل قطعیہ کے خلاف ہوتا ہے تو کفر ہوگا، جیسے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں تہمت لگانا، ورنہ یہ بدعت یا فسق ہوگا۔
(شرح عقائد نسفی ص ۱۱۲)

ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب مسامرہ میں تحریر فرماتے ہیں:

واعتقاد اهل السنة تزکیة جمیع الصحابة والثناء علیهم کما اثنی الله سبحانه وتعالیٰ علیهم اذ قال کنتم خیر امة اخرجت للناس وکذا رسول الله صلی الله علیه وسلم

''اہل سنت کا عقیدہ تمام صحابہ کرام کو پاکیزہ ثابت کرنا اور ان کی تعریف کرنا ہے، جیسا کہ ان کی تعریف حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے ''تم سب اُمتوں سے بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئیں'' (پ ۴ رکوع ۳)۔ اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف فرمائی ہے۔'' (ص ۳۱۳)

شرح مواقف میں ہے۔

انه یجب تعظیم الصحابة کلهم والکف عن القدح فیهم لان الله تعالٰی عظمهم واثنی علیهم فی غیر موضع من کتابه والرسول قد احبهم واثنی علیهم فی احادیث کثیرة ثم ان من تامل سیرتهم ووقف علی مأثرهم وجدهم فی الدین وبذلهم اموالهم وانفسهم فی نصرة الله ورسوله لم یتخالجه شک عظم شانهم و برأتهم عما ینسب الیه المبطلون من المطاعن ومنعه ذالک من الطعن منهم ورای ذالک مجانباً للایمان ونحن لا نلوث کتابنا بامثال ذالک

''تمام کے تمام صحابہ کرام کی تعظیم اور ان کے بارے میں اعتراض سے بچنا واجب ہے کیونکہ حق تعالٰی نے ان کو بڑا بنایا اور قرآن پاک میں متعدد جگہ ان کی تعریف فرمائی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا محبوب بتلایا ہے اور بہت سی حدیثوں میں ان کی تعریف فرمائی ہے، پھر یہ بات بھی ہے کہ جو ان کی سیرت کے بارے میں غور کرتا ہے اور ان کی فضیلتوں اور دین کے بارے میں ان کی کوششوں کو جان لیتا ہے اور ان کی جانی اور مالی قربانیاں دیکھتا ہے کہ خدا کے دین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے (انہوں نے کیا کیا) قربانیاں دی ہیں اُسے ان کی عظمتِ شان میں اور ان کی برأت میں کہ جو کچھ ان کی طرف باطل پرستوں نے (غلط) الزامات منسوب کیے ہیں (وہ سب غلط اور بے بنیاد ہیں) کوئی شک نہیں رہتا اور وہ (بالیقین) جان لیتا ہے کہ یہی چیز ایمان کو بچانے والی ہے اور ہم تو اپنی کتاب کو اس قسم کی باتوں کے ذکر سے (بھی) ملوث نہیں کرنا چاہیے۔''

(المتن من شرح المواقف ص ۷۴۵)

یہ عقیدہ نیا نہیں ہے بلکہ صدر اوّل سے پرانا چلا آ رہا ہے۔ اسی لیے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی تحریر فرمایا ہے، آیئے ہم آپ کو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ''عقیدہ طحاویہ'' دکھاتے ہیں۔ اس میں ارشاد ہے:

ونحب اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ولا نفرط فی حب احد منھم ونبغض من یبغضھم وبغیر الخیر یذکرھم ولا نذکرھم الا بالخیر وحبھم دین و ایمان و احسان وبغضھم کفر و نفاق وطغیان ونثبت الخلافۃ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اولا لابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تفضیلا وتقدیما علی جمیع الامۃ ثم لعمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ثم لعثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ثم لعلی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ وھم الخلفاء الراشدون والائمۃ المھدیون.

وان العشرۃ الذین سماھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نشھد لھم بالجنۃ کما شھد لھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقولہ الحق وھم ابوبکر و عمر و عثمان وعلی و طلحۃ والزبیر وسعد وسعید وعبدالرحمٰن بن عوف وابو عبیدۃ بن الجراح وھو امین ھذہ الامۃ رضوان اللہ تعالیٰ علیھم اجمعین.

ومن احسن القول فی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی ازواجہ وذریاتہ فقد بریٔ من النفاق وعلماء السلف من الصالحین والتابعین ومن بعدھم من اھل الخیر والاثر اھل الفقہ والنظر لایذکر ونھم الا بالجمیل ومن یذکرھم بشر فھو علی غیر سبیل:

''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے محبت رکھتے ہیں اور کسی کی محبت میں افراط وتفریط میں نہیں پڑتے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے یا بھلائی کے سوا کسی قسم کے اور کلمات سے ذکر کرتا ہے ہم اسے مبغوض

جانتے ہیں اور ہم صرف اچھائی ہی سے ان کا ذکر کرتے ہیں، ان سے محبت رکھنا عین دین ہے، ان سے بغض رکھنا کفر، نفاق اور سرکشی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد ہم سب سے پہلے سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت ثابت کرتے ہیں کیونکہ وہ تمام اُمت میں سب سے افضل اور سب سے مقدم تھے، پھر سیّدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی، پھر سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی، پھر سیّدنا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اور یہی خلفائے راشدین ہیں اور کامل طور پر ہدایت یافتہ امام ہیں۔

اور یہ کہ وہ دس حضرات جن کے نام رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں ہم ان کے جنتی ہونے کی ایسے ہی شہادت دیتے ہیں جیسے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دی اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان حق ہے اور وہ حضرات یہ ہیں: ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد، سعید، عبدالرحمٰن بن عوف اور ابوعبیدہ بن الجراح اور ابوعبیدہ اس اُمت کے امین ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

اور جس نے اپنی زبان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ کے بارے میں، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور اولاد کے بارے میں اچھی رکھی تو وہ یقیناً نفاق سے بری ہوگیا اور علماء سلف صالحین میں (گزرے) ہوں یا (ان سے پہلے) تابعین (ہوں) اور جوان (دونوں طبقوں) کے بعد ہوں جو اہل خیر اور روایات پر عمل کرتے ہوں۔ اہل فقہ اور اہل نظر ہوں، یہ سب کے سب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اچھائی سے ذکر کرتے آئے ہیں اور جو ان کو برائی سے یاد کرے تو وہ راستہ سے ہٹا ہوا ہے۔ (عقیدہ طحاویہ مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور۔ (از ص ۴۱ تا ۴۴)

امام طحاوی رحمہ اللہ حدیث، رجال اور فقہ کے امام ہیں اور ان کی یہ کتاب مدینہ یونیورسٹی میں داخل نصاب ہے، محدثین میں ایک بزرگ خطیب بغدادی رحمہ اللہ ہیں، انہوں نے اصول حدیث نہایت شرح و بسط سے بیان فرمائے ہیں، علم حدیث میں بصیرت کے علاوہ تاریخ ورجال کے بھی جلیل القدر علامۂ دوراں گزرے ہیں، انہوں نے اپنی مشہور تصنیف ''الکفایہ'' میں ایک باب رکھا ہے جس کا عنوان ہے:

باب ما جاء فی تعدیل الله ورسوله للصحابة وانه لا یحتاج الی سوال عنهم وانما یجب فیمن دونهم.

یعنی اس باب میں وہ باتیں بیان ہوں گی جن میں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام کی عدالت (یعنی انتہا درجہ سچائی اور حق پسندی) بیان فرمائی ہے اور یہ کہ ان کے بارے میں کسی بات کے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں، ان کے ماسوا میں تفتیش حال کی ضرورت ہے۔

اس مضمون کو نہایت عمدہ طرح، زوردار اور واضح الفاظ میں بیان کر کے فرماتے ہیں:

هذا مذهب کافة العلماء ومن یعتد بقوله من الفقهاء.

''یہی تمام علماء (یعنی محدثین) کا اور سب فقہاء کا مسلک ہے کہ جن کی بات قابل اعتبار ہوتی ہے'' (کفایہ ص۴۶ و۴۹)

متقدمین ہی میں ابو زرعہ رازی رحمہ اللہ جو حدیث اور اسماء الرجال کے امام ہیں آپ کے (مودودی صاحب کے) خیال کی نہایت شدت سے تردید فرماتے ہیں۔

اذا رأیت الرجل ینتقص احدا من اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم فاعلم انه زندیق وذالک ان الرسول صلی الله علیه وسلم عند ناحق والقرآن حق انما ادی الینا هذا القرآن والسنن اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم وانما یریدون ان یجرحوا شهودنا لیبطلوا الکتاب والسنة والجرح بهم اولٰی وهم زنادقة.

''جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی

اللہ عنہم میں سے کسی کی بھی تنقیص کر رہا ہے تو یہ جان لو کہ وہ زندیق ہے اور اس لیے کہ ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق ہیں اور قرآن حق ہے اور ہم تک یہ قرآن اور حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہی نے پہنچائی ہیں اور یہ صحابہ پر اعتراض کرنے والے اور ان میں نقص ثابت کرنے والے (دراصل) یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے گواہوں کو (کسی طرح) مجروح کریں تاکہ قرآن وحدیث کو باطل کرسکیں، لہٰذا ان ہی لوگوں پر جرح وتنقید کرنی زیادہ درست ہے اور ایسے لوگ زندیق ہیں[1]۔ (کفایہ ص ۴۹)

کفایہ ہی میں خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے یہ روایت بھی دی ہے۔

عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللّٰہ اختارنی و اختار اصحابی فجعلھم اصھاری وجعلھم انصاری وانہ سیجیئی فی اٰخر الزمان قوم ینتقصونھم الا فلاتنا کحوھم الا فلا تنکحوا الیھم الا فلا تصلوا معھم الا فلا تصلوا علیھم، علیھم حلت اللعنۃ.

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چنا اور میرے صحابہ کو (بھی) چنا، تو ان میں میرے نکاح والے رشتہ دار بنائے اور انہیں میرا مددگار بنایا، آخری زمانہ میں ایسے لوگ آنے والے ہیں جو ان میں نقص ثابت کریں گے، دیکھو! ان سے نکاح شادی کے رشتے نہ قائم کرنا، دیکھو ان کے یہاں منگنی (بھی) نہ لے جانا، دیکھو! ان کے ساتھ نماز نہ پڑھنا (اور وہ مرجائیں تو) دیکھو! ان کی نماز جنازہ نہ پڑھنا، ان پر (پھٹکار اور) لعنت برسے گی۔''

باقی دلیلیں اور بھی بہت ہیں لیکن ہمارے اس بیان سے خوب واضح ہوگیا کہ یہ ایک عقیدہ

ہے جس پر صدر اوّل سے اتفاق و اجماع چلا آ رہا ہے۔
حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کرتے ہوئے فرمادیا:

ولکن اللّٰہ حبّبَ الیکم الایمان وزینه فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان. اولٰئک ھم الراشدون. فضلاً من اللّٰہ ونعمةً. واللہ علیمٌ حکیم.

''اللہ تعالیٰ نے محبت بھر دی تمہارے اندر ایمان کی اور اس کو سجا دیا (آراستہ کر دیا) تمہارے دلوں میں اور نفرت بھر دی تمہارے اندر کفر سے، فسق سے اور عصیان سے، یہی ہیں جو راشد ہیں اللہ کے فضل سے اور احسان سے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔'' (سورۂ حجرات رکوع ۱)

فرقِ مراتب:

یہ درست ہے کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فرقِ مراتب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مثلاً

(الف) **السابقون الاولون**۔ (یہ وہ حضرات ہیں جو غزوات بدر، اُحد اور احزاب میں شریک ہوئے)۔

(ب) وہ چودہ سو حضرات جنہوں نے مقام حدیبیہ پر خصوصی بیعت کی۔ جس کو ''بیعتِ رضوان'' کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے متعلق حق جل مجدہ نے اعلان فرمادیا۔

لقد رضی اللّٰہ

''یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا'' (سورۂ فتح)

(ج) جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے جہاد کیا اور فی سبیل اللہ خرچ کیا۔ ان کے بارے میں ارشاد ہوا (**اولٰئک اعظم درجة** (سورۃ الحدید ع ۱) یہ درجہ میں بڑھے ہوئے ہیں۔

(د) جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے ان کا درجہ اگرچہ وہ نہیں ہے لیکن ''الحسنٰی'' کا وعدہ ان کے لیے بھی ہے۔ **وکلا وعداللّٰہ الحسنی** حدید) ان میں وہ بھی آ گئے جن کو

''طلقاء'' کہا جاتا ہے لیکن سورہ حجرات کی مذکورہ بالا آیتیں جو فتح مکہ کے بعد نازل ہوئیں ان میں بلا استثناء جملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خصوصیتیں بیان فرمائی گئی ہیں۔

☆ ان کو ایمان محبوب ہے۔

☆ ایمانی خصلتیں ان کے دلوں میں ایسی رچ چکی ہیں کہ ایمان ان کے دلوں کی زینت بن گیا ہے اور ان کے قلوب زیورِ ایمان سے آراستہ ہو گئے ہیں۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایمان کے برخلاف کفر وفسق اور عصیان سے ان کو پوری پوری نفرت ہوگئی ہے، لہٰذا ان سب کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اعلان یہ ہے اولئک هم الراشدون یعنی یہی حضرات ہیں جو رشد وہدایت کے حقیقی اہل ہیں، یعنی فقط عادل وثقہ نہیں ہیں بلکہ عادل وثقہ لوگوں کے لیے مثالی شخصیتیں ہیں عادل وثقہ اور راشدان کو کہا جائے گا جو ان کے نقشِ قدم پر چلے گا، اس آیت کو بار بار پڑھیے اور غور فرمائیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مدلل طور پر یہ واضح اعلان کر دیا کہ راشد یہی ہیں تو کیا کوئی صاحبِ ایمان جرأت کر سکتا ہے کہ ان پر تنقید کرتے ہوئے خامہ فرسائی یا لب کشائی کرے، یہ وہ ہیں جن کو سرورِ کائنات محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اصحابی'' (میرے ساتھی) فرمایا۔ اُن کی عزت کو اپنی عزت، ان کی محبت کو اپنی محبت، ان سے بغض رکھنے والے کو (معاذ اللہ) ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض و عداوت کی علامت قرار دیا۔

اللّٰہ اللّٰہ فی اصحابی لا تتخذوهم من بعدی غرضا. من احبهم فبحبی احبهم ومن ابغضهم فببغضی ابغضهم.

''میرے ساتھیوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، ان کو میرے بعد (تنقید کا) نشانہ نہ بناؤ، جو ان سے محبت رکھتا ہے وہ درحقیقت مجھ سے محبت رکھتا ہے اور اس لیے وہ ان ساتھیوں سے محبت رکھتا ہے اور جو اُن سے بغض رکھتا ہے اس کو دراصل مجھ سے بغض ہے، اس بنا پر ان سے بھی بغض رکھتا ہے۔''

ممکن ہے اس حدیث کی ''سند'' پر بحث کی جائے، مگر جس حدیث کے مضمون کی تائید و تصدیق قرآن حکیم سے ہو رہی ہو، اس کی سند اگر ضعیف بھی ہو تب بھی وہ قوی اور مستند قرار دی جاتی ہے اور اس سے استدلال صحیح مانا جاتا ہے۔

ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کہ چند وہ بھی ہوں گے جن کو حوضِ کوثر سے ہٹا دیا جائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے یہ تو میرے صحابی معلوم ہوتے ہیں، جواب دیا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد یہ لوگ پچھلے پاؤں پھر گئے تھے۔ **انهم ارتدوا على ادبارهم القهقهرى** پچھلے پاؤں لوٹنے والے لامحالہ وہ ہیں جو مسیلمہ کذاب یا اسود عنسی کے ساتھ ہو کر مرتد ہو گئے، دوسری روایت میں یہ ہے **لا تدرى ما احدثوا بعدك** (بخاری ص ۹۷۴) آپ کو نہیں معلوم آپ کے بعد انہوں نے کیا ایجاد کیا لیکن وہ حضرات اس حدیث کے مصداق یقیناً نہیں ہو سکتے جن کے متعلق کلام اللہ شریف میں **رضى الله** یا **اعظم درجة** یا **الراشدون** آ گیا یا جن کے متعلق لسانِ رسالت سے کوئی بشارت صادر ہو گئی اور اس بنا پر ان چند کی وجہ سے جو غیر معلوم اور غیر معین ہیں، جماعتِ صحابہ پر تنقید جائز نہیں ہو سکتی۔

خصوصاً جبکہ صحابہ کے بعض پورے کے پورے طبقوں کے بارے میں حق تعالیٰ عز اسمہ نے اور حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھلائی کی شہادت دی ہو، انصار کے بارے میں مہاجرین وغیرہم کو وصیت فرمائی۔

اوصيكم بالانصاف فانهم كرشي وعيبتي وقد قضوا الذى عليهم وبقي الذى لهم

> ''میں تم کو انصار کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ تو میرے عیال اور راز داں ہیں اور جو اُن کے ذمہ خدمتِ اسلام کا کام تھا وہ انہوں نے پورا کر دیا اور (اب) ان کا حق (سب پر) باقی رہ گیا ہے''۔ (بخاری ص ۵۳۶)

ارشاد فرمایا:

لولا الهجرة لكنت امرأ من الانصار

یعنی اگر ہجرت کی فضیلت نہ ہوتی تو میں انصار ہی میں اپنے آپ کو شمار کرلیتا۔ (بخاری ص ۵۳۳)

ارشاد ہوا:

آیة الایمان حب الانصار و آیة النفاق بغض الانصار

''انصار سے محبت ایمان کی نشانی ہے اور ان سے بغض نفاق کی علامت ہے۔'' (بخاری ص ۵۳۴)

ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار غزوۂ خندق کے موقعہ پر ارشاد فرمایا:

اللھم لا عیش الا عیش الاخرة فاکرم الانصار و المھاجرہ

''اے اللہ! زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے تو انصار اور مہاجرین کو اپنے اکرام سے نواز۔'' (بخاری ص ۵۳۵)

دوسری روایت میں دوسری دعا ہے:

فاغفر المھاجرین و الانصار

''مہاجرین اور انصار کی بخشش فرمادے۔''

گویا اکرام اور مغفرت دونوں کی دعا دی۔

ایک روایت میں انصار سے بڑھ کر اُن کی اولاد کے بارے میں بھی دعا فرمانے کا واقعہ آتا ہے:

قالت الانصار یا رسول اللہ لکل نبی اتباع و انا قد اتبعناک فادع اللہ ان یجعل اتباعنا منک فدعا بہ

''(ایک دفعہ) انصار نے عرض کیا یارسول اللہ ہر نبی کے پیروکار ہوئے ہیں اور ہم جناب کے پیروکار ہیں، آپ یہ دعا فرمادیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے بعد میں آنے والوں (اولاد) کو جناب کا پیروکار رکھے۔ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دعا فرمادی''۔ (بخاری ص ۵۳۴)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اس سے بھی بڑھ کر تین نسلوں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی دعا منقول ہے، فرمایا:

سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اللھم اغفر للانصار ولذراری الانصار ولذراری ذراریھم

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اے اللہ انصار کو بخش دے، انصار کی اولاد کو اور ان کی اولاد کی اولاد کو بھی''۔ (ترمذی ص ۲۳۰)

اس میں تابعین اور تبع تابعین کی فضیلت بھی آ رہی ہے اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا مستجاب تھی۔

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف میں ارشاد ہوا:

خیر اُمّتی قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم

''میری اُمت میں بہترین میرے زمانہ کے لوگ ہیں پھر جو اور بعد میں آئیں گے پھر اس کے بعد (درجہ میں) وہ ہوں گے جو ان کے بعد آئیں گے۔''

ان روایتوں کا مضمون قرآن حکیم کی آیت کے عین مطابق ہے خاص طور پر مہاجرین کے بارے میں ارشاد ہوا:

اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ

''وہ لوگ کہ جن کو ان کے گھر سے نکالا گیا اور ان پر سوائے اس کے کوئی دعویٰ نہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔'' (پ ۱۷ رکوع ۱۳)

اس میں ان کی قلبی حالت اور ایمان پر پختگی اور اُن کی مظلومیت بتائی گئی ہے۔

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ

''اور جنہوں نے اللہ کے واسطے گھر چھوڑا ظلم اُٹھانے کے بعد، ہم انہیں یقیناً دُنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا ثواب تو بہت بڑا

ہے۔'' (پ ۱۴ ارکوع ۱۱)

اس میں ثواب آخرت کی بشارت دی گئی ہے۔ فضیلت عام میں ارشاد ہوا:

يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِىَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَه

''جس دن کہ اللہ ذلیل نہ کرے گا نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ یقین لاتے ہیں۔'' (پ ۲۸ رکوع ۲۰ سورہ تحریم)

يَا اَيُّهَا النَّبِىُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

''جس دن کہ اللہ ذلیل نہ کرے گا نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ یقین لاتے ہیں۔'' (پ ۱۰ ارکوع ۴)

يَا اَيُّهَا النَّبِىُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

''اے نبی! تجھے اللہ کافی ہے اور جتنے مومنین تیرے ساتھ ہیں۔'' (پ ۱۰ ارکوع ۴)

لہٰذا اُن چند لوگوں کا ذکر ہی کیا جن کے ساتھ قیامت میں وہ معاملہ ہو گا جو بعض روایات میں آیا ہے اور ایسے غیر معروف لوگوں سے نہ روایات لی گئی ہیں، نہ علم دین پھیلا ہے، نیز تاریخ اور اسماء الرجال میں ایسے صرف چند ہی لوگوں کا ذکر ملتا ہے۔ بحث تو باقی کل صحابہ کی ہے کہ جن سے اسلام پھیلا ہے اور علم دین لیا گیا ہے اور آپ نے تو حد ہی کر دی کہ ان میں اخص الخواص حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو جو دامادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ذی النورین اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں زیر بحث لے آئے، حالانکہ ان کی فضیلت پر جیسا کہ تمام کتب عقائد میں ہے پوری اُمت کا اجماع و اتفاق چلا آ رہا ہے۔

تنقیدی مواد:

مودودی صاحب احادیث پر تنقید کرنے میں بہت چست ہیں، آپ کی یہ چستی کبھی کبھی حد استہزاء تک بڑھ جاتی ہے، مگر یہاں حدیث کا سہارا لے رہے ہیں، فرماتے ہیں ''خواہ وہ کسی حدیث ہی میں وارد ہوئی ہو'' اگر مودودی صاحب کے قلبِ مبارک میں دیانت اور عدل و انصاف کا نور ہو گا تو اس جملہ کو لکھنے کے وقت خود اُن کا قلب ان پر ملامت کر رہا ہو گا۔

کیا مودودی صاحب خود نہیں جانتے کہ جو روایتیں تاریخ کی کتابوں میں ہیں ان کی

حیثیت کیا ہے، سو روایتوں میں بمشکل ایک دو روایتیں ایسی ہوں گی جو حدیث صحیح کے معیار پر پوری اُتر سکیں۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ فتنہ جس کا آغاز خلافت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آخری دور سے شروع ہو گیا تھا (جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔ انشاء اللہ) وہ قتل وقتال اور جنگ و پیکار تک محدود نہیں رہا بلکہ دین کے ہر ایک جز و اور ہر ایک گوشہ پر اس نے ضرب لگائی انتہا یہ کہ پورے دین کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔

قرآنِ حکیم تو اس کی دست برد سے محفوظ رہا کیونکہ قرآن حکیم کو نازل کرنے والا طے کر چکا تھا کہ وہ محفوظ رہے گا اور اس کی حفاظت خود اپنے ذمہ لے چکا تھا۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون

مگر احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں اس فتنہ نے خوب پر پھیلائے، اس فتنہ کے علم برداروں کا ایک ناپاک حربہ یہ تھا کہ اپنی مصلحت اور ضرورت کے بموجب وہ تک بندی کرتے اور اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے۔ جب وہ ذاتِ اقدس سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی اتنے دلیر تھے تو عام صحابہ کرام کی طرف کسی فرضی بات کا منسوب کر دینا ان کے لیے کیا مشکل تھا۔

عقائد کے سلسلہ میں زندیقوں اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق ان دُشمنانِ صحابہ نے جب چاہا حدیث گھڑ لی، اس طرح بے شمار موضوع حدیثیں زبانوں پر جاری اور کتابوں میں درج ہو گئیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی طرح اس دین کی حفاظت بھی اپنے ذمہ لے لی ہے، چنانچہ بقول ''ہر فرعونے راموسیٰ'' اللہ تعالیٰ نے عباد صالحین کی ایسی جماعت پیدا کر دی جس نے ان راویوں کی تحقیق کی جن کے حوالہ سے یہ احادیث نقل کی جاتی تھیں اس طرح اسماء الرجال کا بہت بڑا ذخیرہ جو ہزاروں صفحات میں محفوظ ہے مرتب ہو گیا، پھر موضوع احادیث کو خارج کر کے قابل استناد حدیثوں میں مراتب قائم کیے، اس تحقیق وتنقید میں ان فرشتہ خصلت مقبولانِ بارگاہِ ربانی کو کتنی سخت محنت کرنی پڑی ہوگی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بخاری شریف

کے متعلق علماء کا بیان ہے کہ حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے ان کو منتخب فرمایا ہے جو بخاری شریف میں جمع ہیں جن کی کل تعداد سات ہزار دو سو پچھتر ہے یعنی تقریباً سو حدیثوں میں سے ایک حدیث اس قابل قرار پائی کہ اس کو مصنف اپنی کتاب میں داخل کرسکیں۔

یہ تنقید و تحقیق کا عمل ان احادیث میں تو ہوا جن کا تعلق عقائد یا فقہی مسائل سے ہے لیکن جن کا تعلق غزوات یا آپس کی آویزش سے تھا حضرات محدثین نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔

وہ حضرات مؤرخین کی جولا نگاہ بنی رہی، ان مؤرخین میں وہ بھی ہیں جو محدث ہیں مگر چونکہ ان روایتوں کو ایمان و عمل کے لحاظ سے بنیادی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ لہٰذا ان محدثین حضرات نے بھی ان روایتوں کی تحقیق و تنقید کی طرف توجہ نہیں فرمائی، نتیجہ یہ ہوا کہ رطب و یابس ہر طرح کی روایتیں اس انبار میں پڑی رہ گئیں، یہ ایک واضح حقیقت ہے اس سے کوئی بھی انصاف پسند صاحب بصیرت انکار نہیں کرسکتا۔

آیاتِ کتاب اللہ کے مقابلہ میں اگر کوئی صحیح السند حدیث بھی ہو تو حدیث کی تاویل کی جاتی ہے، اس کا کوئی ایسا محمل معین کیا جاتا ہے جو کتاب اللہ کے خلاف نہ ہو اور اگر کوئی تاویل اور توجیہہ نہیں ہوسکتی تو اس حدیث کو ساقط مانا جاتا ہے۔

بہر حال جب صحیح حدیث کو بھی کتاب اللہ کے مقابلہ پر تسلیم نہیں کیا جاتا تو کتب تاریخ کی احادیث کو جو عموماً کمزور ہوتی ہیں کتاب اللہ کے مقابلہ میں کس طرح تسلیم کرلیا جائے گا؟ اور یہ کس طرح جائز ہوگا کہ کسی تاریخی روایت کی بنا پر اس کو غیر راشد اور غیر صالح قرار دیں جس کو کلامِ ربانی نے ''راشد'' قرار دیا ہے، یہ بعض حضرات جن کے متعلق مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ ''نرالا قاعدہ کلیہ پیش کرتے ہیں'' غالباً شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

آپ نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا ''یہ مؤرخین کی روایتیں تو عموماً بے سر و پا ہوتی ہیں، نہ راویوں کا پتہ ہوتا ہے اور نہ ان کی توثیق، تخریج کی خبر ہوتی ہے نہ اتصال و انقطاع سے بحث ہوتی ہے اور اگر بعض متقدمین نے سند کا التزام کیا بھی ہے تو عموماً ان میں سے

ہر غث وثمین اور ارسال وانقطاع سے کام لیا گیا ہے، خواہ ابن الاثیر ہوں یا ابن قتیبہ، ابن ابی الحدید ہو یا ابن سعد، ان اخبار کو مستفاض اور متواتر قرار دینا بالکل غلط ہے اور بے موقع ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق ان قطعی اور متواتر نصوص و دلائل عقلیہ ونقلیہ کی موجودگی میں اگر روایات صحیح احادیث کی بھی موجود ہوتیں تو مردود یا مؤول قرار دی جاتیں، چہ جائیکہ روایاتِ تاریخ۔ (مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۲۶۶، جلد ۱)

مودودی صاحب کے مآخذ:

لیکن چونکہ مودودی صاحب کی اس تصنیف شریف کا تمام مواد اِسی طرح کی روایتوں سے پر ہے جن کو اگر چہ ان بڑے بڑے مؤرخین نے نقل کیا ہے جن کے اوصاف مودودی صاحب نے تقریباً آٹھ صفحات میں شمار کرائے ہیں (ص ۳۰۸ تا ص ۳۱۶) مگر وہ تمام روایتیں مجروح ہیں اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، متضاد لیکن عجیب لطیفہ یہ ہے کہ اگر کوئی اس کمزوری کا تذکرہ کرتا ہے تو مودودی صاحب نہ صرف خفا ہو جاتے ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ ایسے چڑ جاتے ہیں کہ اُن کی متانت اور سنجیدگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ انتہا یہ کہ طرزِ نگارش بھی سوقیانہ ہو جاتا ہے۔

ملاحظہ ہو ''حدیث اور تاریخ کا فرق'' اس عنوان کے تحت مودودی صاحب فرماتے ہیں ''بعض حضرات تاریخی روایات کو جانچنے کے لیے اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں راویوں کو ائمہ رجال نے مجروح قرار دیا ہے اور فلاں راوی جس وقت کا واقعہ بیان کرتا ہے اُس وقت تو وہ بچہ تھا یا پیدا ہی نہیں ہوا تھا اور فلاں راوی یہ روایت جس کے حوالہ سے بیان کرتا ہے اُس سے تو وہ ملا ہی نہیں۔ اس طرح وہ تاریخی روایات پر تنقید حدیث کے اصول استعمال کرتے ہیں اور اس بنا پر اُن کو رد کر دیتے ہیں کہ فلاں واقعہ سند کے بغیر نقل کیا گیا ہے اور فلاں روایت کی سند میں انقطاع ہے۔ یہ باتیں کرتے وقت اس کو بھول جاتے ہیں کہ محدثین کی روایات کی جانچ پڑتال کے یہ طریقے دراصل احکامی احادیث کے لیے اختیار کیے ہیں۔ کیونکہ ان پر حرام وحلال، فرض وواجب اور مکروہ و مستحب جیسے اہم شرعی امور کا فیصلہ ہوتا ہے اور یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ دین میں کیا چیز سنت ہے اور کیا چیز سنت نہیں ہے۔ یہ شرائط اگر تاریخی واقعات کے معاملہ میں لگائی جائیں تو اسلامی تاریخ کے ادوار مابعد کا تو

سوال ہی کیا ہے۔ قرنِ اوّل کی تاریخ کا بھی کم از کم ۹/۱۰ حصہ غیر معتبر قرار دیا جائے گا۔ (ص ۳۱۷ تا ص ۳۱۸)

غور فرمائیے یہ مودودی صاحب کا جواب ہے یا لا جواب ہونے کا اعتراف ہے یعنی آپ کے ارشاد کے بموجب اس روایت کی سند پر تو بحث ہو سکتی ہے جس میں وضو کرتے وقت داڑھی میں خلال کا تذکرہ ہو یا معلوم ہو کہ استنجے کے لیے تین ڈھیلے لینا ضروری ہیں یا دو بھی کافی ہو سکتے ہیں؟ جس کی اگر تعمیل نہ کی جائے تو نہ کوئی عقیدہ چھوٹتا ہے نہ کوئی فریضہ فوت ہوتا ہے لیکن وہ روایت جو عثمان غنی رضی اللہ عنہ جیسے خلیفۂ راشد کو جو عقیدۂ اہل سنت والجماعت کے بموجب حضرت صدیق وحضرت فاروق رضی اللہ عنہما کے بعد پوری اُمت میں سب سے افضل ہیں معاذ اللہ خائن قرار دے، اس کی سند پر بحث نہیں کر سکتے، اس کو جوں کا توں مان لینا چاہیے کیونکہ وہ تاریخی روایت ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم (سورہ حجرات)

کیا اس آیت کی رو سے بدگمانی حرام نہیں؟ لیکن وہ روایتیں جو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق بدگمانی پیدا کریں اور اس حرام کا مرتکب بنائیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں ان کی سند سے بحث نہ کرو، ان کو بلا چون و چرا تسلیم کرلو، کیونکہ وہ تاریخی روایتیں ہیں معاذ اللہ

ع بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است۔

ایک اور لطیفہ ملاحظہ فرمائیے، مودودی صاحب فرماتے ہیں ''یہ ہیں وہ مآخذ جن سے میں نے اپنی بحث میں سارا مواد لیا ہے اگر اس دور کی تاریخ کے معاملہ میں قابل اعتماد نہیں ہیں تو پھر یہ اعلان کر دیجیے کہ عہد رسالت سے لے کر آٹھویں صدی تک کی کوئی اسلامی تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے۔ (ص ۳۱۶)

مودودی صاحب! ہم یہ اعلان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ البتہ یہ مطالبہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ان ماخذ سے جو لیں ایمانداری سے لیں۔ یہ ہرگز نہ ہو کہ کسی اختراع کردہ نظریہ کی تائید و حمایت کے لیے تو ڈھونڈ کر کچھ روایتیں اخذ کی جائیں اور وہ مفصل روایتیں جو انہیں کتابوں میں

آپ کے منشاء کے خلاف ہوں ان کو نظر انداز کر دیں۔ اس گندم نمائی جو فروشی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

آخر یہ کیا بات ہے کہ اعتراضات کے جوابات بھی انہیں مآخذ سے دیے جاتے ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ آئندہ مباحث میں ہمارا ماخذ بھی یہی کتابیں ہوں گی۔ مگر ہم اپنے نظریہ کو ٹھونسنے کی کوشش نہیں کریں گے، نہایت سادگی سے انہیں کتابوں کے بیان کردہ واقعات کو بیان کریں گے۔ (انشاءاللہ)

پھر اگر مطالبہ کرنے والے حضرات آپ کے متعلق یہ کہیں ع چہ دِلاورا ست دزدے کہ بکف چراغ دارد، تو یہ ہمارا قصور نہیں ہوگا، بلکہ آپ کے عمل کے مطابق یہ ایک منصفانہ فیصلہ ہوگا۔ بہرحال آپ ان مآخذ کو دریا برد نہ کیجیے، صرف اپنے عقیدے اور نیت کی اصلاح کر لیجیے۔

ان تمہیدی مقدمات کے بعد ہم سیّدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے معاملہ کو لیتے ہیں۔ حضرت موصوف کی جو کچھ کمزوریاں بیان کی جاتی ہیں اگرچہ ان کے تفصیلی جوابات بھی سامنے آئیں گے (انشاءاللہ) مگر مختصر جواب یہ ہے کہ جس شخص میں یہ کمزوریاں ہوں اگرچہ وہ مسلمان رہ سکتا ہے اور مرنے کے بعد نجات بھی پا سکتا ہے، مگر مقبولِ بارگاہ ربانی نہیں ہو سکتا کہ اس کو دنیا میں بشارتوں پر بشارتیں دی جائیں اور قبل از شہادت شہید کے خطاب سے نوازا جائے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے یہ مناقب اپنی جگہ درست ہیں کہ آپ **السابقون الاولون** میں سے ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **رضی الله عنهم** (سورہ توبہ آیت ۱۰۰)

غزوۂ اُحد میں جو آپ سے لغزش ہو گئی تھی اس کے متعلق ارشادِ ربانی ہے:

لقد عفا الله عنهم (سورہ آل عمران آیت ۱۵۵)

حدیبیہ کے موقعہ پر آپ کا سب سے اہم اور سب سے بڑا کارنامہ جس کو آپ کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا تھا اور اس موقعہ پر تمام جان نثارانِ اسلام کے متعلق ارشاد ہے:

لقد رضی الله (سورہ الفتح آیت ۱۸)

اس طرح کے مناقب کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی طور پر یہ ارشاد

بشره بالجنة معها بلاء يصيبة (بخاری شریف ص۱۰۵۲) علی بلوی ستصیبه (بخاری شریف ص۵۲۲) ''ان کو جنت کی بشارت دے دو، ساتھ ساتھ یہ خبر بھی دے دو کہ ان کو ایک آزمائش میں مبتلا ہونا ہوگا۔''

سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد واضح کررہا ہے کہ جو کچھ آپ کے ساتھ کیا گیا وہ آپ کی غلطیوں کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ بہت بڑا امتحان یہ تھا کہ غیر مجرم کو مجرم گردانا گیا، غلط بنیادوں پر آپ کے خلاف طوفان برپا کیا گیا اور آپ اس میں ثابت قدم رہے، ان شورہ پشت گستاخوں کو آپ کے آزاد کردہ غلام ہی ٹھیک کرسکتے تھے، مگر آپ نے اپنی قربانی منظور کی اور یہ گوارا نہیں کیا کہ آپ کی وجہ سے کسی بھی مسلمان کو گزند پہنچے، آپ دیکھ رہے تھے کہ فتنہ عظیم سروں پر منڈلا رہا ہے۔ خون کی ندیاں بہنے والی ہیں مگر آپ نے انتہا درجہ صبر آزما حالات میں پوری احتیاط برتی کہ آپ کی طرف سے اس کا آغاز نہ ہو۔

آپ نے اس کو برداشت کرلیا کہ لوگ آپ کا خون بہائیں مگر آپ نے اس کو برداشت نہیں کیا کہ آپ کی موجودگی میں آپ کی طرف سے خون کا کوئی ایک قطرہ بھی زمین پر گرنے پائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز کوہ احد پر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم آپ کے ساتھ تھے، پہاڑ میں حرکت ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پائے مبارک پشتِ کوہ پر مارا اور فرمایا

اسکن احد لیس علیک الا نبی و صدیق شهید ان (بخاری شریف ص۵۲)

احد! ساکن ہو جا۔ تیرے اُوپر اور کوئی نہیں ہے ایک نبی ہے، ایک صدیق ہے، دو شہید ہیں (عمر و عثمان رضی اللہ عنہما)

کوئی چشم بصیرت رکھتا ہو وہ ان بشارتوں کو دیکھے، ان کی اہمیت کو سمجھے، پھر غور کرے، کیا کوئی ایسا شخص اس عظیم الشان بشارت کا (جس میں پوری اُمت کے صرف تین بزرگ شریک ہیں) مستحق ہوسکتا ہے۔ جو بقول مودودی صاحب:

۱۔ معیار مطلوب کو پورا نہ کرسکا ہو (خلافت و ملوکیت ص۹۹)

۲- جس نے اپنے عہد میں بنی اُمیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے اور بیت المال سے عطیے دیے ہوں جس سے دوسرے قبیلوں نے تلخی محسوس کی ہو۔ (ایضاً ص ۹۹)

(یعنی جس نے فرائضِ خلافت دیانتداری سے پورے نہ کیے ہوں، جس نے مسلمانوں کی حق تلفی اور بیت المال کے مال میں خیانت کی ہو کہ اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے عطیے دیے ہوں)۔

۳- جس نے ایسی پالیسی اختیار کی جو بلحاظ تدبیر نامناسب بھی تھی اور عملاً نقصان دہ بھی ثابت ہوئی۔ ص ۳۲

۴- جس نے اکابر صحابہ کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا ہو اور قرابت کی بنا پر کم درجہ کے لوگوں کو ان بڑے منصبوں پر فائز کر دیا ہو۔ (ص ۱۰۷ تا ص ۱۱۶)

۵- جس نے خلافت کی بنیاد میں قبائلیت کا وہ بارود بھر دیا ہو جس نے خلافت راشدہ کے نظام کو پھونک کر رکھ دیا ہو۔ (ص ۱۰۰)

محترم مودودی صاحب! گستاخی معاف، ہم جیسے لوگ مصلحت پرست ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی کو خوش کرنے کے لیے مدحیہ قصیدہ لکھ دیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی فریق کی خوشنودی کے لیے کوئی کتاب تصنیف کر دیں، مگر کیا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول بھی ہماری طرح مصلحت پرست تھے کہ ایسے شخص کو جس میں نقائص موجود ہوں وہ بشارت دے دیں جو ہزاروں صحابہ اور اُمت کے لاکھوں کروڑوں علماء، فضلاء، مشائخ طریقت اولیاء اللہ میں صرف دس کو دی گئی ہو، مزید برآں اس رتبہ کا مژدہ سنا دیں جو صرف تین کو سنایا گیا ہو، جن کی وجہ سے زلزلہ پذیر پہاڑ بھی ساکن ہو گیا ہو۔

اب اگر وہ بشارتیں صحیح ہیں جن میں سے چند بشارتیں اُوپر بیان کی گئیں اور ان بشارتوں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے معاذ اللہ چاپلوسی اور بے جا خوشامد سے کام نہیں لیا، بلکہ وہ بشارتیں ایک واقعی اور حقیقی حیثیت کا اظہار ہیں تو لامحالہ وہ تمام روایتیں غلط ہیں جن سے آپ نے مذکورہ بالا نتائج اخذ کیے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کوتاہیاں اور غلطیاں شمار کرنے کے بعد آپ یہ بھی فرماتے

ہیں کہ اس ایک پہلو کو چھوڑ کر باقی جملہ پہلوؤں سے ان کا کردار بحیثیت خلیفہ ایک مثالی کردار تھا۔ (ص ۱۱٦) پھر آپ نے چند اوراق میں (از ص ۳۲۱ تا ۳۲۸) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کی تشریح بھی فرمائی ہے جس میں آپ نے ان الزامات کو زیادہ شدت وحدت کے ساتھ دہراتے ہوئے یہ معذرت فرمائی ہے۔

"یہ نیت کی غلطی نہیں بلکہ رائے کی غلطی یا بالفاظ دیگر اجتہادی غلطی تھی۔ (ص ۳۲۱)

شاید مودودی صاحب نے انہی بشارتوں کے پیش نظر یہ معذرت فرمائی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ چونکہ اجتہادی غلطی کی بنا پر یہ کام ہوئے تو اس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مرتبہ اور درجہ میں فرق نہیں آیا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اجتہادی غلطی کی بنا پر یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ غلطی کرنے والے کی عند اللہ گرفت نہیں ہوگی اور اگر گرفت ہوئی بھی تو معافی ہو جائے گی لیکن مقبولیت عند اللہ کی شان اس سے بہت بلند ہے۔

اجتہادی خطا کار کو گنہگار نہیں کہا جا سکتا، مگر ایسا شخص مقبول عند اللہ بھی نہیں ہو سکتا، مقبولیت بھی ایسی کہ پوری اُمت میں صرف تین حضرات کو حاصل ہوئی۔

ضمیمہ میں ایک عنوان یہ بھی ہے کہ غلطی کے صدور سے بزرگی میں فرق نہیں آتا (ص ۳۰۷)

ہم یہ تو تسلیم نہیں کرتے کہ بزرگی میں فرق نہیں آتا، اگر کوئی فرق نہیں آیا تھا تو غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے پر حضرت کعب بن مالک اور ان کے دو ساتھیوں کو وہ مشہور کفارہ کیوں ادا کرنا پڑا کہ پچاس روز تک کا مقاطعہ کیا گیا، حتیٰ کہ توبہ قبول ہوئی اور معافی کی بشارت نازل ہوئی۔ (سورہ توبہ)

نیز واقعہ بنی قریظہ میں حضرت ابولبابہ نے اپنے آپ کو کھمبے سے کیوں باندھ دیا، البتہ ہم یہ مانتے ہیں کہ صدور، بزرگی کے منافی نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے سوا معصوم کوئی نہیں، حضرات صحابہ سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ غلطیوں کو سر تھوپنا کہاں تک درست ہے، اس تصنیف کا شاہکار یہی ہے کہ آپ نے غلطیوں کو سر تھوپا ہے اور ان واقعات پر پردہ ڈال دیا ہے جو ان غلطیوں کی تردید

کرتے ہیں، حالانکہ مذکورہ بالا آیات اور بشارات کا تقاضا یہ تھا کہ آپ تردید کرنے والے واقعات کے بیان میں قلم کا وہ زور صرف کرتے جو آپ نے غلطیوں کے ثابت کرنے میں صرف کیا ہے۔

آخر میں آپ اس بشارت کو بھی سامنے رکھئے جس کا تذکرہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس شورش کے زمانہ میں بار بار فرمایا، بالآخر اسی بشارت کی سرشاری میں جان عزیز قربان کردی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

"یاعثمان لعل اللہ یقمصک قمیصا فان ارادوک علی خلعه فلا تخلعه لهم (ترمذی شریف ص۲۱۲ ج۲)

"اے عثمان! اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ایک قمیص پہنائے گا پھر اگر وہ لوگ تمہارے اُوپر سے اس قمیص کے اُتار دینے کا ارادہ کریں تو ان کے (کہنے پر) تم اس قمیص کو نہ اُتار دینا۔"

جن ایام میں آپ محصور تھے اور بلوائیوں نے آپ کے دولت کدہ کو گھیر لیا تھا تب خود آپ نے بھی فرمایا تھا:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عهد الی عهد افانا صابر علیه (ترمذی شریف ص۲۱۲)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ایک وعدہ لیا تھا، میں اس پر جما ہوا ہوں، کیا معمولی عقل وفہم کا انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے دولتِ ایمان سے نوازا ہو یہ تصور کرسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کو اپنے منصب پر قائم رہنے کی تاکید فرمائی ہو جس نے اپنے منصب کا غلط استعمال کیا ہو اور معیار مطلوب کو پورا نہ کرسکا ہو جس نے اکابر صحابہ کو معزول کر کے اپنے رشتہ داروں کو ان کی جگہ بھرتی کیا ہو اور ان کو من مانے عطیے دیے ہوں، جس نے خلافت راشدہ کی بنیادیں کھوکھلی کردی ہوں۔

حضرات مؤرخین نے تقریباً متفقہ طور پر سیّدنا حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر،

حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم وغیرہ صحابہ اور بہت سے تابعین سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لشکروں پر لعنت بھیجی جو مقام ذی مروہ، ذی خشب اور مقام اعوص پر پڑاوُ ڈالیں گے، یہی مورخین بالاتفاق بیان کرتے ہیں کہ انہیں لشکروں نے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوا کیا تھا ان مقامات پر پڑاوُ ڈالا تھا۔

کسی بھی صاحب ایمان کے لیے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ یہ تصور کر سکے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خیانت اور صرف بے جا جیسے کبائر کے مرتکب ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے طائف کے کفار پر بھی لعنت نہیں بھیجی تھی وہ ان بے قصور لشکروں پر لعنت فرمائیں جنہوں نے ایک خائن و مجرم خلیفہ کی اصلاح کر کے قدم بڑھایا تھا اور اپنے آپ کو جنگ کے خطرات میں مبتلا کیا تھا۔

ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور کتاب اللہ کی آیات صحیح ہیں ان کے مضامین صحیح ہیں، ان کے مضمرات صحیح ہیں، لہٰذا ہمارا ایمان یہ بھی ہے کہ وہ تمام روایتیں غلط اور موضوع ہیں جن کا مفاد اور مضمون آیات و احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ایک صاحب ایمان کے لیے ہمارا یہ جواب کافی ہے اور ضرورت نہیں کہ تاریخی روایتوں کی تحقیق، تنقید اور تاریخی واقعات کے بیان کرنے کی طوالت برداشت کی جائے۔ لیکن اس سے ان کو اطمینان نہیں ہوگا جن کے ذہنوں کو یہ تاریخی روایتیں متاثر کر چکی ہیں اور ممکن ہے ہمارے سکوت کو وہ فرار قرار دیں۔

علاوہ ازیں مودودی صاحب کی شیعیت نواز ذہنیت نے تاریخی واقعات کے بیان میں جو مجرمانہ کوتاہی بلکہ خیانت کی ہے اس کا بھی اظہار نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ بشارتوں سے ہٹ کر تاریخ پر بھی نظر ڈالیں۔ لہٰذا آئندہ صفحات میں تاریخی حقیقتیں پیش کی جائیں گی۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) مگر اس معذرت کے ساتھ کہ ہم مودودی صاحب کی سنت پر عمل نہیں کر سکیں گے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے مقدس صحابی کے متعلق شیعی فکر کے بموجب ایک رائے پہلے قائم کر لیں اور صرف ان روایتوں کو پیش کریں جو اس رائے اور فکر کی تائید کرتی

ہوں، اس کے برخلاف ہمارا عمل یہ ہوگا کہ کتب تاریخ میں جو واقعات آئے ہیں وہ بلا کم و کاست بیان کریں گے اور نتیجہ وہ اخذ کریں گے جو خود یہ واقعات اپنی زبان سے بیان کریں گے۔

یہ بات مودودی صاحب بھی مانتے ہیں کہ اس تحریک (شورش) کے علمبردار کوفہ، بصرہ اور مصر سے تعلق رکھتے تھے، ان تینوں مرکزوں کے حالات اتنے طویل ہیں کہ ان کی طوالت مطالعہ کرنے والوں کے لیے بھی ناقابل برداشت ہوگی، ہم صرف ایک مرکز یعنی ''کوفہ'' کو نمونہ بناتے ہیں، اہل حق اور انصاف پسند حضرات اسی نمونہ پر باقی مرکزوں کو قیاس فرمالیں۔

ہم کوفہ کو اس لیے بھی منتخب کرتے ہیں کہ فتنہ کا آغاز اسی کوفہ سے ہوا اور ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ جن کی شخصیت سب سے زیادہ قابل اعتراض ہے ان کا تعلق اسی کوفہ سے تھا۔

کوفہ کے فتنہ انگیز حالات

حالات کا پورا نقشہ پیش کرنے کے لیے ہمیں عہد فاروقی کی طرف لوٹنا پڑ رہا ہے۔

(۱)

ایران سے جنگ جاری ہے، یزدجرد (شاہ ایران) قادسیہ میں شکست کھانے کے بعد اپنے دارالسلطنت مدائن سے بھی فرار ہو چکا ہے، اپنے پایہ تخت کو واپس لینے کے لیے ''جلولاء'' کو محاذ جنگ بنایا تھا، وہاں بھی بری طرح شکست کھا چکا ہے مگر بار بار کی عبرت انگیز شکستوں کے بعد بھی ہمت نہیں ہاری، اب 'نہاوند'' کے علاقہ میں فوجیں جمع کر رہا ہے، تقریباً ڈیڑھ لاکھ فوج جمع کر چکا ہے۔

(۲)

ایران کے جو علاقے اسلامی مملکت میں داخل ہو چکے ہیں، ان کی حفاظت کے لیے دو فوجی شہر آباد کیے گئے ہیں بصرہ اور کوفہ۔

کوفہ کا گورنر وہ فولادی انسان ہے جس کا نام سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ہے جس کو فاتح عراق کہا جاتا ہے، جس نے تاریخ عراق کی سب سے بڑی جنگ ''قادسیہ'' میں دشمن کے پرخچے اُڑائے تھے، جس کی نظر صرف مادی طاقت پر نہیں تھی بلکہ مادی طاقت سے بالا روحانی

اور ملکوتی طاقت پر بھی اس کو اتنا اعتماد ہے کہ پایہ تخت کسریٰ یعنی مدائن پر حملہ کرنے چلا تو اتفاق سے دریا دجلہ بھی دشمن کی پناہ بننے لگا، اس میں شدید طغیانی آ گئی، ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجیں بہت دور تک پھیل گئیں، شدتِ طغیانی کے سبب سے پانی کالا ہو گیا۔ (البدایہ والنہایہ ص ۶۴ ج ۷)

دنیا کی تاریخ ہمیشہ اس فرشتہ صفت جرنیل کی شجاعت اور اس کے غیر معمولی اعتماد علی اللہ کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہے کہ جب اس کی نظر اس ہیبت انگیز غیر معمولی طغیانی پر پڑی تو خوف و ہراس کے بجائے قوت ایمانی نے اس کے اندر بے پناہ ولولہ فدائیت پیدا کر دیا۔

اس نے ایک آواز دی، کون ہے جو میرے ساتھ اپنا گھوڑا دریا میں ڈالتا ہے؟

راوی بیان کرتے ہیں کہ ساتھ ہی آپ نے یہ الفاظ بھی زبان سے ادا کیے۔

نستعین باللّٰہ ونتوکل علیه. حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل ولا حول ولاقوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم (البدایہ والنہایہ ص ۶۵ ج ۷)

''ہم اللہ سے مدد مانگتے ہیں اور اس پر بھروسہ کرتے ہیں، ہمارے لیے اللہ کافی ہے، وہ بہت ہی اچھا ذمہ دار ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد کے سوا ہمارے اندر نہ کوئی طاقت ہے نہ قوت''۔

پھر کیا تھا؟ بقول علامہ اقبال:

''بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے''

ایرانیوں نے دیکھا دریائے دجلہ کی موجوں کے سینہ پر سوار پوری فوج اس طرف بڑھ رہی ہے تو ''نان دیوانان'' کہتے ہوئے بھاگے۔ قسم بخدا انسان نیند جنات اند (البدایہ والنہایہ ص ۶۴ ج ۷)

(۳)

خاص انہیں ایام میں کہ یزدجرد اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو واپس لینے کے لیے آخری بازی لگا رہا ہے اور علاقہ نہاوند میں ایسی فوج جمع کر چکا ہے کہ **مالم یجتمع لھم قبل ذلک** (اتنی فوجیں اس سے پہلے کبھی جمع نہیں ہوئی تھیں) (البدایہ ص ۱۰۵ ج ۷)

اہل کوفہ کا ایک وفد ''جراح بن سنان اسدی'' کی قیادت میں خلیفہ دوم سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں پہنچ کر ایک یادداشت پیش کرتا ہے، یہ اس فولادی انسان قائد افواج

اسلامیہ سیّدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے متعلق شکایتوں کا ایک دفتر ہے، ایک شکایت یہ بھی ہے کہ نماز ٹھیک نہیں پڑھاتے۔

ملوکیت اور بادشاہت کو چھوڑ دیجیے، ہمارے جمہوری دور کے ارباب اقتدار بھی ایسے نازک وقت میں اس طرح کے احتجاج کو برداشت نہیں کریں گے اور فوجی قوانین کے لحاظ سے تو شاید ایسے احتجاج کرنے والے گردن زدنی قرار دیے جائیں، مگر یہ خلافت راشدہ کا دور ہے ہر ایک کو کسی بھی وقت حاکم اور افسر کے متعلق شکایت کرنے کا اختیار ہے، بایں ہمہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس اچانک شکایت نامہ سے چونکے۔ آپ نے فرمایا:

ان الدلیل علی ما عندکم من الشرنهوضکم فی هذا الحال وهو مستعد لقتال اعداء الله وقد جمعوا لکم

''اس وقت جبکہ (حضرت سعد) جنگ کی تیاری کر رہے ہیں اور دشمن کی فوجیں تمہارے مقابلہ پر جمع ہو رہی ہیں کوچ کر کے تمہارا یہاں آنا یہ خود تمہاری شرارت کی دلیل ہے۔'' (ص١٠٦)

پھر فرمایا باوجودیکہ تمہاری شرارت واضح ہے مگر شکایت پہنچ جانے کے بعد جو مجھے کرنا چاہیے تمہاری شرارت مجھے اس سے نہیں روک سکتی۔ **مع هذا لا یمنعنی ان انظر فی امرکم** (البدایہ ص١٠٦ ج٧)

چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو مدینہ طلب فرمالیا اور جب وہ پیش ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

شکوک فی کل شیٔ حتی الصلوٰۃ (بخاری شریف ص١٠٦)

''سب کاموں میں آپ کی شکایت کی ہے، یہاں تک کہ یہ بھی شکایت کی ہے کہ نماز ٹھیک نہیں پڑھاتے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا جواب سننے سے پہلے ان کے بارے میں سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ شہادت ضرور ذہن نشین کر لیجیے۔

ما سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یجمع ابویه لا حد الا لسعد

بن مالک فانه سمعته یقول یوم احد یا سعد ارم فداک ابی و امی

(بخاری شریف ص ۵۸۱)

''حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کے متعلق نہیں سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں اور باپ دونوں کا نام لے کر فرمایا ہو کہ تم پر مرے ماں باپ قربان، صرف حضرت سعد رضی اللہ عنہ (سعد بن مالک عرف سعد بن ابی وقاص کنیت ابو اسحاق) کی وہ ذات ہے کہ جب غزوہ اُحد میں دشمنوں کے جھرمٹ سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہو رہے تھے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ تیر اندازی کے جوہر دکھاتے ہوئے ان کو ہٹا رہے تھے (تو جس طرح) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس کے پاس ترکش دیکھتے اس کو فرمائش کرتے کہ ترکش حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس خالی کر دو، یعنی ترکش کے سارے تیر یہاں ڈال دو، ایسے ہی) حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے فرماتے تھے ارم فداک ابی و امی۔ مارو تم پر میرے ماں باپ قربان۔''

بہر حال دربار فاروقی میں شکایتوں کا جواب دیتے ہوئے جو حقیقت افروز اور رقت انگیز تقریر آپ نے فرمائی، اس کا ترجمہ یہ ہے:

میں سب سے پہلا عرب ہوں جس نے راہ خدا میں تیر چلایا۔ (ہمارے یہ غزوے آج کی طرح ساز و سامان کے ساتھ نہیں ہوتے تھے) ان غزوات کی حالت اس وقت بھی میری نگاہ میں پھر رہی ہے کیکر کی لکڑولیاں یا کیکر کے پتے ہماری خوراک ہوتے تھے، بکری کی مینگنوں کی طرح ہمارا فضلہ خشک ہوتا تھا، ہماری بانہوں میں زخم ہو گئے تھے، اسلام سے مشرف ہونے میں مَیں ساتواں آدمی ہوں، آج یہ لوگ میری اصلاح کر رہے ہیں، اتنی قدامت کے باوجود اگر میں نماز بھی صحیح نہیں پڑھ سکتا تو ''وائے بر حال من'' مجھ سے زیادہ محروم القسمت کون ہو سکتا ہے۔ (بخاری شریف ص ۹۵۶ و ص ۸۱۵ و شمائل ترمذی شریف ص ۲۷)

مودودی صاحب تو شاید اس تقریر سے اثر نہ لیں، کیونکہ آپ کا فیصلہ یہ ہے کہ آپ نے جو تیر چلایا تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا کے خلاف تھا۔ (ملاحظہ فرمایئے مودودی صاحب کی تفسیر متعلق آیت ویسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیه) لیکن وہ فاروقِ

اعظم کہ مودودی صاحب جیسے ہزاروں برخود غلط علامہ ان کے گردِ پا کو بھی نہیں پہنچتے۔ انہوں نے اس تقریر سے گہرا اثر لیا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا صدقت ذالک الظن بک یا ابا اسحٰق (بخاری ص ۱۰۶ و ص ۱۰۴) سچ فرمایا اے ابواسحاق (یہ کنیت ہے احتراماً نہیں لیا) آپ کے متعلق ہمارا یقین یہی ہے۔

حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی صداقت کا پورا یقین تھا، مگر پھر بھی آپ نے تحقیق ضروری سمجھی، آج کل کی اصطلاح میں یہ کہنا چاہیے کہ ایک تحقیقاتی کمیشن کوفہ بھیجا، ارکانِ کمیشن نے اہل کوفہ کے بیانات لیے، پھر ایک مسجد میں پہنچ کر نمازیوں سے تحقیق کی، مگر شکایت کسی نے بھی نہیں کی، ہر ایک نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تعریف کی۔ صرف قبیلہ بنی عبس کی ایک مسجد میں ایک شخص اسامہ بن قتادہ نے یہ بیان دیا۔

اماذا انشدتنا فان سعدا کان لا یسیر بالسریة ولا یقسم بالسویة ولا یعدل فی القضیة (بخاری شریف ص ۱۰۴)

جب آپ قسم ہی دیتے ہیں تو بات یہ ہے کہ سعد مجاہدین کے دستہ (فوجی کمپنی) کے ساتھ خود نہیں جاتے۔ (کسی کو امیر اور کمانڈر بنا کر بھیج دیا کرتے ہیں اور (مال غنیمت) مساوی طور پر تقسیم نہیں کرتے اور کوئی مقدمہ آتا ہے تو انصاف سے کام نہیں لیتے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ ان الزامات کے خلاف اپنی صفائی میں ہزاروں شہادتیں پیش کر سکتے تھے، مگر مردِ باخدا نے انسانوں کے بجائے اپنا معاملہ خدا کے حوالہ کیا اور دعا کی:

''اے اللہ! اگر یہ بندہ جھوٹ بول رہا ہے، اس نے نمائش اور شہرت کے لیے یہ بیان دیا ہے تو اس کی عمر دراز کر، اس کے فقر کو طویل کر اور اس کو فتنوں کا نشانہ بنا۔''

سیّدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی ایک ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ آپ مستجاب الدعاء تھے، دریائے دجلہ کے طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے پوری فوج کا پوری حفاظت سے پار ہو جانا حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی دعا کی برکت ہی مانی جاتی ہے۔

دوسری خصوصیت آپ کی وہ شفقت اور ہمدردی تھی جس سے یہ شخص بھی محروم نہیں ہے جس کے حق میں بددعا کر رہے تھے، چنانچہ آپ اس کی عاقبت کے متعلق بددعا نہیں کرتے۔

بددعا میں صرف ایسی باتیں ذکر کرتے ہیں جو دنیا ہی میں ختم ہونے والی ہیں۔

بہرحال بددعا اثر کیے بغیر نہیں رہی، عبدالملک بن عمر جنہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ واقعہ سنا تھا ان کا بیان ہے کہ اس شخص کو میں نے بھی دیکھا ہے اس کی عمر بہت ہوئی، بوڑھا کھوسٹ ہو گیا حالت یہ تھی کہ بھویں آنکھوں پر لٹک آئی تھیں، راستہ میں لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا جب اس حماقت پر اس کو تنبیہ کی جاتی تو جواب دیا کرتا تھا۔

شیخ مفتون اصابتنی دعوۃ سعد (بخاری شریف ص ۱۰۴)

''بوڑھا ہوں، فتنہ میں مبتلا، مجھے سعد کی بددعا لگ گئی''۔

آفتابِ نیم روز کی طرح حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی براءت واضح ہو جانے کے بعد بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو کوفہ نہیں بھیجا۔ بظاہر آپ کو گوارا نہ تھا کہ کوفہ کے یہ کم ظرف حضرت سعد رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کے منہ آئیں، البتہ آپ نے اپنی وفات کے وقت انتخاب خلیفہ کے لیے جو چھ ارکان نامزد کیے جن میں سے ہر ایک رکن اس کا اہل تھا کہ اس کو پوری مملکت کا سربراہ (خلیفہ) بنایا جائے، ان میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بھی شامل رکھا اور یہ بھی فرما دیا کہ میں نے ان کو کسی خیانت یا کمزوری کی بنا پر الگ نہیں کیا تھا، اب اگر ارکانِ شوریٰ ان کو خلیفہ منتخب کریں تو بلاشبہ وہ اس کے اہل ہیں اور اگر خلیفہ نہ بنائے جائیں تو جو خلیفہ ہو اس کو چاہیے کہ وہ ان کا تعاون حاصل کرتا رہے۔ (بخاری شریف ص ۵۴۲)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی معزولی کے بعد:

حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان کو پھر حضرت زیاد بن حنظلہ (رضی اللہ عنہم) کو یہ منصب سپرد ہوا، اہل کوفہ مطمئن نہیں ہوئے تو حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو یہ خدمت سپرد فرمائی لیکن اہل کوفہ نے ان کی بھی شکایت کر دی۔ **لا یحسن السیاسۃ** (سیاست نہیں جانتے)

حضرتِ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو معزول کر کے سیّدنا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو امیرِ کوفہ بنانا چاہا تو اہل کوفہ نے پہلے ہی کہہ دیا۔ **لا نریدہ** (ہم ان کو نہیں چاہتے) اب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پریشان تھے۔

کیف واھل الکوفۃ مائۃ الف لا یرضون من امیر ولا یرضی عنھم

امیر (البدایہ والنہایہ ص ۱۲۶ ج ۷ وص ۱۲۵)

''کیا کیا جائے یہ اہل کوفہ ایک لاکھ ہیں، نہ وہ کسی امیر سے راضی اور نہ کوئی امیر ان سے راضی ہوتا ہے''

آپ نے حضراتِ صحابہ کا اجتماع کیا، ان تمام حالات کو بیان کرنے کے بعد ایک اصول سامنے رکھا۔

هل یولی علیهم قویا شدیدا او ضعیفا مسلما

''کسی چاق و چوبند اور سخت قسم کے آدمی کو امیر بنایا جائے یا نرم مزاج کو جو ان کے مشوروں پر چلتا رہے''

سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ماموں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بھی مجمع میں موجود تھے، حضرت مغیرہ نے مشورہ دیا کہ **قوی شدیدٌ** کو امیر بنایئے، اس کی سختی سے ممکن ہے لوگ کچھ پریشان ہوں لیکن اگر وہ مضبوط ہے تو اس کی مضبوطی آپ کے لیے مفید ہوگی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس رائے کو پسند فرمایا ساتھ ہی یہ فرمایا کہ آپ ہی اس کے لیے مناسب ہیں، چنانچہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر بنا دیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے متعلق شکایت، ان کی معزولی اور جنگ نہاوند (جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کی قیادت میں کامیابی سے لڑی گئی) یہ سب ۱۹ھ کے واقعات ہیں یعنی خلافتِ فاروقی کے ساتویں سال کے، اس کے بعد صرف ڈھائی یا تین سال کے عرصہ میں گورنروں کی یہ تبدیلیاں ہوئیں۔

۲۳ھ کے ختم پر جب سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ہوئی تو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کوفہ کے امیر تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ طلب فرمایا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر بنا دیا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایما یہی تھا لیکن ابھی ایک سال ہی نہ گزرا تھا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ میں کچھ اختلاف ہو گیا، اس نے شدت اختیار کر لی، لوگ ہوا دینے لگے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی

اللہ عنہ کو واپس بلا لیا۔

اختلاف:

سیّدنا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وہاں قطب الارشاد کی حیثیت سے قیام فرما تھے، حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے آپ کو وہاں مامور فرمایا تھا، درسِ قرآن، علمی مذاکرات (درس حدیث) افتاء، قضا اور احتساب (عوام کے اخلاق کی نگرانی) آپ کے فرائض تھے، ان کے علاوہ بیت المال کے امین اور نگران بھی آپ ہی تھے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے آپ کے توسط سے بیت المال سے قرض لیا لیکن جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے واپسی کا مطالبہ کیا تو آپس میں بحث شروع ہوگئی۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ ہیں:

فلما تقاضاه به ابن مسعود ولم يتيسر قضاء ہ تقاولا وجرت بينهما خصومة شديدة فغضب عليهما عثمان فعزل سعدا

"جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے تقاضا کیا اور ان کو یہ میسر نہ ہوا کہ ادا کرسکیں، تو اس کی بحث چلی اور دونوں کے درمیان سخت خصومت ہوگئی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دونوں پر ناراض ہوئے پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا۔" (ص ۱۵۱ ج ۷)

جملہ معترضہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ناراضگی بسر و چشم لیکن ایک صاحب بصیرت جو حضراتِ صحابہ کی عظمت سے واقف ہے اس کے لیے یہ واقعہ ایک تاریخی معمہ ہے، یہ دونوں بزرگ جلیل القدر صحابی، صداقت، دیانت، ایثار، اخلاص اور جو صفات بھی جلیل القدر صحابہ کی ہوسکتی ہیں ان سب میں ممتاز درجہ کے مالک ہیں، پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ناواقف نہ ہوں گے کہ اداء قرض میں صاحب استطاعت کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔

مطل الغنى ظلم

''صاحب استطاعت کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے''۔

ملت کے فقیہ اعظم سیّدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ آیت بھی ضرور ہوگی وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ (اگر مقروض آدمی تنگی میں ہو تو بسہولت حاصل ہونے تک اس کو مہلت دی جائے) علاوہ ازیں واقعہ یہ ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھوکے ننگے نہیں بلکہ خوشحال اور صاحب دولت[2] تھے۔ خوش حالی کے ساتھ ساتھ فراخ حوصلہ بھی ایسے کہ تقریباً پندرہ سال پہلے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں) جب مکہ معظّمہ میں ایسے سخت بیمار ہو گئے کہ زندگی سے مایوسی ہونے لگی تو آپ نے ارادہ فرمایا کہ تمام جائیداد وقف کر دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تو دو ثلث، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی منظور نہ فرمایا تو نصف جائیداد کی وصیت کر دینے کی درخواست کی۔ یہ درخواست بھی منظور نہ ہوئی تو عرض کیا کہ ایک ثلث جائیداد کی وصیت کی اجازت دی جائے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہوا۔

الثلث و الثلث کثیر

''ہاں تہائی اور تہائی بھی بہت ہے۔'' (بخاری شریف ص ۱۷۳)

آپ کے اس واقعہ سے فقہ کا یہ ضابطہ مقرر ہو گیا کہ ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں ہے، اگر کوئی زیادہ کی وصیت کر بھی جائے تو وہ نافذ نہ ہوگی۔

بہرحال سیّدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسا باحوصلہ اور صاحب استطاعت اداء قرض میں لیت و لعل کرے یہ قطعاً خلافِ قیاس اور خلافِ درایت ہے۔

نوعیت قرض:

حضراتِ مؤرخین نے قرض کا ذکر کیا، مگر اس کی نوعیت نہیں بیان کی۔ حضراتِ صحابہ کی جو توثیق و تعدیل قرآن پاک نے فرمائی ہے اس کی بناء پر یقین یہ ہے کہ حضراتِ مؤرخین کی تعبیر میں کوتاہی ہوئی ہے۔

حضرتِ سعد رضی اللہ عنہ گورنر ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وزیر خزانہ، اس قرض کی نوعیت اس سطح پر تصور میں آنی چاہیے۔ حضرات مورخین نے عام قرض کی طرح اس

کا ذکر کر دیا ہے۔ مگر دونوں حضرات کی پوزیشن کو سامنے رکھا جائے تو یقیناً صورت یہ ہوگی کہ:

''یہ قرض حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بحیثیت گورنر یا امیر مملکت کسی قومی ضرورت کے لیے لیا تھا، پھر بحث یہ ہوئی کہ اس کی ادائیگی ضروری ہے یا بیت المال کے مدات صرف میں یہ ضرورت بھی داخل ہے تو یہ رقم وہاں صرف ہوئی جہاں صرف ہو سکتی ہے، لہٰذا اس کی ادائیگی ضروری نہیں ہے۔''

یہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا جس میں امیر (گورنر) اور امین بیت المال (وزیر خزانہ) کا اختلاف ہوا، ہر ایک اپنی رائے پر مضبوطی سے قائم رہا، ایسی صورت اگر پیش آ جائے تو لامحالہ کسی ایک کو مستعفی ہونا پڑتا ہے، ہماری اس توجیہ کی بین دلیل یہ ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس منصب سے الگ ہو گئے تو یہ قصہ بھی ختم ہو گیا، ذاتی قرض تھا تو اس کی ادائیگی لامحالہ ضروری تھی، حضرت سعد رضی اللہ عنہ خود ادا نہ کرتے تو بذریعہ قضاء ان سے وصول کیا جا سکتا تھا، بہر حال فیصلہ درایت یہی ہے کہ یہ قرض ذاتی نہیں تھا اور یہ اختلاف اجتہادی تھا۔

حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ گورنر کوفہ:

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کوفہ سے واپس آئے تو سیّدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو یہاں کا گورنر بنا دیا۔

مختصر تعارف:

مودودی صاحب نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کی مذمت میں زور قلم صرف کیا ہے اور ان کی خدمات پر پردہ ڈالا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر آپ کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔

حضرت ولید رضی اللہ عنہ اگرچہ فتح مکہ سے پہلے ایمان سے مشرف نہیں ہوئے، فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے، مگر یہ ان سعادتمندوں میں سے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی سے ان کو خدمات اسلام کے لیے خاص طور پر منتخب فرما لیا تھا، چند ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۹ھ میں آپ کو قبیلہ بنی مصطلق کے صدقات وصول کرنے کے لیے عامل بنا کر بھیج دیا۔

اس قبیلہ سے حضرت ولید رضی اللہ عنہ کے خاندان کی پرانی عداوت چلی آ رہی تھی، اس تقرر کے وقت تو حضرت ولید نے کوئی معذرت نہیں کی اور روانہ ہو گئے، مگر دل میں خطرہ ضرور تھا کہ شاید مجھے تنہا پا کر یہ لوگ اپنی عداوت نکالیں۔

اہل قبیلہ منتظر تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی صاحب آئیں گے۔ انہوں نے از خود صدقات وغیرہ جمع کر لیے تھے کہ آنے والے عامل کو زحمت نہ ہو خود ہی پیش کر دیں، اب ان کو علم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ آنے والے ہیں تو کچھ لوگ جمع ہوئے کہ آگے چل کر ان کا استقبال کریں۔ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ قبیلہ تک پہنچنے بھی نہیں پائے تھے کہ بقول راوی کسی شیطان نے ان سے کہہ دیا کہ وہ لوگ آپ کے قتل کی تیاری کر رہے ہیں۔

ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو جو شبہ تھا اب اس نے یقین کا درجہ حاصل کر لیا اور یہ اس خبر کے سنتے ہی واپس ہو گئے، تحقیق کرنے کا موقع بھی نہیں تھا اور انہوں نے تحقیق کی کوشش بھی نہیں کی اور واپس پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی عرض کر دیا کہ وہ لوگ تو قتل کرنے کی تیاری کر رہے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو افسوس ہوا اور آپ نے اس قبیلہ کے لیے تادیبی کارروائی کا ارادہ کر لیا۔

ادھر اہل قبیلہ کو احساس ہوا کہ حضرت ولید رضی اللہ عنہ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، اس لیے وہ واپس ہو گئے تو انہوں نے چند نمائندے بارگاہ رسالت میں بھیجے کہ اس غلط فہمی کو دور کریں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تادیبی کارروائی کے لیے کوئی فوجی دستہ بھیجنے والے تھے کہ اہل قبیلہ کے نمائندے پہنچ گئے اور صورت حال عرض کر دی۔ معاملہ[۳] صاف ہو گیا۔ (طبرانی، بغوی، بحوالہ تفسیر مظہری تفسیر سورہ حجرات)

یہ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کی غلطی تھی، معاذ اللہ شرارت نہیں تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو غلطی ہی قرار دیا، چنانچہ ان کو خدمات حکومت سے محروم نہیں کیا، البتہ ان کو دوسری جگہ مامور فرما دیا۔

۱۱ھ کے شروع میں (ربیع الاوّل میں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، سیّدنا

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے، ارتداد کی ایک ہوا چلی، مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا، اہل مکہ نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا لیکن سیدنا ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ اس دور پر فتن میں ثابت قدم رہے اور جب اندرونی قضیوں سے فارغ ہو کر سیّدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت عراق کی طرف مجاہدین کو روانہ کیا تو حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ اس قومی مہم میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ چنانچہ جنگ فدیار میں فتح یابی کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فتح کی بشارت، مال غنیمت کا خمس اور موجودہ یا پیش آنے والے حالات کے متعلق رپورٹ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیّدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ہی بھیجی (طبری ص ۷ ج ۴)

سیّدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اگلے سال ۱۳ھ میں شام کی طرف جہاد کا ارادہ کیا عام دعوت بھی دی اور خاص طور پر ان کو دعوت دی جو مختلف علاقوں میں تحصیل وصول وغیرہ پر مامور تھے، جو عامل کہلاتے تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کو خاص طور پر فرمان بھیجا کہ شام کی مہم میں جو صاحب جانا چاہیں وہ تشریف لے جائیں، ان کا موجودہ منصب محفوظ رہے گا، جہاد کے بعد وہ اُسی پر واپس ہو جائیں گے۔

حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ اس وقت بنی قضاعہ کے صدقات وصول کرنے پر مامور تھے آپ کو بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا فرمان موصول ہوا تو جواب میں حضرت ولید رضی اللہ عنہ خود حاضر تھے۔ (طبری ص ۲۹)

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت اس محاذ پر معرکے شروع ہوئے، اس محاذ کا سب سے بڑا معرکہ ''معرکہ یرموک'' تھا، حضرت ولید رضی اللہ عنہ ان معرکوں میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے (طبری ص ۳۰) معرکہ یرموک کے بعد انتظامی اور دفاعی حلقے بنائے گئے، ہر ایک حلقہ ایک امیر کے حوالہ کیا گیا، اردن کے امیر حضرت ولید رضی اللہ عنہ بنائے گئے۔

۱۷ھ میں قیصر روم نے حمص کی طرف اقدام کیا، اس کا دفاع کیا گیا، دفاع کے بعد اس علاقہ میں کچھ اور فوجی مہمیں روانہ کی گئیں، عرب الجزیرہ کو جو مہم روانہ کی گئی اس کی قیادت

حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کی گئی، اس مہم کے بعد حضرت ولید رضی اللہ عنہ اسی علاقہ میں مامور کردیے گئے۔ (طبری ص ۱۲۶ ج ۴)

سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد سب علاقوں میں بغاوت پھیل گئی، فارس کے بڑے بڑے علاقوں آذربائیجان، آرمینیہ وغیرہ نے اپنے استقلال کا اعلان کردیا۔ فوجی نظام کے لحاظ سے ان علاقوں کا تعلق کوفہ کی چھاؤنی سے تھا۔ یہاں چالیس ہزار فوج رہا کرتی تھی۔

حضرت ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے اثرات سے کام لے کر چھاؤنی کا نظام سنبھالا، پھر ان باغی علاقوں پر حملہ کیا اور ایک ایک کر کے تمام باغی علاقوں کو مطیع اور فرمانبردار بنالیا۔ (طبری ص ۴۵)

پھر اس چھاؤنی کو اتنا مضبوط کردیا کہ شام کے علاقہ میں رومی فوجوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر دفعتاً چڑھائی کردی، انہوں نے خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے امداد کی درخواست کی تو سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ولید رضی اللہ عنہ کو فرمان بھیج کر اس چھاؤنی سے دس ہزار فوج شام کی امداد کے لیے روانہ کرادی۔ (طبری ص ۴۶)

یہ تھیں اس وقت تک کی خدمات، اب ۲۶ھ میں حضرت ولید رضی اللہ عنہ کوفہ کے گورنر ہوئے تو بقول ابن جریر طبری۔

كان احب الناس فی الناس وارفقهم به وليس علىٰ داره باب

''سب سے زیادہ ہردلعزیز، بہت مہربان، ان کی حویلی پر پھاٹک بھی نہیں تھا۔'' (تاریخ طبری ص ۴۸)

نہ صرف ابن جریر طبری بلکہ ابن اثیر وغیرہ سب مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ پانچ سال تک یہی شان رہی کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کوفہ کے سب سے زیادہ ہردلعزیز اور محبوب گورنر تھے، اہلِ کوفہ ان سے خوش تھے اور ان کو اہلِ کوفہ پر یہ اعتماد تھا کہ ان کے فرودگاہ کا پھاٹک بھی نہیں تھا۔

کوفہ میں کچھ شورہ پشتوں کی شرارت:

پھر ایک شخصی واقعہ پیش آیا کہ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص تھا (ابن حسیمان) رات کو چند نوجوانوں نے اس کے گھر میں گھس کر اس کو قتل کر دیا، ابن حسیمان نے شور مچایا مگر اس کی مدد کو کوئی نہیں پہنچ سکا، حضرت ابوشریح رضی اللہ عنہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی) اپنے صاحبزادہ کے ساتھ قریب ہی مکان میں قیام فرماتے، انہوں نے کچھ شور سنا تو چھت پر چڑھے، ان شرارت پسندوں کو ڈانٹا، مگر یہ اپنا کام کر چکے تھے۔

مقدمہ قتل پیش ہوا تو حضرت ابوشریح اور ان کے صاحبزادے نے شہادت دی، قصاص کا حکم ہوا، پھر حسب قاعدہ مقدمہ کی مسل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں پیش کی گئی۔ خلیفہ کی جانب سے فیصلہ کی تصدیق ہوئی ملزموں کو قصر امارت کے سامنے چوک میں قتل کرایا گیا۔

ولید سے مخالفت کا آغاز:

حضرت ابوشریح رضی اللہ عنہ اور ان کے صاحبزادے تو چند روز کے لیے گئے تھے۔ وہ مدینہ واپس چلے آئے لیکن جو قاتل قصاص میں قتل کیے گئے تھے ان کے وارثوں کے دلوں میں ولید کی طرف سے کینہ بیٹھ گیا۔ (طبری ص ۵۹، ۶۰ ج ۵، وابن خلدون وغیرہ)

نکتہ چینی اور ہر ایک ممکن صورت سے ان کو پریشان کرنا اور زک دینا ان کا مشغلہ بن گیا۔

شراب نوشی کا الزام:

قبیلہ بنی تغلب ایک مشہور قبیلہ تھا جس نے اپنا سابق مذہب عیسائیت نہیں چھوڑا تھا اس کے باوجود حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے یہ رعایت حاصل کر لی تھی کہ ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔ جزیہ کے بجائے مسلمانوں پر جو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس کی دوگنی رقم وہ دیا کریں گے۔

حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ جب عرب الجزیرہ کے عامل تھے تو اسی قبیلہ میں آپ کا قیام تھا۔ وہاں ایک عیسائی جس کا نام ابوزبید تھا وہ مسلمان ہو گیا قبیلہ بنی تغلب سے اس کا ننہالی رشتہ تھا اس تعلق کی بنا پر اس نے قبیلہ کے آدمیوں سے قرض بھی لے رکھا تھا۔

جب ابوزبید مسلمان ہو گیا تو اس کے عیسائی قرض خواہوں نے شدت سے مطالبہ شروع

کر دیا وہ بہت پریشان تھا تو حضرت ولید رضی اللہ عنہ نے اس کی یہ مدد فرمائی کہ اس کا تمام قرضہ اپنے ذمہ لے لیا۔ (طبری ص ۶۰)

اب قدرتی بات ہے کہ ابوزبید آپ کا غلام ہو گیا، ہر وقت آپ کے ساتھ رہنے لگا۔ حضرت ولید رضی اللہ عنہ جب کوفہ کے گورنر ہوئے تو گویا اس کی قسمت کا تارا چمک گیا اور حضرت ولید رضی اللہ عنہ کے پاس کوفہ آ گیا، خلا ملاء پہلے سے تھا، وہی انداز یہاں بھی رہا مگر شاعر تھا، شاعرانہ مزاج رکھتا تھا، اسی کمزوری سے کینہ پروروں نے جن کے بیٹے قصاص میں قتل کیے گئے تھے فائدہ اُٹھایا۔

بظاہر ایک طے کردہ تجویز کے بموجب وہ ایک روز حضرت ولید رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے ولید کا دروازہ ہر ایک آنے والے کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا یہ دفعتاً وہاں پہنچ گئے تو حضرت ولید رضی اللہ عنہ نے اپنے آگے سے ایک طشت ہٹا کر چوکی کے نیچے کر دیا، اس پر ان کو موقع مل گیا اور باہر آ کر کہنا شروع کر دیا کہ ولید اور ابوزبید شراب پی رہے ہیں، اب ایک مجمع وہاں پہنچ گیا، حضرت ولید رضی اللہ عنہ مجمع کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ سبب دریافت کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ ان پر یہ الزام لگایا گیا ہے حضرت ولید نے چوکی کے نیچے سے طشت نکال کر دکھا دیا کہ اس میں انگور کے خوشے تھے خوشے ختم ہو گئے ہیں بکھرے ہوئے دانے رہ گئے ہیں۔ یہ صاحبان آئے تو اس خیال سے کہ ان بکھرے ہوئے دانوں پر میں ان کی خاطر نہیں کر سکتا میں نے اس طشت کو چوکی کے نیچے کر دیا تھا۔ جو لوگ شراب نوشی کی خبر سن کر آئے تھے جب ان کو حقیقت کا علم ہوا تو ان خبر دینے والوں کو ملامت کی۔ (طبری ص ۶۰ ج ۵)

حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ ان کو تنبیہ کر سکتے تھے، ان کی شکایت دربار خلافت تک پہنچاتے تو وہاں سے ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی ہو سکتی تھی، مگر حضرت ولید رضی اللہ عنہ کی وسعت ظرفی نے اس معاملہ کو دبا دیا، کوئی شکایت اُوپر نہیں پہنچائی، مگر یہ حاسد و معاند ایسے حیادار کب تھے کہ خاموش رہ جاتے، ان میں کا ایک شخص جندب جس کا بیٹا زہیر قصاص میں قتل کیا گیا تھا، کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر قاضی اور مفتی شہر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گیا اور ان کے کان بھرے کہ ولید شراب پیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی

اللہ عنہ نے ان کو ٹال دیا کہ جب تک ہمارے سامنے مقدمہ نہیں آتا تو یہ ہمارا کام نہیں ہے کہ لوگوں کے اندرونی حالات ٹٹولیں۔ (طبری ص ۶۱ ج ۵)

ان لوگوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے صرف چغلی کی تھی تا کہ بدظن کر دیں۔ دعویٰ دائر نہیں کیا تھا اس لیے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ثبوت بھی طلب نہیں کیا اور معاملہ کو ٹال دیا لیکن حضرت ولید رضی اللہ عنہ کو اپنی صفائی اور برأت پر اتنا یقین تھا کہ ان کو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے شکایت پیدا ہوگئی کہ انہوں نے الزام کی تحقیق کیوں نہیں کی اور میرے متعلق ایسا شرمناک الزام سننے کے بعد معاملہ کو ٹال کیوں دیا۔ (طبری ص ۶۰-۶۱ ج ۵)

اس زمانہ میں ایک واقعہ ایک شعبدہ باز کا ہوا، حضرت ولید رضی اللہ عنہ کے یہاں کوئی شخص آیا وہ شعبدے دکھاتا تھا، ایسے لوگ شاہ ایران یا امراء ایران کے پاس جاتے تھے تو وہاں انعام پاتے تھے اسی توقع پر وہ ''امیر کوفہ'' کے پاس بھی آیا اور کوئی شعبدہ دکھایا، ان شرارت پسندوں کو ایک اور موقع ہاتھ لگ گیا اور جادو کے متعلق سوالات شروع کر دیے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے یہاں شکایتی درخواست گزار دی کہ اس جادوگر کو سزا ملنی چاہیے۔ اس شعبدہ باز کو بلایا گیا، اس نے اقرار کیا اور ایک شعبدہ کر کے بھی دکھایا تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے ہوئی کہ اس کو قتل کر دینا چاہیے۔ مگر پھر گورنر (حضرت ولید) سے گفتگو ہوئی تو دونوں کا فیصلہ یہ ہوا کہ اس کو قید میں ڈال دیا جائے لیکن یہ شعبدہ باز بھی مضبوط آدمی تھا، اس نے دربارِ خلافت میں اپیل پہنچادی، وہاں سے جواب آیا کہ قید میں ڈال دینا بھی صحیح نہیں ہے۔ اس سے حلفیہ بیان لیا جائے اور فہمائش کر کے چھوڑ دیا جائے۔ (طبری ص ۶۱ ج ۵)

بہرحال اس موقع پر بھی ان شرارت پسندوں کو منہ کی کھانی پڑی مگر اپنی حرکتوں سے پھر بھی باز نہ آئے۔

بالآخر کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ پہنچ گئے اور امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے احتجاج کیا کہ ولید رضی اللہ عنہ کو کوفہ سے معزول کر دیں، یہ درخواست خلیفہ سوم نے منظور نہیں کی تو واپس آ کر حضرت ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت خلیفہ سوم دونوں کے خلاف افواہیں پھیلانی شروع کر دیں۔ (طبری ص ۶۱)

پھر ایک روز حضرت ولید رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے، حضرت ولید رضی اللہ عنہ سو رہے تھے، ان کی اُنگلی میں سے انگوٹھی نکال لی اور اس کو بھی مدینہ بھیج دیا تاکہ شراب نوشی اور بدمستی کے ثبوت میں پیش کی جا سکے۔ (طبری ص ۶۱، ۶۲ ج ۵)

بالآخر اس جدوجہد میں کامیاب ہو گئے، ایک ثقہ صورت نے گواہی دے دی کہ میں نے ولید رضی اللہ عنہ کو شراب پیتے ہوئے دیکھا ہے، دوسرے نے گواہی دی کہ میں نے دیکھا کہ ولید رضی اللہ عنہ نے شراب کی قے کی جس سے ڈاڑھی بھی تر ہو گئی۔

شاہدوں کے ناموں کے بارے میں مؤرخین کا سخت اختلاف ہے، طبری نے اور نام بیان کیے ہیں اور مسلم وغیرہ میں اور نام ہیں۔

بہر حال شہادتوں کے گزر جانے کے بعد حد جاری کر دینے کا فیصلہ لازم تھا، چنانچہ حد جاری کی گئی اور حضرت ولید رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا گیا۔

ماننا پڑتا ہے کہ ان شورہ پشت لوگوں کو پروپیگنڈے کی وہ مہارت حاصل تھی کہ شاید موجودہ ترقی یافتہ دور بھی اس کی مثال پیش نہ کر سکے۔ کوفہ میں جو حرکتیں کیں ان کا نتیجہ ندامت رہا۔ مگر پھر بھی پروپیگنڈے کا یہ عالم تھا کہ نہ صرف کوفہ بلکہ مدینہ کی فضا بھی ان کے پروپیگنڈے سے گونج اُٹھی اور یہ عام سوال پیدا کر دیا گیا کہ آخر ولید کو سزا کیوں نہیں دی جاتی۔

بخاری شریف کی ایک روایت کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے اس ہمہ گیر پروپیگنڈے کا اندازہ ہو گا۔

عبید اللہ بن عدی بیان فرماتے ہیں کہ حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن الاسود بن عبد یغوث نے مجھ سے فرمایا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تمہارے ماموں ہیں، تمہیں کیا رکاوٹ ہے، تم ان سے ان کے بھائی ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں بات کیوں نہیں کرتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو ان کے معاملہ میں ڈھیل دے رہے ہیں اس سے لوگوں میں بہت چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں اور بہت کچھ کہا جا رہا ہے۔

عبید اللہ بیان فرماتے ہیں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے یہاں ایسے وقت پہنچا کہ وہ نماز کے لیے جانے والے تھے میں راستہ میں کھڑا ہو گیا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

تشریف لائے تو میں نے عرض کیا مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے اور وہ آپ کی خیر خواہی ہی کی بات ہے۔

حضرت عثمان: **ایھا المرء اعوذ باللہ منک** (اجی حضرت! آپ سے خدا کی پناہ)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دیا میں لوٹ آیا، نماز سے فارغ ہو کر حضرت مسور رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھ گیا، میں نے ان کو بتایا کہ یہ میں نے کہا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دیا، ان دونوں بزرگوں نے فرمایا اب آپ اپنا فرض پورا کر چکے۔

حضرت عبید اللہ فرماتے ہیں میں انہیں کے پاس بیٹھا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا آدمی آیا۔ (کہ آپ کو بلا رہے ہیں) ان دونوں نے کہا اب تمہاری خیر نہیں۔ (تمہیں اللہ تعالیٰ نے آزمائش میں ڈال دیا) بہر حال میں چلا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ خیر خواہی کی بات کیا ہے؟ جو آپ ابھی (نماز سے پہلے) فرما رہے تھے۔ میں نے قاعدہ سے گفتگو شروع کی پہلے خطبہ شہادت پڑھا، پھر میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، ان پر کتاب نازل کی، آپ ان میں سے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہا، اس پر ایمان لائے پھر ہجرت مدینہ سے پہلے دو مرتبہ ہجرت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہے، آپ کے طور وطریق کو آپ دیکھتے رہے۔

''ولید بن عقبہ کے بارے میں لوگ بہت کچھ کہہ رہے ہیں، آپ کا فرض ہے کہ آپ ان پر حد جاری کریں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پہلے تو یہ فرمایا ہمشیر زادے کیا آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ کیا آپ کا زمانہ پایا ہے؟ میں نے عرض کیا نہ میں نے دیکھا نہ آپ کا زمانہ پایا۔ البتہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وہ تعلیمات جو پردہ نشین کنواری لڑکیوں کے پردہ کے اندر تک پہنچ چکی ہیں وہ مجھے بھی پہنچیں۔

اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ جواب دیا۔ اوّل خطبہ شہادت پڑھا،

پھر فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حق وصداقت کی دعوت دینے کے لیے مبعوث فرمایا، آپ پر کتاب نازل فرمائی اور میں ان میں سے تھا جنہوں نے آپ کی دعوت قبول کی، اسلام سے مشرف ہوا، آپ کی تعلیمات پر ایمان لایا، پھر جیسا تم نے کہا دو دفعہ ہجرت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت کے شرف سے مشرف ہوا، آپ سے بیعت کی اور خدا جانتا ہے میں نے کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہیں کی، کبھی کوئی خیانت نہیں کی۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو خلیفہ بنایا۔ خدا جانتا ہے میں نے کبھی ان کی نافرمانی یا ان کے حق میں کوئی خیانت نہیں کی۔ پھر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) خلیفہ بنائے گئے۔ ان کے ساتھ بھی میرا یہی سلوک رہا کہ نہ کبھی ان کے فرمان سے سرتابی کی اور نہ ان کے معاملہ میں کوئی خیانت کی۔

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہنے اور ہر مشورہ میں شریک رہنے کے باعث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ردیف عمر رضی اللہ عنہ کہا جاتا تھا۔ طبری ص ۸۳ ج ۴)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد مجھے خلیفہ بنایا گیا۔ اب تم ہی بتاؤ جس طرح حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کا حق میرے اُوپر تھا کیا آپ لوگوں پر نہیں ہے؟ میں نے کہا ضرور ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا پھر یہ کیا باتیں ہیں جو مجھ تک پہنچ رہی ہیں، باقی جہاں تک ولید رضی اللہ عنہ کا معاملہ ہے تو عنقریب اس پر حد جاری کی جائے گی۔ (بخاری شریف ص ۵۴۶، ۵۳۲)

غور فرمائیے یہ ماموں بھانجے کی گفتگو ہے، ماموں صاحب بھانجے سے پناہ مانگ رہے ہیں اور بھانجے صاحب ماموں صاحب کو ایمانیات کی تلقین کر رہے ہیں۔ گویا تجدید ایمان کرا رہے ہیں۔ اس سے اقارب پروری کے پروپیگنڈے کی حقیقت بھی سامنے آرہی ہے اور یہ بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ پروپیگنڈہ کرنے والے کس درجہ ماہر فن تھے۔ انہوں نے کہاں کہاں تک اثرات پھیلائے اور کتنے سادہ اور بھولے مسلمانوں کو امتحان اور آزمائش میں ڈال دیا۔

حالاتِ کوفہ کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کا قصہ یہاں ختم ہو رہا ہے۔ یہ تمام قصہ ابن اثیر، ابن خلدون وغیرہ نے (بقول مودودی صاحب مستند ترین

مؤرخین نے) بیان کیا ہے ہم نے صرف تاریخ الامم والملوک، تاریخ طبری (مطبوعہ بیروت من مکتبہ البیان) کے صفحات کے نمبر درج کیے ہیں۔ ان واقعات میں ہم نے نہ کمی بیشی کی، نہ کسی طرح کی حاشیہ آرائی کی ہے۔ صرف یہ کیا ہے کہ عربی زبان کے بجائے اُردو زبان میں ان کو نقل کر دیا ہے۔ اب مطالعہ کرنے والے حضرات خود غور فرمائیں کہ حقیقت کیا ہے؟

(۱) آپ نے ملاحظہ فرمایا کچھ آوارہ گرد ایک شخص کو قتل کر دیتے ہیں۔ قاتلوں سے قصاص لیا جاتا ہے تو ان کے باپ ولید رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ وہ ملازمت پیشہ بھی مل جاتے ہیں جن کو ولید رضی اللہ عنہ نے معزول کر دیا تھا۔ (طبری ص ۶۲ ج ۵) پھر وہ کوفہ سے مدینہ منورہ تک پروپیگنڈہ کا طوفان برپا کر دیتے ہیں۔

(۲) آپ نے یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ ولید رضی اللہ عنہ جب عرب الجزیرہ کے عامل ہیں (کمشنر) تو نومسلموں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی غیر معمولی امداد بھی کرتے ہیں اسی امداد نے ابوزبید کو ان کا اتنا مرہونِ منت کیا ہے کہ وہ آپ کا ہو رہا ہے۔

(۳) آپ نے یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ شروع ہی سے خدمات انجام دیتے رہے، عامل رہے، مجاہد رہے، مجاہدوں کے افسر رہے، بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کیں، اُردن کے گورنر رہے، پھر فاتح فارس بنے، باغیوں کی سرکوبی کی، ان کا تازہ کارنامہ یہ تھا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی وفات پر ایران کے جو علاقے باغی ہو گئے تھے ان کو دوبارہ مطیع بنایا، آذربائیجان اور آرمینیہ کو دوبارہ فتح کیا۔

(۴) طبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ کوفہ کی چھاؤنی میں چالیس ہزار فوج رہتی تھی جس میں تیس ہزار ریزرو رہتی تھی اور ہر سال نمبروار دس ہزار فوج سرحدوں پر جہاد کرتی رہتی تھی، اس کے دو حصے ہوتے تھے، چھ ہزار مجاہدین آذربائیجان کے محاذ پر اور چار ہزار ''رے'' کے محاذ پر۔ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ بڑے حصہ کے کمانڈر رہتے تھے جس سے انہوں نے آذربائیجان اور آرمینیہ کو دوبارہ فتح کیا تھا۔ (ص ۴۵ ج ۵)

ان تمام تصریحات وتنقیحات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی معزولی کے بعد ولید رضی اللہ عنہ کو عرب الجزیرہ سے منتقل نہیں کیا گیا، بلکہ یہ پہلے سے کوفہ میں

فوج کی قیادت کررہے تھے، اب فوج کی قیادت کے بجائے صوبہ کی گورنری ان کو دے دی گئی۔

اب حضرت محقق مدقق علامہ مودودی صاحب کی دیانتداری ملاحظہ فرمایئے۔ آپ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخر زمانہ میں وہ الجزیرہ کے عرب علاقے پر جہاں بنی تغلب رہتے تھے عامل مقرر کیے گئے، ۲۵ھ میں اس چھوٹے سے منصب سے اُٹھا کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی جگہ کوفہ جیسے بڑے اور اہم صوبہ کا گورنر بنادیا، وہاں سے راز فاش ہوا کہ یہ شراب نوشی کے عادی ہیں۔ (خلافت وملوکیت ص۱۱۲)

مودودی صاحب نے توجہ نہیں فرمائی۔ اس طرح کی غلطی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی کی تھی جب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو قادسیہ جیسے سخت ترین محاذ پر افواجِ اسلام کا قائداعظم اور آج کل کے محاورہ میں فیلڈ مارشل بنایا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو بنوہوازن کے صدقات وصول کرنے پر مقرر کررکھا تھا۔ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کی طرح ان کا منصب بھی چھوٹا سا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو اس چھوٹے سے منصب سے اُٹھا کر قادسیہ میں افواج اسلام کا سالار اعظم بنادیا تھا۔ (ملاحظہ فرمایئے تاریخ طبری ص۴۸۴ ج۴)

اگر مودودی صاحب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں منصفانہ رائے قائم کرنا چاہتے تو تاریخ کی اوراق گردانی کرتے اور تمام پہلوؤں پر نظر ڈالتے مگر ان کا منشا تو حضرات صحابہ کی حیثیت کو مجروح کرنا ہے، لہٰذا جہاں سے جو چیز مل جاتی ہے لکھ مارتے ہیں، نہ اس میں اعتدال ہوتا ہے نہ توازن۔

(۵) یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہنی ضروری ہے کہ طبری کے بیان کے بموجب یہ واقعہ ۳۰ھ کا ہے پانچ سال پہلے ۲۵ھ میں عبداللہ بن سباء نمائشی اسلام اختیار کرچکا ہے، پھر مدینہ سے نکل کر بصرہ میں، پھر وہاں سے نکل کر کوفہ میں اپنی پارٹیاں بناچکا ہے، تفصیل آگے آئے گی انشاء اللہ۔ مؤرخین نے نام نہیں لیا۔ مگر ظاہر ہے حضرت ولید رضی اللہ عنہ کے خلاف پروپیگنڈے میں اس کا بہت بڑا دخل ہے۔

(۶) حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کیا حقائق پر پردہ ڈالنے کی اس سے بدترین مثال

ہوسکتی ہے، یہ تاریخی تحقیق ہے یا جذبہ بغض صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی تسکین۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نااہل کو عہدہ سپرد کیا ہے یا ان کا قصور یہ ہے کہ ترقی پذیر حوصلہ مند کا راستہ نہ روکا۔

(۷) مودودی صاحب جہاں چاہتے ہیں جملہ مؤرخین کا لفظ تحریر فرما کر مرعوب فرماتے ہیں لیکن یہاں ان کی دیانتداری نے اجازت نہیں دی کہ وہ جملہ مؤرخین کے اس بیان کو بھی تحریر فرما دیتے کہ ولید رضی اللہ عنہ کوفہ کے گورنر بنے تو وہی کوفہ والے جنہوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے خلاف طوفان کھڑا کیا تھا، ولید رضی اللہ عنہ کے ایسے گرویدہ تھے کہ ولید رضی اللہ عنہ کو اتنے تحفظ کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ پھاٹک پر کوئی دربان ہی مقرر کر دیں اور جب ان کو معزول کیا گیا تو کوفہ کی باندیاں تک غمگین تھیں، لڑکیاں ماتمی لباس پہن کر اشعار پڑھتی پھرتی تھیں۔ (طبری ص ۶۲ ج ۵)

مودودی صاحب ان حقائق سے انکار نہیں کر سکتے، بار بار اعتراف کرتے ہیں کہ اپنے خاندان کے جن لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکومت کے یہ مناصب دیے انہوں نے اعلیٰ درجہ کی انتظامی اور جنگی قابلیتوں کا ثبوت دیا (ص ۱۰۸ و ۱۰۹ وغیرہ) لیکن بغض صحابہ کا مرض ان کو اجازت نہیں دیتا کہ واقعات کو صحیح نوعیت میں سامنے رکھ کر فیصلہ کر سکیں۔ اب تحقیق وتنقید کا ایک موضوع یہ ہے کہ حضرت ولید رضی اللہ عنہ کے خلاف جو شہادتیں پیش کی گئیں ان کی حیثیت کیا تھی، شہادت دینے والے کون تھے اور شراب نوشی کے سلسلہ میں جو روایتیں وارد ہیں وہ صحیح ہیں یا ازروئے درایت موضوعات قرار پاتی ہیں، حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کی صفائی پیش کرنے کے لیے ان تمام سوالات کا حل کرنا ضروری ہے، مگر ہماری بحث کا موضوع حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نہیں ہیں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں۔

مذکورہ بالا واقعات نے واضح کر دیا کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ خواہ کیسے بھی ہوں ان کا نام لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مطعون کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے، نہ حضرت ولید رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کوئی اعتراض کیا جا سکتا ہے۔

غور فرمایئے نظام حکومت میں ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے داخل نہیں کیا بلکہ جیسے

ہی یہ مسلمان ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ذمہ داری سپرد فرما دی تھی، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو نہیں بڑھایا، بلکہ خود آگے بڑھے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دست راست رہے، غزوات میں شرکت کی اور قابل صد ستائش امر ہے کہ باغی علاقوں کو مطیع بنایا۔

پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو کوفہ کا گورنر بنایا تو حضرت ولید رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ اس درجہ ہر دلعزیز ہو گئے کہ ان سے پہلے اس کی مثال نہیں تھی، پھر جیسے ہی شراب نوشی کے مقدمہ میں ان کے خلاف فیصلہ ہوا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کر دیا۔

ہر ایک انصاف پسند کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کون سا فعل قابل اعتراض ہے اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے رشتہ داروں کی رعایت کرتے تھے تو رعایت کا وقت اب آیا تھا کہ حضرت ولید رضی اللہ عنہ کو کوئی اور منصب عطا کر دیتے مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوئی منصب نہیں دیا اور یہ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کی شرافت و غیرت و سلامتیٔ طبع تھی کہ آپ اس الزام کے بعد سیاست ہی سے الگ ہو گئے، حتیٰ کہ جب حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما میں مقابلہ ہوا تو حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ جو اموی رشتہ کی بناء پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو سکتے تھے ابن سعد کی شہادت یہ ہے کہ وہ کسی کے بھی ساتھ نہیں ہوئے۔ (طبقات ابن سعد ص ۱۵ ج ۶)

بوالعجبی:

یہ تمام قضیہ جس کی انتہا حضرت ولید رضی اللہ عنہ کے معزول کر دینے پر ہوئی ۳۰ھ کو ختم ہو چکا ہے، اس وقت تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی شورش برپا نہیں ہوئی، مگر علامہ مودودی جیسے محققین کی دیانتداری یہ ہے کہ وہ تقرر ولید رضی اللہ عنہ کو بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے برخلاف شورش کے اسباب میں پیش کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قصوروار کا جرم ثابت نہیں کرتے بلکہ جرم کو بے قصور کے سر تھوپتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے بعد:

حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کوفہ کے گورنر مقرر کیے گئے۔ اشتر ابوحسنہ غفاری، جندب بن عبداللہ اور صعب بن جثامہ جو ولید رضی اللہ عنہ کی شکایتیں لے کر اس کے خلاف شہادت دینے گئے تھے جب ان کی مراد پوری ہوگئی اور حضرت ولید رضی اللہ عنہ معزول کر دیے گئے تو نئے گورنر کی رفاقت انہوں نے مدینہ ہی سے اختیار کر لی، نئے امیر کے ساتھ وہ کوفہ پہنچ گئے، مگر عام لوگ اس تبدیلی سے خوش نہیں تھے اور نئے گورنر نے جو تقریر خطبہ جمعہ کے موقع پر کی اس سے بھی خوش نہیں ہوئے۔ (طبری ص ۶۳ وص ۶۸ جلد ۵)

یہ سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کون تھے، یہ باریک نکتہ تو مودودی صاحب نے اپنی فرمائشی خوردبین سے معلوم کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ان کی قرابت تھی لیکن مودودی صاحب کے مستندترین مؤرخ اسلام ابن جریر طبری نے ان کا تعارف یہ کرایا ہے کہ: کوفہ میں کمانڈر تھے انہوں نے جنگ طبرستان میں عظیم الشان کامیابی حاصل کی، نوجوان صحابہ حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہ ان کے ساتھ ان کی زیر کمان تھے۔ معرکہ اتنا سخت ہوا کہ صلوٰۃ الخوف پڑھنی پڑی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فتح عطاء فرمائی۔ (تاریخ طبری ص ۵۷ جلد ۵)

اب اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ان کی قرابت بھی نکل آئی تو اس کی مثال وہی ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو جو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ماموں تھے ان کو کوفہ کا گورنر بنا دیا، بہرحال حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے کوفہ پہنچ کر اہل کوفہ کی دلجوئی اور مدارات کی پوری کوشش کی، روزانہ مجلس بھی ہوتی، اس میں اہل کوفہ آتے اور بے تکلفی سے باتیں کرتے، کچھ لوگ جو پہلے بڑے نہیں تھے اب بڑا بننا چاہتے تھے مجلس میں نمایاں رہتے، مؤرخین نے ان کے نام بھی شمار کرائے ہیں، ملاحظہ فرمایئے (ابن خلدون ص ۱۴۰ جلد ۲، البدایہ والنہایہ ص ۱۶۶ جلد ۷) ان کی بڑائی کی ایک بات یہ تھی کہ دوسرے لوگوں کے حسب نسب پر اور کبھی دوسرے قبائل پر تبصرہ بھی کرتے، یہ تبصرے سخت بھی ہوتے تھے پھر

آپس میں بحث ہونے لگتی جو سخت کلامی تک پہنچ جاتی، انتہا یہ کہ بقول ابن خلدون یخرجون منها الى المشاتعة والمقاتلة (ص ۱۴۰ جلد ۲) (سخت کلامی سے بڑھ کر گالی گلوچ، ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ جاتی)۔

ایک روز سواد عراق کے متعلق کچھ بات ہو رہی تھی، حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کی زبان سے نکلا انما هٰذا السواد بستان القريش (یہ علاقہ تو قریش کا باغ ہے)

حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی زبان سے اس فقرہ کا نکلنا تھا کہ مالک اشتر بے قابو ہو گیا اور بڑے غصہ سے چلا کر کہا جس علاقہ کو اللہ تعالیٰ نے ہماری تلواروں کے زور سے فتح کرایا ہے تم اس کو اپنی قوم کا بستان خیال کرتے ہو، اب سعید تو خاموش ہو گئے مگر آپس میں بحث چل گئی اور شور مچ گیا تب حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے پیشکار (صاحب شرطہ) عبدالرحمٰن اسدی نے ان کو ڈانٹا، اب یہ عبدالرحمٰن کو لپٹ گئے اور اس کو اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔

اس کے بعد حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے رات کی یہ مجلس موقوف کر کے دربان مقرر کر دیے کہ لوگوں کو آنے سے باز رکھیں۔ رات کی مجلس برخواست ہونے کا لوگوں کو بہت ملال ہوا، مگر ان لیڈران قوم کے تبصرے اب بھی بند نہیں ہوئے، پہلے خاص مجلس میں ہوا کرتے تھے اب جگہ جگہ ہونے لگے اور ان میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی داخل کر لیا گیا، جب یہ تبصرے ہوتے تو اور بھی آدمی جمع ہو جاتے تھے۔

رفتہ رفتہ یہ سلسلہ طویل ہوا اور فتنہ بڑھنے لگا تو سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہ تمام روئداد لکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیج دی، وہاں سے جواب آیا کہ ان لوگوں کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس شام بھیج دو یعنی نہایت ہی مہذب اور غیر محسوس طور پر ان کو کوفہ سے شہر بدر کر کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں نظر بند کر دیا۔

یہ شام پہنچے تو باوجودیکہ نظر بند اور معتوب کی حیثیت رکھتے تھے مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی بڑی مدارات کی، ان کے قیام کا خاص طور سے انتظام کیا۔ کھانا اور ناشتہ بھی ان کے ساتھ کرتے اور ہر ایک کا وظیفہ (روزینہ) بھی مقرر کر دیا، چند روز کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو سمجھایا، قریش کی کچھ خصوصیات بیان کیں اور فرمایا کہ خلیفہ اور امام

کی ذات ایک ڈھال ہے، اس کی حفاظت میں آپ آگے بھی بڑھ سکتے ہیں اور دشمن کا مقابلہ بھی کر سکتے ہیں، آپ لوگ مسلمانوں کے اس نظام کو درہم برہم نہ ہونے دیں۔ (طبری نے گفتگو کی پوری تفصیل دی ہے ص ۸۶ اور ص ۸۷ جلد ۵) اور ابن خلدون نے اس کا خلاصہ نقل کیا ہے۔ (ص ۱۴۶ جلد ۲)

لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مدارات اور دلجوئی کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، اس معقول گفتگو کا نہایت نامعقول جواب دیا، صعصعہ بن صوحان نے (جوان کا خطیب (اسپیکر) تھا) کہا: قریش اسلام سے پہلے بھی ہم سے بڑھے ہوئے نہیں تھے، نہ ان کی تعداد زیادہ تھی اور نہ طاقت، باقی یہ کہ خلیفہ ڈھال ہوتا ہے تو ڈھال اسی وقت تک ہے جب تک اس کو توڑا نہ جائے۔

اسی طرح کی باتیں اور لوگوں نے کیں جس سے نہ صرف ان کی طبیعتوں کا بلکہ ان کے جذبات اور ارادوں کا بھی اندازہ ہو گیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ یہ لوگ راہِ راست پر آنے والے نظر نہیں آتے۔

لیست لهم عقل ولا ادیان ابطوهم العدل انما همهم الفتنة واموال اهل الذمة (ابن خلدون ص ۱۴۱ جلد ۲) عقل و دانش سے یہ لوگ محروم ہیں، دین سے بھی ان کو کوئی سروکار نہیں، عدل اور مساوات کے رویہ نے ان کا مزاج بگاڑ دیا ہے اور ان کو خودسر بنا دیا ہے، فتنے برپا کرنا اور ذمیوں (غیر مسلم باشندگانِ وطن) کے مال ہڑپ کر لینا ان کا مقصد ہے

(الکامل ابن اثیر جلد ۳ ص ۱۷)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ ان کو ''حمص'' بھیج دو جہاں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے خلف رشید حضرت عبدالرحمٰن بن خالد حکمران ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کی تعمیل کی۔ یہ ''حمص'' پہنچے تو والیٔ حمص حضرت عبدالرحمٰن بن خالد کا رنگ دوسرا تھا، انہوں نے پہلی ہی گفتگو میں ان کی سخت گرفت کی، پھر ان کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا:

حسبر الله عبد الرحمن ان لم یرد بکم یا معشر لا ادری اعرب هم ام عجم (ابن خلدون ص ۱۴۱، ج ۲)

''تم لوگ، تمہارا یہ بھی پتہ نہیں کہ عربی ہو یا عجمی ہو، خدا برباد کردے عبدالرحمٰن کو (یعنی مجھ کو) اگر میں تمہیں ٹھیک نہ کردوں۔

عبدالرحمٰن بن خالد رضی اللہ عنہ نے زبانی تنبیہ بھی کی اور برتاؤ بھی سخت رکھا تو چند روز میں یہ درست ہو گئے، اپنی غلطیوں کی معافی مانگی، حضرت عبدالرحمٰن نے بارگاہِ خلافت میں اس کی رپورٹ بھیجی، وہاں سے اجازت آ گئی کہ یہ لوگ کوفہ جانا چاہیں تو جانے دو۔

قریشیت کے خلاف جو زہر پھیلایا جارہا تھا اور عربی اور عجمی کے نام پر جو ذہنیت پیدا کی جارہی تھی اس نے نہ صرف قریش کی سیادت وقیادت کے لیے خطرات پیدا کردیے تھے بلکہ ان کی عرفی حیثیت اوران کی ان جائیدادوں کے متعلق بھی خطرہ پیدا کردیا تھا جو کوفہ کے آس پاس عراق میں تھیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس خطرہ کو محسوس فرما کر ایک خطبہ میں اہل حجاز کو ہدایت کی کہ عراق میں جتنی جائیدادیں ہیں ان کو فروخت کردو یاان کا تبادلہ کرلو اہل عراق کی ان جائیدادوں سے جو حجاز میں ہیں، کیونکہ وہاں (عراق میں) فتنوں کا سیلاب آرہا ہے۔ (طبری ص ۶۴ جلد ۵، کامل ابن اثیر ص ۴۱ جلد ۳، ابن خلدون وغیرہ)

اخراج کے بعد:

ان لیڈروں کو اگرچہ کوفہ سے نکال دیا گیا تھا مگر درحقیقت ان لوگوں کی یہ حرکتیں ایک منظم تحریک کے ماتحت تھیں (جس کی تفصیل انشاءاللہ آئندہ بیان کریں گے) اسی طرح کی شکایتیں ماتحت علاقوں سے حضرت سعید رضی اللہ عنہ والی کوفہ تک پہنچیں تو آپ نے اپنے معتمد ارکان کو جو کوفہ میں رہتے تو فضا درست کرسکتے تھے ان علاقوں میں بھیج دیا۔ (ابن جریر طبری نے اُن کے نام بھی تحریر کیے ہیں ص ۹۲ ج ۵) اب تحریک کے فتنہ پرور کارکنوں کو اور آزادی مل گئی، کیونکہ جو ان کو جواب دے سکتے تھے وہ ماتحت علاقوں میں پہنچے ہوئے تھے اور جیسا کہ آئندہ وجہ بیان کی جائے گی اسی دوران حضرت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مدینہ طیبہ میں جملہ صوبوں کے گورنروں کی کانفرنس طلب کرلی، حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ اس میں شرکت کے لیے مدینہ طیبہ گئے عمرو بن حریث کو اپنا قائم مقام بنا گئے۔ اس وقت ان فتنہ پردازوں کی جرأت اور بڑھ گئی یہاں تک کہ انہیں کا ایک سرغنہ یزید بن قیس کوفہ والوں کی ایک پارٹی لے کر اس ارادہ

سے نکلا کہ مدینہ پہنچ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے خلافت سے دستبرداری کا مطالبہ کریں لیکن قعقاع بن عمرو جو والی کوفہ یعنی حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی طرف سے فوجوں کے افسر اعلیٰ تھے انہوں نے یزید کا تعاقب کیا اور یزید کو گرفتار کرلیا، یزید نے قعقاع بن عمرو کی منت سماجت کی کہ ہم تو صرف گورنر سعید کا تبادلہ چاہتے ہیں۔قعقاع نے ان کو چھوڑ دیا۔

یہ وہی وقت ہے کہ مالک الاشتر وغیرہ (جو حمص میں تھے) جنہیں حضرت عبدالرحمٰن بن خالد نے اجازت دی تھی کہ وہ اگر چاہیں تو کوفہ جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اشتر اپنی پارٹی کے ساتھ کوفہ پہنچ گیا اور یہ بھی روایت ہے کہ کوفہ کے فتنہ انگیزوں نے اس کو خط بھی لکھا تھا۔ (ابن خلدون ص ۱۴۲ جلد ۲)

مالک الاشتر نے یہ فضا دیکھی تو جو عہد و پیمان عبدالرحمٰن بن خالد رضی اللہ عنہ سے کیا تھا سب بالائے طاق رکھ دیا اور فتنہ پردازوں کی قیادت شروع کردی، جمعہ کے روز حضرت سعید کے خلاف ایک شوشہ چھوڑا، نماز سے پہلے ہی جامع مسجد کے دروازہ پر تقریر کی کہ میں مدینہ ہو کر آیا ہوں وہاں سعید اس لیے گئے ہوئے ہیں کہ عورتوں کے وظیفہ میں سو درہم کی کمی کرادیں اور مردوں کے وظائف کی آخری حد دو ہزار کردیں۔ اس وقت جن کے وظائف دو ہزار سے زیادہ ہیں ان کے دو ہزار کرادیں اور یہ کہ قریش بڑھ بڑھ کر کہہ رہے ہیں کہ سوادِ عراق ہمارا بستان ہے۔ پھر جیسے ہی جمعہ کی نماز ختم ہوئی اعلان کردیا کہ یزید بن قیس مدینہ کی طرف اس لیے جا رہے ہیں کہ سعید بن العاص کو یہاں نہ آنے دیں اور ان کو راستہ ہی سے واپس کردیں جو یزید کے ساتھ جانا چاہتا ہے وہ آ جائے۔ چنانچہ **فخرجوا وذو الری یعذ لونهم فلا یسمعون واقام اشراف الناس وعقلاء هم مع عمرو بن الحریث** (عام لوگ نکل پڑے اور اصحاب الرائے (سمجھ دار حضرات) ان کو ملامت کر رہے تھے۔ مگر یہ (جانے والے) کچھ نہیں جانتے تھے۔ معزز عمائدین اور سمجھ دار حضرات عمرو بن الحریث کے ساتھ رہے)۔

بہر حال یزید کے ساتھ لوگوں کی ایک بھیڑ روانہ ہوئی قادسیہ کے قریب جرعہ مقام پر اپنا ڈیرا ڈالا اور حضرت سعید رضی اللہ عنہ مدینہ سے واپس ہو کر یہاں پہنچے تو ان کا راستہ روک لیا کہ سعید واپس جاؤ ہمیں آپ کی ضرورت نہیں۔ سعید کے ایک غلام نے کہہ دیا، سعید واپس نہیں ہو

سکتے ،تو مالک الاشتر نے اس کو قتل کر دیا۔ (ابن خلدون ص۱۴۲ اجلد۱۲ میں الاثیر ص ۴۷ جلد۳)۔

حضرت سعید نے یہ حالت دیکھی تو وہ مدینہ واپس ہو گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سارا ماجرا سنا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو چاہتے ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی خواہش پوری کی، حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر بنا کر بھیج دیا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا۔

میں نے تمہارے مطالبہ کو مانتے ہوئے سعید کو معزول کر کے ابو موسیٰ کو ان کی جگہ مقرر کر دیا ہے، بخدا میں تم سے اپنی آبرو بچاؤں گا، تمہارے مقابلہ میں صبر و استقلال سے کام لوں گا اور تمہاری اصلاح میں پوری کوشش کروں گا۔ (ابن اثیر ص ۴۷ جلد۳)

آپ نے یہ بھی فرمایا **واللہ نجعل لاحد عذرا ولا نترک لھم حجۃ ولنصبرن کما امرنا حتی لبلغ ما یریدون**۔ بخدا کسی کے لیے کسی عذر کی گنجائش ہم باقی نہیں رکھیں گے نہ کسی کے لیے حجۃ کا موقع چھوڑیں گے اور جیسا کہ ہمیں حکم کیا گیا ہے ہم ضرور صبر کریں گے، یہاں تک کہ ہم ان کی مراد کی گہرائی کو پہنچ جائیں۔

یہ ۳۴ھ کا واقعہ ہے، حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ معزول کیے گئے، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ان کی جگہ گورنر مقرر کیے گئے۔

یہ تمام واقعات طبری، ابن اثیر اور ابن خلدون یعنی بقول علامہ مودودی تاریخ اسلام کے مستند ترین مؤرخین نے بیان فرمائے ہیں۔ ہم نے صرف اتنا تصرف کیا ہے کہ عربی زبان کے بجائے اُردو میں ان کا مفہوم بلاکم و کاست بیان کر دیا ہے۔

اس تمام سلسلۂ واقعات میں مودودی صاحب کو صرف ایک بات نظر آئی کہ حضرت سعید بن العاص، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے، لیکن کیا اس تمام ہنگامہ میں جو حضرت سعید کے خلاف ہوا کسی موقع پر بھی کسی نے رشتہ کا تذکرہ کیا۔

حضرت سعید کا تقرر خود ان کی موجودگی میں ہوا جو ولید رضی اللہ عنہ کے خلاف شکایت لے کر آئے تھے، کسی نے اس تقرر پر کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ بڑی خوشی سے ان کو لے کر کوفہ پہنچے، پھر حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے حاضر باش رہے ان کی مجلس میں آگے بڑھ کر بیٹھتے،

اختلاف اس پر ہوا کہ حضرت سعید نے کہہ دیا کہ یہ علاقہ (سوادعراق) قریش کا بستان ہے (بنو امیہ کا نہیں کہا تھا قریش کا کہا تھا)

اسی اختلاف نے شدت اختیار کی اور قریش کے خلاف پروپیگنڈہ شروع ہو گیا اور ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان جائیدادوں کے متعلق خطرہ ہوا جو قریش کی اس علاقہ میں تھیں۔ آپ نے مدینہ میں اہلِ الرائے حضرات کو جمع کر کے صورت حال سے آگاہ کیا اور یہ نصیحت فرمائی کہ اپنی جائیدادیں جو عراق میں ہیں فروخت کر دیں یا تبادلہ کر لیں۔

قریش کی مخالفت کے فتنہ نے شدت اختیار کی تو حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے بموجب کوفہ سے ان فتنہ پرداز لیڈروں کو جلاوطن کر کے شام بھیج دیا، یہ حضرت سعید کا جرم تھا جس نے ان شورہ پشتوں کو حضرت سعید کے خلاف ہنگامہ کا موقعہ دے دیا۔ رشتہ کا کوئی ذکر اب بھی کسی کی زبان پر نہیں آیا۔ جو ہنگامہ تھا وہ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے خلاف تھا کہ انہوں نے ان کے لیڈروں کو کوفہ سے نکال کر شام بھیج دیا تھا۔

اب تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا احترام بدستور تھا، اس سلسلہ میں مودودی صاحب کا ایک فقرہ ملاحظہ فرمایئے۔

ان کی (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی) خلافت میں بحیثیت مجموعی خیر اس قدر غالب تھی اور اسلام کی سربلندی کا اتنا بڑا کام ان کے عہد میں ہو رہا تھا کہ ان کی پالیسی کے اس خاص پہلو سے غیر مطمئن ہونے کے باوجود عام مسلمان پوری مملکت میں کسی جگہ ان کے خلاف بغاوت کا خیال تک دل میں لانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایک مرتبہ بصرہ میں ان کے گورنر سعید بن العاص کے طرزِ عمل سے ناراض ہو کر کچھ لوگوں نے بغاوت برپا کرنے کی کوشش کی بھی تو عوام نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے لوگوں کو بیعت کی تجدید کے لیے پکارا تو لوگ بغاوت کے علمبرداروں کو چھوڑ کر بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ (خلافت و ملوکیت ص ۱۱۶ و ۱۱۷)

اس فقرہ میں پالیسی کا خاص پہلو اور اس سے بے اطمینان تو شیعہ ذہنیت کی تقلید اور نقالی میں مودودی صاحب کے ذہن کی کارفرمائی ہے جس کو افتراء اور اختراع ہی کہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ پہلو لوگوں کے سامنے تھا تو حضرت سعید رضی اللہ عنہ جو بقول مودودی صاحب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عزیز تھے (خلافت وملوکیت ص ۱۰۷) سے ناراض ہوئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے راضی اور ان کے وفادار رہنے کے کوئی معنی نہیں اور اگر بالفرض رشتہ داری وجہ شکایت تھی تو جب حضرت سعید کو معزول کر دیا گیا تھا تو شکایت کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ علاوہ ازیں رشتہ داری تو معزولی کے بعد بھی باقی رہ گئی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اگر ایسے ہی خویش نواز اور قرابت پرور تھے تو وہ حضرت سعید کو کسی اور منصب پر فائز کر سکتے تھے۔

بہرحال مودودی صاحب کو اعتراف ہے کہ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی معزولی اور حضرت ابوموسیٰ کے تقرر تک لوگ بدستور حضرت خلیفہ سوئم کے یہاں تک وفادار تھے کہ ان کے خلاف بغاوت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن جیسا کہ حضرات مؤرخین کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ قریشیت کا سوال پوری شدت اور قوت سے سامنے آ چکا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خویش پروری کی بنا پر نہیں بلکہ انکی قریشیت کی بنا پر یہاں تک یہ لوگ ان سے ناراض ہو چکے تھے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے رو در رو کہہ دیا تھا کہ ''اس ڈھال کو جو خلیفہ اور امام کے وجود کی شکل میں لوگوں کے لیے آڑ ہوا کرتی ہے اس کو توڑا بھی جا سکتا ہے۔'' (دیکھو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور صعصعہ بن صوحان کی گفتگو جو پہلے گزر چکی ہے)۔

کوفہ کے حالات کو ہم یہیں ختم کرتے ہیں، البتہ ختم کرنے سے پہلے حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کا کچھ تعارف بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فرد جرم میں ان کا بھی نام لیا جاتا ہے۔

سعید بن العاص کون تھے؟

مودودی صاحب کی خوردبین بہت ہی تیز ہے کہ جو چیز کسی اور کو نظر نہیں آتی وہ ان کا مطمح نظر اور موضوع کلام بن جاتی ہے اور آپ کو اس پر اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ بڑے بڑے واقعات جن کو چشم کور بھی محسوس کر سکتی ہے، مودودی صاحب کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ (حبک

الشئ يعمى ويصم)۔

یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ مودودی صاحب عربی نہیں جانتے اور کتب تاریخ پڑھ نہیں سکتے۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ مودودی صاحب صرف وہی پڑھتے ہیں جو ان کے منصوبہ کے مناسب ہوتا ہے اور اسی پر تمام تحریر اور تقریر کی بنیاد قائم کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مودودی صاحب کو حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے متعلق صرف یہ نظر آیا "اپنے عزیز" ص ۱۰۷

سعید بن العاص اور عبداللہ بن عامر چھوٹے چھوٹے عہدوں پر رہے تھے۔ ص ۳۲۴

لیکن مودودی صاحب کے مستند ترین امام تاریخ ابن جریر طبری بیان کرتے ہیں کہ آپ نے جنگ طبرستان میں عظیم الشان کامیابی حاصل کی۔ نوجوان صحابہ حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر اور ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر حضرات ان کے ساتھ ان کے زیر کمان تھے۔

معرکہ اتنا سخت ہوا کہ صلوٰۃ الخوف پڑھنی پڑی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے عظیم الشان فتح عطا فرما دی۔ (تاریخ طبری ص ۵۷ ج ۵)

یہ بھی طبری ہی کا بیان ہے کہ ان کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ہی پروان چڑھایا تھا۔ ان کے باپ غزوۂ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے قتل ہو چکے تھے۔ ایک روز حضرتِ عمر فاروق کو اپنے دور خلافت میں قریش کے خاندانوں کا خیال آیا تو دریافت کیا کہ عاص بن سعید کے بچے کہاں ہیں؟ بتایا گیا کہ ان تینوں کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ لے گئے تھے انہیں کے پاس ہیں مگر بہت پریشان حال ہیں اور سعید تو بیمار بھی ہیں ان کی زندگی کی بھی اُمید نہیں، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو شام سے بلوایا۔ مدینہ کی طرف چلے تو خدا نے کیا ان کا مرض بھی جاتا رہا۔ جب مدینہ پہنچے تو تندرست تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے پاس رکھا۔ ان کا نکاح کرا دیا۔ پھر **لم يمت عمر حتى كان سعيد من رجال الناس**۔ سعید ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہو گئے (پروان چڑھ گئے تب) حضرت عمر رضی ... ... وفات ہوئی (طبری ص ۶۳ ج ۵)

ذیل کے واقعہ سے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی شفقت اور دلداری اور حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی ایمان افروز ذہانت اور حاضر جوابی کا اندازہ ہوگا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک روز فرمایا غزوات میں جو مشرک مارے گئے اگرچہ ان کے متعلق کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے مگر اتنی بات ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگرچہ غزوۂ بدر میں میں نے عاص کو قتل کیا تھا مگر وہ تمہارے باپ عاص بن سعید نہیں تھے بلکہ میرے ماموں عاص بن ہشام تھے اُن کو میں نے قتل کیا تھا۔ (تمہارے باپ کو میں نے قتل نہیں کیا)۔

حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا **لو قتلته لكنت على الحق** اگر آپ نے قتل کیا ہوتا تب بھی آپ پر الزام نہیں کیونکہ یہ حق و باطل کی جنگ تھی، آپ حق کے لیے لڑ رہے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ جواب بہت پسند آیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے قریش کو خاص ذہانت عطا فرمائی ہے۔ (الاستیعاب ص ۵۵۵)

حافظ ابن عبدالبر بھی وہ ہیں جن کو مودودی صاحب اسلام کا مستند ترین مؤرخ قرار دیتے ہیں۔ (ص ۳۱۴ خلافت و ملوکیت)

حافظ صاحب کے الفاظ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ ہیں۔ **احد اشراف قريش ممن جمع السخاء والفصاحة واحد الذين كتبوا المصحف لعثمان رضي الله عنه** قریش کے عمائدین میں سے وہ صاحب کمال کہ خدا نے ان کو جذبہ سخاوت بھی عطا فرمایا تھا اور فصاحت و بلاغت (خطابت) میں بھی کمال رکھتے تھے۔ جن حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں قرآن شریف کی نقلیں کیں ان میں سے ایک یہ بھی تھے۔ (الاستیعاب ص ۵۵۵)

اب اس کے بعد پاک نفسی اور سلامتی طبع بھی ملاحظہ ہو کہ معزول ہونے کے بعد کسی جھگڑے میں نہیں پڑے، اپنے مکان پر رہے۔ جمل اور صفین کی لڑائیاں ہوئیں مگر یہ کسی میں شریک نہیں ہوئے۔ البتہ جب تمام قصے ختم ہو گئے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی امامت پر سب کا اتفاق ہو گیا تب مدینہ کی گورنری منظور کی۔ (ایضاً ص ۵۵۵)

عجیب بات یہ ہے کہ مستند ترین مؤرخین نے جو باتیں فرمائیں حضرت مودودی صاحب کو ان میں سے کسی کی خبر نہیں۔ صرف وہ بات یاد ہے جو کسی مؤرخ نے تحریر نہیں کی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عزیز تھے۔

اگر مودودی صاحب کو توفیق ہوتی اور وہ حضراتِ صحابہ کی عیب جوئی کے بجائے انصاف سے کام لیتے تو عزیز داری کے طعن کو قطعاً غلط اور بے محل سمجھتے۔ کیونکہ کوئی بھی قریشی ایسا نہیں تھا جس کا کوئی رشتہ دوسرے قریشی سے نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ جب قریش کے نکاح بیاہ آپس میں ہوتے تھے اور صرف ایک نہیں بلکہ چار چار اور اسلام سے پہلے اس سے بھی زیادہ نکاح کر لیا کرتے تھے تو قریش کا کوئی شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کا کسی دوسرے سے رشتہ نہ ہو۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ تھی کہ قریش کے ہر ایک بطن اور خاندان سے رشتہ داری تھی۔ ملاحظہ ہو تفسیر قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى حضرات مؤرخین محض تعارف کے لیے رشتہ بیان کر دیتے ہیں۔ مودودی صاحب کی مسموم ذہنیت اس تعارف کو طعن بنا دیتی ہے۔ (معاذ اللہ)

قبائلیت کی چنگاری:

مفصلہ بالا واقعات پر دوبارہ نظر ڈال لیجیے اور فیصلہ کیجیے کہ قبائلیت کی چنگاری کہاں سلگی اور اس کو کس نے سلگایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو تقررات کیے ان سے سُلگی یا ان شورہ پشتوں نے اس چنگاری کو سلگایا جو حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے اس فقرہ پر برافروختہ ہو گئے تھے کہ سواد عراق بستانِ قریش ہے۔

باشندگان کوفہ کون تھے؟

مجاہدین اسلام جو سیّدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت قادسیہ اور جلولاء کے عظیم معرکوں میں کامیابی حاصل کر چکے تھے، پھر مملکتِ فارس کا پایہ تخت مدائن بھی فتح کر چکے تھے، وہ مدائن کو فوجی مرکز بنا سکتے تھے، مگر اس علاقہ کی آب و ہوا ان کے موافق نہیں تھی تو یہ سرزمین منتخب کی گئی جہاں کوفہ آباد کیا گیا۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ ۱۷ھ کے محرم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مدائن سے کوفہ منتقل ہوئے۔ لہٰذا اس کے پہلے آباد کار وہ تھے جو جنگ قادسیہ میں شریک تھے۔

(۱) ان میں حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم تقریباً پونے سات سو تھے، حضراتِ اہل بدر ستر سے چند زائد، فتح مکہ سے پہلے کے حضراتِ صحابہ جن میں وہ بھی تھے جو بیعتِ رضوان میں شریک تھے تقریباً ۳۱۳؛ فتح مکہ کے وقت کے حضرات تین سو، حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ابناء اور فرزندان سات سو (طبری ص ۸۹ ج ۴) ان حضرات کا تعلق اگرچہ مختلف قبائل سے تھا مگر شرفِ صحابیت قبائلی تعلق پر غالب آچکا تھا اور اب صرف یہی نسبت اور صرف ایک ہی تعلق نمایاں تھا کہ بارگاہِ رسالت کے فیض یافتہ ہیں، صحابی ہیں یا کسی صحابی کے فرزند ہیں۔

(۲) حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ جو دوسرے عرب شریک ہوئے تھے وہ قبائلی نسبت لیے ہوئے تھے۔ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

لا ضربن ملوک العجم بملوک العرب (طبری ص ۸۷ ج ۴۰) میں ملوک عرب کے ذریعہ ملوک عجم پر ضرب لگاؤں گا۔

عرب میں ملوک نہیں تھے البتہ بڑے بڑے قبائل کے شیوخ ملوک کی شان رکھتے تھے۔ بنو بکر بن وائل، عبدالقیس، ربیعہ، اسد، کندہ، تمیم، قضاعہ وغیرہ قبائل جو ہمیشہ اپنی عظمت اور اپنی شجاعت پر ناز کیا کرتے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو دعوت جہاد دی۔

یہ قبائل من حیث القبیلہ پورے جوش وخروش کے ساتھ اس جہاد میں شریک ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے معاشرتی لوازم یعنی شعراء اور خطباء بھی تھے (طبری ص ۸۶، ۸۷ ج ۴۰) مؤرخین نے ہر ایک قبیلہ کی تعداد، ان کے گروپ اور ان کے سرداروں کے نام بھی لکھے ہیں۔

تاریخ کی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان قبائل نے بڑھ چڑھ کر قربانیاں پیش کیں اور عظیم الشان فتوحات حاصل کیں۔ پھر یہی قبائل تھے جو اپنی قبائلی خصوصیات کے ساتھ کوفہ میں آباد ہوئے۔ (ابن خلدون ص ۱۳۸ ج ۲)

بارہ ہزار اہلِ یمن کے لیے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا۔ قبیلہ نزار کے افراد آٹھ ہزار

تھے۔ان کو ایک خطہ دے دیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ (فتوح البلدان ص ۲۵۵)

(۳) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی فوج کی تعداد اگرچہ تینتیس ہزار کے قریب تھی (طبری ص ۷۸ ج ۴) لیکن جب کوفہ کو اس علاقہ کے مرکز کی حیثیت دے دی گئی تو فوج کی تعداد چالیس ہزار کر دی گئی۔ ہر سال دس ہزار جوان اس علاقہ کے مختلف محاذوں پر کام کرتے اور تیس ہزار محفوظ رہتے تھے۔اس طرح ہر ایک فوجی تین سال تک محفوظ رہتا اور چوتھے سال اس کا نمبر آتا تھا۔ (طبری ص ۴۵ ج ۵)

(۴) جنگ قادسیہ میں ایرانی سپہ سالار (رستم) کے ساتھ منتخب جوانوں کی ایک خاص فوج تھی جو ''جند شاہنشاہ'' شاہی فوج کہلاتی تھی۔ اس کے نوجوان اگرچہ ایرانیوں کے ہم نسل یا ہم مذہب (مجوسی) نہیں تھے، لیکن اپنے جنگی کارناموں کے باعث ان کی یہ فوج خاص اہمیت رکھتی تھی۔ جنگ قادسیہ میں اہل ایران کو شکست ہوئی تو ان کو اپنے مستقبل کی فکر ہوئی۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ باعزت معاہدہ کو حال اور مستقبل کے لیے مفید سمجھا۔ چنانچہ صرف دو شرطوں کے ساتھ انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے امن کی درخواست کی۔ اوّل یہ کہ وہ آزاد ہوں کہ جس مقام کو چاہیں اپنے قیام کے لیے منتخب کر لیں۔ دوم یہ کہ جس قبیلہ سے مناسب سمجھیں عقد موالات (یعنی باہمی تعاون و تناصر تاحین حیات اور مرنے جینے کے ساتھی رہنے) کا معاہدہ کر لیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے نہ صرف یہ شرطیں منظور فرمالیں بلکہ ان کے وظائف بھی مقرر کر دیے۔

اس جند شاہنشاہ نے فتح مدائن اور جنگ جلولاء وغیرہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ پھر یہ لوگ کوفہ میں آ کر آباد ہو گئے۔ (فتوح البلدان ص ۲۸۹)

(۵) بصرہ کے قریب ایک قوم آباد تھی، اس کو اساورہ کہا جاتا تھا۔ یہ بھی وہاں سے منتقل ہوئے اور اپنے ڈیرے کوفہ میں ڈال دیے۔ (فتوح البلدان ص ۲۸۹ بلاذری)

عجمی اقوام کو موالی کہا جاتا تھا کیونکہ مولی آزاد کردہ غلام کو کہتے ہیں اور جس سے تعاون باہمی کا معاہدہ ہو جائے اس کو بھی مولی کہا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے نہ صرف وقتی امداد بلکہ جینے اور مرنے کا ساتھ ہو جاتا تھا۔ عجمی لوگ آزاد کردہ غلام بھی تھے اور بڑی کثرت سے وہ

بھی تھے جنہوں نے قبائل سے معاہدے کر رکھے تھے۔ اس لیے ان کو موالی کہا جاتا تھا۔

(۶) پہلے گزر چکا ہے کہ جب صفر ۲۳ھ میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر بنایا تھا تو فرمایا تھا **کیف واھل الکوفة مأة الف** مطلب یہ ہے کہ ۲۳ھ میں کوفہ کی آبادی ایک لاکھ ہوگئی تھی۔ (البدایہ والنہایہ ص ۱۲۶ ج ۷۰)

دورِ حاضر کے مستشرق ول ہوسن (Well Housen) کی تحقیق یہ ہے:

''باشندگانِ کوفہ میں نصف سے زائد موالی تھے، یہ مختلف پیشے کرتے تھے، دستکار بھی تھے، کاشت بھی کرتے تھے۔ زیادہ تر فارس کے رہنے والے تھے۔ نسل کے لحاظ سے بھی فارسی تھے اوران کی زبان بھی فارسی ہی تھی۔ اسیرانِ جنگ کی حیثیت میں غلام بن کر آئے تھے۔ مسلمان ہوگئے تو ان کے مالکوں نے ان کو آزاد کردیا۔ یہ آزاد بے شک ہوگئے، مگر غریب الوطن تھے، اس لیے ان کو ضرورت رہی کہ وہ اپنے آزاد کرنے والوں کی حمایت حاصل کرلیں۔ بس وہ عرب کے حاشیہ نشین ہوگئے۔ یہ صلح اور جنگ میں عرب آقاؤں کے تابع رہا کرتے تھے۔ (فجر الاسلام ص ۱۱۵)

مزاج:

سیّد الانبیاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں قبائل عرب انتظار کررہے تھے کہ پلہ کس کا بھاری رہتا ہے۔ قریش کا یا مسلمانوں کا۔ رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور قریش حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تو یہ قبائل اسلام کی طرف لپکے اور ارشادِ ربانی **یدخلون فی دین اللہ افواجا** کے بموجب عرب کے تمام قبائل جوق در جوق اسلام میں داخل ہوگئے، مگر داخلہ کی شکل یہ ہوتی تھی کہ قبیلہ اپنے شیخ کو یا اپنے چند نمائندوں کو بھیج دیتا۔ وہ دربارِ رسالت میں حاضر ہوتے، ضرورت سمجھتے تو سوالات کر کے اطمینان بھی حاصل کرتے۔ پھر کلمۂ توحید پڑھ کر نہ صرف اپنے بلکہ پورے قبیلہ کے اسلام کا اعلان کردیتے تھے۔ اب مسلمان پورا قبیلہ ہوجاتا تھا مگر بارگاہِ رسالت سے مستفید ہونے اور شرفِ صحابیت کے تاجدار بننے کا موقع صرف ایک شیخ قبیلہ کو یا چند نمائندوں کو حاصل ہوتا تھا۔ اہل قبیلہ جس طرح سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے محروم تھے وہ عموماً ان ذہنی اور جذباتی تبدیلیوں سے بھی ناآشنا رہتے جو اسلامی

تعلیمات اور شرفِ صحابیت کی خصوصیات تھیں، لیکن چند سال بعد جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو ''دعوتِ جہاد'' دی اور انہیں قبائل نے قادسیہ اور جلولاء وغیرہ کی لڑائیوں میں بہادری اور سپہ گری کے جوہر دکھاتے ہوئے ان معرکوں میں شاندار کامیابی حاصل کی تو اب ان کو ناز ہو گیا کہ سفینۂ اسلام کے ناخدا وہی ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں یہ قبائل قریش کی عظمت کے صرف اسی حد تک قائل تھے کہ وہ خانہ کعبہ کے محافظ اور خادم ہیں، لیکن اب سیاست کی باگ ڈور قریش کے ہاتھ میں دیکھی تو بقول علامہ ابن خلدون زمانۂ جاہلیت کی رگیں پھڑکنے لگیں اور اب ان کو یہ بھی ناگوار ہوا کہ حضرات مہاجرین اور انصار (رضوان اللہ علیہم) کو یہ برتری کیوں حاصل ہے۔ (ص ۱۳۸ ج ۲ ابن خلدون)

سیّدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جن کے آباد کردہ کوفہ میں یہ لوگ سکونت پذیر تھے، سب سے پہلے اسی محسن کے خلاف بے بنیاد الزامات کا طومار اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا۔ پھر انہیں لوگوں نے بصرہ میں سیّدنا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ہدف بنایا۔ یہ قریش نہیں تھے مگر صحابیت کی بنا پر ان کا اعزاز بھی ان نوخیز قبائل کو ناگوار تھا۔

عربوں کے علاوہ بڑی تعداد موالی کی تھی۔ شاہی فوج کے چار ہزار جوانوں کے علاوہ ان میں زیادہ وہ تھے جو جنگِ جلولاء میں گرفتار ہوئے تھے۔ یہ اپنے اپنے مقام پر صاحب حیثیت لوگ تھے۔ ان میں پڑھے لکھے صاحب فکر اور اصحاب الرائے بھی تھے۔ اسلام لانے کے بعد ان کی یہ صلاحیتیں اسلامی خدمات میں صرف ہوئیں مگر اس دور میں ایسے صالح موالی کی تعداد بہت کم تھی۔ زیادہ تر بلکہ عموماً وہی تھے جو اگرچہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے مگر ان کے دل اسی طرح شوخ تھے یا اگر گرفتار تھے تو ان جذبات و نظریات کی کمند میں جو سرزمین ایران میں انکو نسلی وراثت کے طور پر ملے تھے۔

علامہ دینوری نے اپنی مشہور تصنیف (الاخبار الطوال) میں لکھا ہے کہ معرکہ جلولاء میں اتنا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا کہ اس سے پہلے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اور اسی طرح بڑی کثرت سے دشمن کے فوجی بھی گرفتار ہوئے۔ ان کے ساتھ بہت سی عورتیں بھی تھیں، جن کا تعلق فارس کے بڑے بڑے گھرانوں سے تھا۔ (بنات احرار فارس)

جب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے رپورٹ پیش کی گئی تو آپ نے فرمایا **اللهم انی اعوذ بک من اولاد سبایا الجلولیات** ''جنگِ جلولاء میں جو عورتیں گرفتار ہو کر آئی ہیں میں ان کی اولاد سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں'' چنانچہ ان جلولی عورتوں کی اولاد ہی تھی جو صفین میں معرکہ آراء ہوئی۔ (فجر الاسلام ص ۱۱۷)

بہر حال عربوں کے علاوہ موالی کا مزاج وہ تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس سے پناہ مانگی تھی۔

ماحول:

خلیفۂ وقت یعنی پوری مملکت کا سربراہ یا کسی معمولی جماعت کا قائد و رہنما اس کے متعلق کوئی رائے قائم کر لینا اس وقت تک درست نہیں جب تک ان حالات کا نقشہ سامنے نہ ہو، جن کی کشمکش میں اس کو کام کرنا پڑا۔

مودودی صاحب جیسا زیرک اور فرزانہ صاحب قلم ان حالات کو اسی صورت میں نظر انداز کر سکتا ہے جب کسی شخصیت کے متعلق یکطرفہ رائے قائم کرنی اور اس کو مجرم گردانا مقصود ہو۔

سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ مبارک میں جو غیر معمولی فتوحات حاصل ہوئیں، کیا کوئی صاحب عقل وفہم یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان کا کوئی ردِ عمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایران کی شاہنشاہیت جو چند سال پہلے تک پوری دنیا ورنہ ایشیا کی سب سے بڑی طاقت تھی اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنے جاہ و جلال اور دبدبہ وسطوت میں نظیر نہیں رکھتی تھی بلکہ ایک خاص تہذیب اور شاندار تاریخ کی مالک تھی جس نے اس کے تاجپوشوں کو معبودوں کا درجہ دے رکھا تھا جس کے ماتحت بیشمار نواب اور راجا اور مذہبی پیشوا تھے جو اپنی شان و شوکت میں بادشاہوں کا درجہ رکھتے تھے، جن کے غرور اور نخوت کا یہ عالم تھا کہ وہ عرب کے بڑے بڑے سرداروں کو بھی چرواہوں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے، انہیں چرواہوں کے ہاتھ یہ شاہنشاہیت برباد ہوئی، اس کے نواب تباہ ہوئے، شاہزادے غلام اور شاہزادیاں باندیاں بنائی گئیں، مذہبی پیشواؤں کا نام و نشان مٹا۔

کیا اس کا کوئی ردِ عمل نہیں ہونا چاہیے تھا؟ کیا ان مٹنے والوں کے وارثوں کے دل جذباتِ انتقام سے پاک ہو گئے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کی گردنیں جھکی تھیں مگر ان کے دلوں میں جذباتِ انتقام کے تنور دہک رہے تھے، وہ ان چرواہوں کے سامنے جھکنے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے۔ (الا ماشاءاللہ)

اسی طرح وہ یہودی جو دشمن اسلام رہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جزیرۃ العرب کو ان کے وجود سے پاک کرنے کے لیے ان کو خیبر سے بھی جلاوطن کر کے شام پہنچا دیا تھا، وہ جزیرۃ العرب سے نکلے تھے، مگر مملکتِ اسلام سے جلاوطن نہیں ہوئے تھے اور نہ ان کے دلوں کے وہ کانٹے نکلے تھے جو ان کی مذہبی خصوصیات میں داخل تھے۔

جب جزیرۃ العرب کو خالص اسلامی مرکز بنایا گیا تھا تو نجران وغیرہ سے عیسائیوں کو بھی نکالا گیا، عرب عیسائیوں کی ریاستیں جو اطرافِ شام میں تھیں جب اس علاقہ سے رومی حکومت کے اقتدار کا خاتمہ ہوا تو یہ عرب عیسائیوں کی ریاستیں بھی ختم ہو گئیں، ان کے خاتمہ کا اثر عام عربوں پر یہ تھا کہ صدیوں بعد تک افسانوں اور کہانیوں میں آلِ غسان کے کارناموں کا ماتم کیا جاتا رہا۔

اس کے علاوہ عیسائیوں کی مرکزی حکومت اپنی شان وشوکت کے ساتھ قائم تھی اور اس سے ہیبت انگیز لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ نفاق کے پرانے مرکز جو کچھ مدینہ میں اور زیادہ تر ماحولِ مدینہ میں تھے (سورۃ توبہ آیت ۱۰۰) جو عہدِ رسالت کے آخر تک رہے، وہ اگر ختم ہو گئے تھے تو کیا عہدِ فاروقی کے شکست خوردہ طبقات کے لیے ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ نفاق کے نئے اڈے قائم کریں۔

یہ اسلامی معاشرے سے باہر کے اثرات تھے، خود اسلامی معاشرے میں وہ تبدیلی رونما ہو رہی تھی جس کی طرف کلام ربانی نے اسی وقت اشارہ کر دیا تھا جب اس مملکت کی عظیم الشان عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا یعنی سورہ اقراء ہی میں انسان کی اس فطرت سے آگاہ کر دیا تھا۔

ان الانسان لیطغیٰ ان رآہ استغنیٰ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ

میں ترجمہ یہ ہے کہ ''انسان سر چڑھتا ہے اس سے کہ دیکھے آپ کو محفوظ'' (صاحبِ نصیب، دولت مند) یعنی انسان جب دیکھتا ہے کہ اقبال اس کا استقبال کر رہا ہے اور کامیابیاں اس کے ہم رکاب ہیں تو اس کے دماغ میں طغیانی آ جاتی ہے، وہ بڑے سے بڑے اقتدار کو بھی چیلنج کرنے لگتا ہے کہ تمہیں اس مسند پر بیٹھنے کا حق نہیں ہے، تم ہٹ جاؤ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے کچھ پہلے جب برسرِ منبر اُمت کو یہ بشارت سنائی تھی **اعطیت مفاتیح خزائن الارض** ''روئے زمین کے خزانوں کی کنجیاں مجھے دے دی گئیں'' تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا تھا:

وانی واللہ ما اخاف ان تشرکوا بعدی ولکن اخاف علیکم ان تنافسوا فیھا

> ''قسم بخدا مجھے یہ خطرہ نہیں کہ تم میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے، البتہ مجھے اس کا خطرہ ہے کہ تمہارے اندر منافست پیدا ہو جائے گی۔ یعنی آگے بڑھنے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے جذبات اُبھر آئیں گے۔'' (بخاری شریف ص ۹۵۱)

ایک صاحب نے سوال کیا: **اویاتی الخیر بالشر** کیا خیر شر پیدا کرسکتا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر خاموش رہے اور گہرے غور و فکر کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ خیال ہوا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ پھر پیشانی مبارک سے پسینہ پونچھتے ہوئے سائل کو جواب دیا۔

''خیر سے تو خیر ہی پیدا ہوتا ہے، لیکن اگر خیر کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے تو لامحالہ شر رونما ہوتا ہے، آپ نے مثال دی کہ موسم بہار میں جب سبزہ پیدا ہوتا ہے، وہ خیر ہی خیر ہے لیکن چرنے والے جانور کے لیے وہ اسی وقت مفید ہوسکتا ہے جب چرنے کے ساتھ ہضم بھی کرتا رہے لیکن اگر ہضم کے بغیر چرتا ہی چلا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اپھارا (تخمہ) ہو جائے گا جو اس کو موت کے گھاٹ اُتار دے گا یا موت کے قریب پہنچا دے گا۔ (بخاری شریف ص ۱۹۷، ص ۳۹۸، ص ۹۵۱ وغیرہ)

مفاتیح خزائن الارض (زمین کے خزانوں کی کنجیاں) جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی بدولت اُمت کو عطا ہوئیں، وہ صرف اموالِ غنیمت یا صرف قیصر و کسریٰ کے خزانے نہیں تھے، ان کے متعلق تو پیشین گوئی یہ تھی کہ ان خزانوں کو راہِ خدا میں خرچ کرو گے۔ (بخاری شریف ص ۵۱۱) مفاتیح خزائن الارض وہ تجارتی وسائل تھے جو مسلمانوں کو میسر آ گئے تھے۔

قریش کے تجارتی تعلقات دوسرے ممالک سے پہلے بھی تھے اور اسی وجہ سے وہ سرزمین عرب میں سب سے زیادہ دولت مند تھے، مگر یہ تعلقات چند تجارتی قافلوں کی حد تک تھے جو یمن، شام یا عراق جاتے، وہاں کے نوابوں یا بادشاہوں کی خوشامدیں کرتے ہوئے اپنا مال فروخت کرتے اور وہاں سے کچھ مال سرزمین عرب کے چند شہروں کے لیے لے آتے تھے، لیکن اب صورت یہ تھی کہ شام، عراق، یمن، مصر اور افریقہ کے تمام زرخیز علاقے مسلمانوں کے ہو چکے تھے۔ خود ان علاقوں کی اندرونی تجارت پر بھی مسلمانوں کا قبضہ تھا، اور یورپ اور ایشیا بالفاظِ دیگر مشرق و مغرب کے ڈانڈے انہیں علاقوں کے ذریعے ملتے تھے، تو گویا تمام دنیا کے تجارتی ذرائع پر مسلمانوں کو بالادستی حاصل ہو گئی تھی اور فی الواقع خزائنِ ارض کی کنجیاں مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئی تھیں، اس کا نتیجہ تھا کہ ایک معمولی عرب کے گھر میں بھی دولت کے انبار لگ گئے تھے۔

بلا خوفِ تردید نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فراوانئ دولت اور افراطِ زر کے اس بحران میں بھی اپنے اسی مقام پر قائم رہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مسعود میں ان کے لیے معین ہو چکا تھا۔

سیّد الانبیاء محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کا وہ تریاق ان کو میسر تھا کہ سیم و زر اور مال و دولت کے انبار پر جب ان کی نظر پڑتی تو فخر و غرور اور دماغی طغیانی کا زہر تو کیا پیدا ہوتا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی تنگی اور تنگ دستی ان کو یاد آتی اور یہ دولت خوشی کے بجائے کڑھن کا سبب بن جاتی تھی۔

سیّدنا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اتنا سونا ترکہ میں چھوڑا تھا کہ ہتھوڑوں سے کاٹا گیا اور کاٹنے والوں کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اور چار

بیویوں میں سے ہر ایک بیوی کو اسی ہزار کی رقم ملی (البدایہ والنہایہ ص۱۶۴ ج۷) جب کہ وصیت یہ کی تھی کہ اصحابِ بدر میں سے جو بھی زندہ ہیں ان کو چار چار سو دینار ان کے ترکہ میں سے دیے جائیں۔ اسی طرح ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے رقم خطیر کی وصیت کی تھی۔ ان کے علاوہ اور مداتِ خیر کی وصیت تھی۔

انہیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے یہاں غلہ آیا جو سات سو اُونٹوں پر لدا ہوا تھا۔ پھر ایک حدیث کی بناء پر جو حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذریعہ ان کو پہنچی نہ صرف غلہ بلکہ وہ اُونٹ اپنے ساز وسامان کے ساتھ فی سبیل اللہ تقسیم کر دیے۔
(البدایۃ والنہایۃ ص۱۶۴ ج۷)

انہیں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا یہ دل دوز واقعہ حضرت نوفل بن یاس ہزلی بیان کرتے ہیں کہ کھانے کا وقت ہوا، دستر خوان پر کھانا چنا گیا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری ہو گیا، سبب پوچھا گیا تو جواب دیا کہ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے اس حالت میں رخصت ہو گئے کہ آپ کو اور آپ کے اہل بیت کو جو کی روٹی بھی پیٹ بھر نہیں ملتی تھی اور ہمارے سامنے یہ نعمت رکھی ہوئی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ یہ ہمارے لیے کوئی بہتر صورت ہے۔ (شمائل ترمذی شریف ص۲۷)

حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ بیمار تھے، حضرت ابو وائل رضی اللہ عنہ مزاج پرسی کے لیے گئے تو حضرت خباب پر رقت طاری تھی، فرمانے لگے ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی، رضائے الٰہی ہمارا نصب العین اور مقصد تھا، اللہ تعالیٰ کے یہاں ہمارا اجر و ثواب لکھا گیا، پھر کچھ وہ خوش نصیب تھے جنہوں نے اس دنیا میں اس اجر کا کوئی حصہ وصول نہیں کیا۔ ان میں سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی تھے جو غزوۂ احد میں شہید ہوئے، صرف ایک چھوٹا سا کمبل ان کے ساتھ تھا، اگر سر چھپاتے تو پیر کھل جاتے تھے اور پیر چھپاتے تھے تو سر کھل جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب ہم نے سر چھپا دیا اور پیروں پر اذخر گھاس ڈال دی۔ (ان کے برخلاف) ہماری ہی جماعت میں وہ بھی ہیں (اپنی ذات مراد ہے) جن کے گلشنِ عمل کے پھل پک چکے ہیں اور وہ ان کو (دنیا ہی میں)

توڑ رہے ہیں۔ (بخاری شریف ص ۹۵۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک وہ وقت تھا کہ میں ایک درہم کا بھی مالک نہیں تھا۔ آج حالت یہ ہے کہ مکان کے ایک کنارے میں چالیس ہزار درہم پڑے ہوئے ہیں (مشکوٰۃ شریف ص ۱۳۲ بحوالہ ترمذی واحمد)

اسی طرح کے بہت سے واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں جن کی شہادت یہ ہے کہ افراطِ زر نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو متاثر نہیں کیا لیکن اب اُمتِ اسلامیہ صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نام نہیں تھا۔ اب غیر معمولی اکثریت ان کی تھی جن کی مثال پہلے گزر چکی ہے کہ ان کو حضرات مہاجرین وانصار کی برتری بھی اُکھرنے لگی تھی۔ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اب ایسے ہی رہ گئے تھے جیسے آڑو کے دانہ میں سفیدی۔

ایران کے شاہی محل کے بیش بہا فرش فروش، تاجِ شاہی اور بادشاہ کے زیورات جب مدینہ پہنچے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی احتیاط کی یہ حالت تھی کہ آپ کو گوارا نہ ہوا کہ وہ ایک شب بھی دربارِ خلافت کی چھت کے نیچے گزاریں۔ آپ نے ان کو باہر رکھوایا۔ پھر ان کے ٹکڑے کر کے تقسیم کرا دیے۔ قالین کا ایک ٹکڑا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملا جو آپ نے بیس ہزار میں بیچا۔ (البدایہ والنہایہ ص ۶۷ ج ۷)

لیکن فاروق اعظم کی آنکھیں جو بیش بہا دولت کو دیکھ رہی تھیں، خیرہ ہونے کے بجائے اشکبار تھیں، عرض کیا گیا کہ یہ مقامِ مسرت ہے نہ مقامِ گریہ۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا وہ اس صورتِ حال کی عکاسی کر رہا تھا جو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد پیش آ گئی۔

واللہ ما اعطی اللہ هذا قوما الاتحاسدوا وتباغضوا ولا تحاسدوا الا القی باسهم بینهم (البدایہ والنہایہ ص ۷۰ ج ۷)

یہ دولت جن کے یہاں پہنچتی ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے حسد اور بغض رکھنے لگتے ہیں اور بغض کا نتیجہ خانہ جنگی ہوتا ہے۔

مودودی صاحب کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی فرضی خویش نوازی میں قبائلی عصبیت کی چنگاریاں نظر آئیں، مگر افسوس ان کی نظر اس پر نہیں پڑی کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے تھے:

ان لکل امة فتنة وفتنة امتی المال (ترمذی شریف ص۵۹ ج۲)

''ہر ایک اُمت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری اُمت کے لیے فتنہ دولت ہے۔''

فتنوں کے متعلق پیشین گوئیاں:

یہ خارجی اور داخلی محرکات یعنی مفتوحہ اور شکست خوردہ اقوام کا ردعمل، دوسری طرف فراوانیٔ دولت اور اس کے اثرات۔ اس ذاتِ اقدس کی نظر دوررس سے اوجھل نہیں تھے۔ جس کو ''علم الاولین والاٰخرین'' عطا فرمایا گیا تھا۔ آپ کی پیغمبرانہ فراست محسوس کر رہی تھی کہ مستقبل نہایت خطرناک ہے۔

کتاب الفتن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات محفوظ ہیں جو ان فتنوں کے متعلق زبان مبارک سے صادر ہوئے۔

سیّدنا حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بڑی توجہ سے ایسے ارشادات یاد رکھا کرتے تھے جو فتنوں کے بارے میں لسانِ نبوت سے صادر ہوتے تھے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کے متعلق باتیں دریافت کیا کرتے تھے اور میں شر کے متعلق معلومات حاصل کیا کرتا تھا کہ مبادا میں کسی شر میں مبتلا ہو جاؤں۔ (بخاری شریف ص۱۴۰۹)

سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جن کی فراست ضرب المثل ہے وہ بھی اس خطرناک اور ہیبت انگیز ردِعمل سے مطمئن نہیں تھے۔ آپ کو خود اپنے دورِ مبارک میں بھی اس کا خطرہ رہتا تھا۔ چنانچہ ایک روز حاضرین مجلس سے دریافت فرمایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات جو فتنہ کے بارے میں ہیں کسی کو یاد ہیں؟

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فوراً جواب دیا ''مجھے'' آپ نے فرمایا، بیان کرو۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا انسان کا فتنہ مال میں بھی ہوتا ہے، اپنی جان میں بھی اور اپنے اہل وعیال میں بھی۔ نماز، صدقہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فوراً فرمایا: یہ فتنے نہیں، میں اس فتنہ کے متعلق دریافت کر رہا ہوں جو سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارے گا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا آپ کو

اس کی کیا فکر؟ اس کا کوئی نقصان آپ کو برداشت نہیں کرنا پڑے گا، آپ کے اور اس فتنہ کے درمیان ایک دروازہ ہے جس پر تالا لگا ہوا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ — کیا یہ کھولا جائے گا یا توڑا جائے گا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ — توڑا جائے گا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ — پھر تو دوبارہ بند نہ ہو سکے گا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ — جی ہاں (بخاری شریف ص ۱۰۵۱)

فتنہ کا وقت:

سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ فراست کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ آپ نے اس فتنہ کے وقت کی بھی نشاندہی کر دی تھی۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

معها بلاء يصيبه (بخاری شریف ص ۱۰۵۲)

اس بشارت کے ساتھ سخت آزمائش بھی ہوگی۔

سخت آزمائش شہادت نہیں، شرفِ شہادت تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بھی حاصل ہوا، سخت آزمائش یہ ہے کہ مختلف جذبات جن میں قریشی اور غیر قریشی کا مسئلہ بھی تھا۔ جذبہ کی حد سے آگے بڑھ کر عمل کی سرحد میں داخل ہونے لگے گا۔ حضرت ذی النورین کا دورِ خلافت انہیں جذبات کی کشاکش میں گزرا۔

علامہ ابن خلدون قبائل بنی بکر و عبدالقیس و ربیعہ وغیرہ کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں:

> ''ان قبائل کی جاہلیت کی رگیں پھڑ کنے لگیں اور انہوں نے دیکھا کہ حضرات مہاجرین جو قریشی بھی ہیں اور غیر قریشی بھی اور حضرات انصار کو ان پر اقتدار حاصل ہے۔''

وتانفت نفوسهم منه و وافق ايام عثمان رضي الله عنه (ص ۱۳۸)

> ''ان کے نفوس اس اقتدار سے نفرت کرنے لگے اور اتفاق یہ ہوا کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت تھا۔''

عناصر فتنہ کی تنظیم اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق فرد جرم کی تصنیف:

فتنہ کا ایک عنصر مفتوحہ اقوام بالخصوص ایرانیوں کا جذبہ انتقام تھا جس کے تحت کارروائی ایرانیوں کی پہلی شکست کے بعد سے ہی شروع ہو گئی تھی۔

چنانچہ خاص اس وقت میں کہ شاہِ ایران یزدجرد اپنے مفتوحہ علاقوں کو واپس لینے کے لیے آخری بازی لگا رہا تھا اور اس کے لیے ڈیڑھ لاکھ فوج فراہم کر چکا تھا۔ دوسری طرف اس محاذ کے ذمہ دارِ اعلیٰ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اس کے مقابلہ کی تیاری کر رہے تھے۔ خاص اس نازک وقت میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک فتنہ اُٹھایا گیا اور بے بنیاد اور سراسر غلط شکایتوں کا میمورنڈم حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں پیش کیا گیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو خود حیرت ہوئی۔ آپ نے فرمایا اس نازک وقت میں یہ حرکت خود تمہارے برے ارادوں اور شرارتوں کی دلیل ہے۔ (البدایہ والنہایہ ص ۶ ج ۷)

اب آپ غور فرمایئے: کیا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ احساس صحیح نہیں تھا؟ کیا ایسے وقت میں یہ نہیں ہوتا کہ حریف کے کچھ آدمیوں کو آلہ کار بنا کر حریف کی صفوں میں رخنہ ڈالا جاتا ہے۔

شکایتی ڈیپوٹیشن لے جانے والے کیا مسلمانانِ کوفہ کی نمائندگی کر رہے تھے؟ اہل کوفہ کو تو کوئی شکایت نہیں تھی۔ جب تحقیقاتی کمیشن نے بیانات لیے تو صرف ایک کے علاوہ باقی تمام باشندگانِ کوفہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تعریف ہی کی، کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ شکایت کرنے والے شکست خوردہ ایرانیوں کے آلہ کار اور دورِ حاضر کی اصطلاح میں ''ففتھ کالمسٹ'' (پانچویں کالم) ہوں جو یزدجرد کے لیے کام کر رہے ہوں، قرائن کی واضح شہادت یہ ہے کہ یہ لوگ آلہ کار تھے۔

کچھ عرصہ بعد سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ شہید کیے گئے، ایک طبقہ کا احساس یہ تھا کہ یہ ایرانیوں کی ساز باز کا نتیجہ ہے۔ اسی احساس سے متاثر ہو کر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے منجھلے فرزند حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ہرمزان کو قتل کر دیا۔ (طبری ص ۴۱، ۴۲ ج ۵)

بصرہ میں ایک پارٹی تھی، آج کل کی اصطلاح میں ایک گینگ تھا جس کا سربراہ حکیم بن

جبلہ تھا، جب اسلامی لشکر اس طرف سے گزرتا تو حکیم بن جبلہ اور اس کے ساتھی خفیہ طور سے اس کے ساتھ ہو جاتے پھر جہاں موقع پاتے ذمیوں پر ڈاکے ڈالتے، فساد پھیلاتے، اس پارٹی کا ظہور اگرچہ کچھ عرصہ بعد یعنی خلافتِ عثمانی کے سالِ چہارم میں ہوا۔ (طبری ص ۹۰ ج ۴) مگر ظاہر ہے اس کا وجود پہلے سے قائم ہو چکا تھا۔ بہر حال یہ عناصر تھے اور موقع بموقع کام کر رہے تھے، مگر ان کے آپس میں کوئی تنظیم نہیں تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جہاں یہ اتفاق ہوا کہ بقول علامہ ابن خلدون قبائل بنو بکر وغیرہ کی رگِ جاہلیت پھڑکی اور قبائلی عصبیت کی چنگاریاں شعلہ بننے لگیں۔ ایسے ہی یہ بھی اتفاق ہوا کہ ان فتنہ پرور عناصر کو ایک لیڈر مل گیا، یہ لیڈر کون تھا، ہر ایک مؤرخ اس کو جانتا ہے۔ یہ عبداللہ بن سبا تھا جس نے جذبات کو تحریک کی شکل دی، تحریک کو منظم کیا۔ پھر اس طوفان کا دہانہ کھولا، جس کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ وہ تمام کتابیں جو بقول مودودی صاحب تاریخ اسلام کی معتبر کتابیں ہیں اس لیڈر کے تذکرے سے پر ہیں، کئی کئی اوراق میں اس کے رُسوائے عالم کارناموں کا تذکرہ ہے، ہم انہیں کتابوں سے اخذ کر کے اس لیڈر کا تعارف کراتے ہیں، پھر اس کے کچھ کارنامے درج کرتے ہیں۔

عبداللہ بن سبا

تعارف:

ایک یہودی تھا، باپ کا نام سبا، ماں ایک حبشن تھی اس لیے اس کو ''ابن السوداء'' بھی کہتے ہیں، یمن کے شہر صنعا کا رہنے والا تھا، خلافتِ عثمانی رضی اللہ عنہ کے ابتدائی سالوں میں مسلمان ہوا۔ (طبری ص ۶۸ ج ۵)

حرکت عمل:

مدینہ طیبہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، کسی منصب کے حاصل کرنے میں تو کامیاب نہیں ہو سکا۔ البتہ وہ کام پوری طرح مکمل کر لیا جو ایک سازشی کر سکتا

ہے۔(تفصیل آگے آئے گی انشاءاللہ) یہیں اس کو یہ علم بھی ہوا کہ بصرہ میں ایک پارٹی جس کے نظر بند رکھنے کا حکم بارگاہِ خلافت سے صادر ہو چکا ہے۔ یہ حکیم بن جبلہ کی پارٹی تھی جس کا ذکر ابھی گزر چکا ہے۔ ڈاکے ڈالنا اور چھاپے مارنا اس کا کام تھا۔ قبیلہ عبدالقیس کے کچھ آدمی بصرہ میں بھی رہا کرتے تھے۔ یہ انہی میں رہتا تھا۔ جب اس کی فساد انگیزی کی شکایتیں امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پہنچیں تو آپ نے حاکم کوفہ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ان کو بصرہ میں نظر بند کر دیں۔ جب تک ان کا چال چلن ٹھیک نہ ہو جائے، بصرہ سے باہر نہ جانے دیں۔ (طبری ص ۹۰ ج ۵)

عبداللہ بن سبا مدینہ سے روانہ ہوا بصرہ پہنچا اور اس پارٹی سے ساز باز شروع کر دی۔ اس پارٹی کے لوگوں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اس کی رپورٹ حاکم بصرہ کے پاس پہنچی۔ انہوں نے اس کو طلب فرمالیا۔ دریافت کیا تم کون ہو۔ اس نے کہا کہ میں اہل کتاب میں سے تھا، مجھے اسلام اچھا معلوم ہوا میں نے اسلام قبول کر لیا۔ حاکم بصرہ عبداللہ بن عامر نے وہ شکایتیں سنائیں جن کی رپورٹ پہنچی تھی۔ عبداللہ بن سبا کوئی معقول جواب نہ دے سکا تو آپ نے اس کو بصرہ چھوڑ دینے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ یہ بصرہ سے نکلا اور کوفہ پہنچ گیا۔ (طبری ص ۹۰ ج ۵)

ظاہر ہے اپنے اثرات اس گینگ اور پارٹی کے لوگوں میں بھی چھوڑ گیا اور عبدالقیس کے لوگوں میں بھی جن کے یہاں حکیم بن جبلہ رہا کرتا تھا۔

عبداللہ بن سبا کوفہ پہنچا۔ یہاں کچھ شورہ پشت وہ تھے جنہوں نے ابن الحیسمان الخزاعی کو رات کے وقت اس کے گھر میں گھس کر قتل کیا تھا اور جب یہ قاتل قصاص میں قتل کیے گئے تو ان کے وارث حاکم کوفہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے دشمن ہو گئے تھے اور وہ تمام حرکتیں شروع کر دی تھیں جن کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ولید مجرم گردان کر امارتِ کوفہ سے معزول کیے گئے۔ ان کے علاوہ قبیلہ عبدالقیس اور ان قبائل کے آدمی بھی تھے جن کو اپنی عظمت پر ناز تھا اور اب ان کو نہ صرف قریش بلکہ حضراتِ صحابہ کی عظمت بھی ناگوار ہونے لگی۔ عبداللہ بن سبا نے ایسے لوگوں میں اپنا کام شروع کر دیا۔

کوفہ سے روانہ ہو کر یہ شام گیا۔ یہاں اس کو کوئی ایسی پارٹی تو نہیں ملی۔ البتہ اکتناز

دولت کے بارے میں اختلاف حضرت معاویہ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما کے درمیان چل رہا تھا۔ اس کو خوب ہوا دی اور کوشش کی کہ اس کو ایک تحریک کی شکل دے دے لیکن گورنرِ شام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حسن تدبیر نے کسی تحریک کے اُبھرنے کا موقع نہیں دیا اور یہی ان کا سب سے بڑا جرم تھا، جس کی وجہ سے ان کو سب سے زیادہ مطعون کیا گیا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ تاریخ ابن جریر، تاریخ الکامل لابن اثیر، ابن خلدون وغیرہ) شام میں کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو یہ مصر پہنچا۔ وہاں ایسے عناصر موجود تھے جو اس کا دست و بازو بن سکتے تھے۔ لہٰذا مصر ہی کو مرکز بنالیا۔ بذریعہ مراسلات وخط و کتابت پارٹی کے افراد سے رابطہ رکھا اور اس کو مضبوط کیا۔ (تاریخ طبری ص ۹۰ ج ۵ ابن خلدون وغیرہ)

تالیف وترتیب نظریات ومطالبات:

عبداللہ بن سبا اور اس کے مشیروں کا اپنی پارٹی کے حق میں بنیادی کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے کچھ نظریات مرتب کیے۔ پھر موقع بموقع ان میں مطالبات کا اضافہ کیا جاتا رہا۔ نظریات ایسے مرتب کیے جو خاص طور پر ان دماغوں کو متاثر اور ان ذہنوں کو اپیل کرنے والے تھے جن کو اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کا صدمہ تھا اور کوئی بھی تحریک جس میں بازیابیٔ اقتدار کی توقع ہو۔ (ورنہ کم از کم یہ توقع ہو کہ اس سے فاتح قوم کا شیرازہ منتشر ہوسکتا ہے اور جو ان کو تباہ کرنے والے ہیں وہ خود بھی تباہ ہو سکتے ہیں) ان کو اپنی طرف کھینچ سکتی تھی۔

عربوں میں بادشاہت نہیں رہی تھی، وہ طبعی طور پر شاہ پرست نہیں تھے۔ یہ تصور ان کی افتادِ طبع سے منزلوں دور تھا کہ پورا ملک کسی ایک خاندان کی ملک ہوسکتا ہے اور اس ملکیت میں وراثت چل سکتی ہے کہ بادشاہ کی اولاد ہی وارث تخت و تاج ہو اور جو اس کو تخت و تاج سے محروم کرے وہ ایسا ہی ظالم اور غاصب قرار دیا جائے جیسے کسی باپ کے ترکہ سے اس کی اولاد کو محروم رکھنے والا۔

لیکن یہ تصورات ایرانیوں کی فطرت اور ان کی ذہنیت کے عین مطابق تھے۔ ایران اپنی ملکی تاریخ کی ابتداء سے شاہ پرست رہا تھا۔ کئی صدیوں سے ایک ہی خاندان وہاں بادشاہت کرتا چلا آرہا تھا۔ وہ خدا کی خدائی کی طرح ملک کے لیے بادشاہت کو بھی ضروری کہتے تھے اور

وہ وارث کا پیدائشی حق سمجھتے تھے کہ وہ مورث کے حقوق اور اقتدار کا مالک ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ سوال اُٹھا تھا کہ جو جائیدادیں وحی الٰہی کی تصریح کے بموجب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص کردی گئی ہیں وہ وارثوں کو تقسیم کی جائیں مگر جب یہ سمجھا گیا کہ انبیاء علیہم السلام کی وارث پوری اُمت ہوتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپ کا ترکہ پوری اُمت کے لیے صدقہ (وقف) ہوگا تو ترکہ اور ورثہ کا سوال تو ختم ہوگیا تھا البتہ یہ بات تسلیم کرلی گئی تھی کہ سیّدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث اس وقف کے متولی ہوں۔ چنانچہ سیّدنا حضرت عباس اور سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہما کو ان جائیدادوں کا متولی بنا دیا گیا تھا۔ اس پارٹی نے اس مردہ سوال کو پھر زندہ کیا۔ اس پر یہ اضافہ اور کردیا کہ وارثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ لہٰذا جانشین رسول اللہ اور خلیفہ اوّل انہیں کو ہونا چاہیے تھا۔ مستزاد یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا وصی بنا دیا تھا اور یہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا ظلم تھا کہ انہوں نے اصل وارثوں کو محروم کر کے خلافت پر قبضہ کرلیا۔ لہٰذا سلسلہ خلافت کی جب بنیاد ہی غلط ہے تو موجود خلیفہ کی خلافت بھی غلط ہے اور اس کے مقرر کردہ حکام اور گورنر بھی غلط۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تقاضا ہے کہ ان کی مخالفت کی جائے۔ (طبری ص ۹۸ ج ۵)

عبداللہ بن سبا اور اس کی پارٹی کا مقصد صرف نظامِ خلافت کو برباد کرنا نہیں تھا۔ بلکہ اس کا اصل منشاء اسلام تھا۔ چنانچہ وراثت اور وصیت کے نظریہ کے ساتھ ایک نظریہ رجعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایجاد کیا۔ کہتا تھا کہ تعجب ہے مسلمان اس کے تو قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں آئیں گے اور اس کو نہیں مانتے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوبارہ دنیا میں آئیں گے۔ حالانکہ قرآنِ حکیم اس کی شہادت دے رہا ہے اس شہادت میں وہ آیت قرآن اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَادُّکَ اِلٰی مَعَاد کی من مانی تفسیر لوگوں کے سامنے پیش کیا کرتا تھا۔

زہد وتقویٰ کے مظاہرہ کے ساتھ جب قرآن پاک کا حوالہ دے کر کوئی بات بیان کی جاتی تھی تو اس کا اثر لازمی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ (ایضاً ص ۹۸ ج ۵)

تحریف دین کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ صحابہ کرام بالخصوص حضراتِ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی عظمت سے دلوں کے گوشوں کو خالی کیا جائے۔ کیونکہ دین صرف نظریات کا نام نہیں ہے۔ دین کا پہلا کام اصلاحِ عمل ہے یہ بات کہ ہمارا عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش فرمودہ دین کے مطابق ہے یا نہیں ہے۔ اس کا معیار حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرز عمل ہے۔ چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تھا کہ اُمت کے تہتر فرقوں میں سے ہم کس فرقہ کو سمجھیں کہ حق پر ہے تو سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ تھا۔ **ما انا علیہ و اصحابی** (ترمذی شریف ص ۸۹ ج ۲) جس پر میں ہوں اور میرے اصحاب۔ پھر بہت ہی تاکید کے ساتھ ہدایت فرمائی تھی کہ تمہارا فرض یہ ہے کہ میری سنت کو مضبوطی سے سنبھالو اور ان خلفاء کی سنت کو جو راشد (صالح) اور مہدی (ہدایت یافتہ) ہیں اس کو دانتوں کی کیچلیوں سے مضبوط پکڑ لو۔ (صحاح)

بہرحال تحریف دین کا مقصد جب ہی کامیاب ہوسکتا تھا کہ مسلمان حضراتِ صحابہ کو ہدف بنائیں۔ حضراتِ شیخین سیّدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما وفات پا چکے تھے۔ خلیفہ ثالث موجود تھے۔ لہٰذا سب سے پہلے ان کو نشانہ بنایا گیا۔ ان دشمنانِ دین کو احادیث وضع کرنے اور گھڑنے میں کیا خوف ہوسکتا تھا۔ چنانچہ حضراتِ شیخین (رضی اللہ عنہما) کے متعلق بے شمار حدیثیں گھڑی گئیں اور ان کو اس طرح خلط ملط کیا گیا کہ بہت سی وہ چیزیں کافی چھان بین کے بعد بھی اب تک صاف نہیں ہوسکیں جو صحابہ کرام، حضراتِ خلفائے راشدین اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کے متعلق ہیں۔

ان نظریات کی تدوین واشاعت کے ساتھ اقتدار قریش کا مسئلہ بھی اُبھارا گیا۔ عراق ان کا ہے جنہوں نے عراق کو فتح کیا۔ قریش کو یہ حق نہیں کہ وہ سواد عراق کو اپنا بستان کہیں۔

اس مسئلہ نے اتنی شدت اختیار کی کہ خطرہ ہوا کہ اہل عراق یعنی قبائل بنی بکر و عبدالقیس و بنی ازد وغیرہ کے لوگ قریش کی ان جائیدادوں پر غاصبانہ قبضہ کرلیں گے جو عراق کے مختلف علاقوں میں تھیں۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قریش کو ہدایت کی کہ ان جائیدادوں کو فروخت کردیں یا تبادلہ کرلیں۔

مختصر یہ کہ عبداللہ بن سبا اور اس کے مشیر کاروں نے مدینہ میں کچھ قیام کر کے حالات کا جائزہ لے کر نظامِ اسلام کو درہم برہم کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ اس کی پہلی اشاعت گاہ بصرہ تھا، پھر کوفہ، پھر مصر۔

حکومتِ مصر عیسائی طاقتوں کی مقابلہ میں مصروف تھی، عبداللہ بن سبا کی خفیہ کارروائیوں کی طرف توجہ نہیں دے سکی۔ وہاں کچھ ایسے بارسوخ اور متعارف لوگوں کی حمایت بھی اس کو میسر آ گئی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قرابت رکھنے کے باوجود کسی منصب کو حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے اور اس لیے کہ ان کو حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ سے ذاتی پرخاش تھی۔ (تفصیل آگے آئے گی۔ انشاءاللہ)

لہٰذا اس تحریک نے وہاں اپنی جڑیں اتنی مضبوط کرلیں کہ آئندہ تخریبی کارروائیوں کے لیے مصر ہی مرکز بن گیا۔ یہیں سے عبداللہ بن سبا نے تحریری پروپیگنڈہ شروع کیا۔ (تفصیل آگے آئے گی۔ انشاءاللہ)

طریق کار:

سیّدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے خلاف جو شکایتیں فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو پہنچائی گئیں اس وقت تک عبداللہ بن سبا کا ظہور نہیں ہوا تھا، لیکن طریق کار کی یکسانیت شہادت دے رہی ہے کہ عبداللہ بن سبا کی پشت پر کچھ ایسے ہاتھ تھے جو پہلے سے مصروفِ کار تھے۔ خلیفہ کی ذات کو مجروح کرنے سے پہلے مقامی ذمہ دار (گورنر) کو مجروح کرنا اور اس کے خلاف شکایتوں کا طوفان اُٹھانا، اس طریق کار کا حاصل تھا۔ کوفہ میں سیّدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بعد اس کا نشانہ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ بنے۔ پھر حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ، بصرہ میں سیّدنا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اس کا نشانہ بنایا گیا اور اب بقول علامہ ابن جریر طبری ۳۵ھ میں یہ طے کیا گیا کہ ہر جگہ کے حاکم اعلیٰ کے متعلق شکایتیں لکھ کر خلیفہ کو بھی بھیجی جائیں اور دوسرے شہر کے لوگوں کو بھی، ایک شہر والے اپنے حاکم کی فرضی اور جھوٹی خرابی لکھ کر دوسرے شہر والوں کے پاس بھیجتے۔ جب یہ لوگ یہ خبر نامہ پڑھتے تو کہتے کہ خدا کا شکر ہے۔ ہماری یہاں تو یہ خرابیاں نہیں ہیں۔ ہمیں عافیت میسر ہے۔

افسوس یہ لوگ بہت پریشان ہیں۔ان پر بہت زیادتی ہو رہی ہے۔

اس طرح کے خبر ناموں نے (دارالخلافہ) مدینہ منورہ کی فضا میں بھی بے چینی پیدا کر دی اور ہر ایک شہر کو کارکنانِ حکومت کے مظالم کے شور سے پر آشوب کر دیا۔یعنی ''پر'' کا ''کوا'' نہیں بنایا گیا۔ کیونکہ پر کوئی تھا ہی نہیں بلکہ بے بنیاد شکایت تصنیف کی گئی۔اس شہر میں اس تصنیف کا پول کھل جاتا۔لہٰذا اس شکایت کا خبر نامہ دوسرے شہر میں بھیجا گیا۔وہاں اس کو سنایا گیا اور عوام کے ذہن نشین کرایا گیا کہ حکام بہت ظلم کر رہے ہیں۔(طبری ص ۹۸ ج ۵)

اس طرح کے خطوط اہل مدینہ کے پاس بھی بھیجے جاتے تھے تا کہ اہل مدینہ عمال سے برگشتہ ہوں اور اگر خلیفہ توجہ نہ دیں تو ان کو بھی پست ہمت، خویش نواز کہہ کر مجروح کیا جائے اور ان کے احترام کو ختم کیا جائے۔ دوسری طرف اہل مدینہ کی طرف سے خطوط بھیجے جاتے جن میں خلیفہ کی شکایت کی جاتی اور یہ کہ حالت بہت خراب ہے، بہت اصلاح کی ضرورت ہے۔

واقدی کی روایت ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے مدینہ طیبہ سے ان صحابہ کے نام خطوط بھیجے گئے جو جہادی خدمات میں مصروف تھے۔

اقدموا ان کنتم تریدون الجهاد فعندنا الجهاد

''جہاد کرنا چاہتے ہو تو یہاں آؤ جہاد یہاں ہے''۔(تاریخ طبری ص ۹۶ ج ۵)

دورِ حاضر کے ماہرین سیاست بھی شاید اس طرح کے پروپیگنڈے کی جرأت نہ کر سکیں کہ اصل مقام پر شکایت کا وجود نہیں اور دوسرے مقامات ان شکایتوں کی ہیجان انگیز افسانوں سے پر آشوب۔ یہی وقت تھا جب سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق فردِ جرم تیار کی گئی۔ابن خلدون نے مندرجہ ذیل الزامات درج کیے ہیں لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ایک تقریر آئندہ درج کی جائے گی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اور الزامات بھی تھے جو لگائے گئے تھے۔

(۱) سیّدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو شام سے نکال کر مدینہ پھر مدینہ سے نکال کر ربذہ پہنچا دیا۔ جہاں وہ تنہا زندگی گزار رہے ہیں۔

(۲) جمعہ کے روز ایک اور اذان کا اضافہ کر دیا۔

(۳) منیٰ اور عرفہ میں ظہر و عصر اور عشاء کی دو رکعتیں پڑھی جاتی تھیں یعنی قصر

کیا جاتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار چار رکعتیں پڑھیں۔

دو، تین علمی مسائل ہیں، اجتہاد و استنباط سے ان کا تعلق ہے، چنانچہ حضرات اہل علم نے علمی حیثیت ہی میں بحث کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی انداز سے جوابات دیے۔ اس بحث کے دلائل سے جو فریقین نے پیش کیے علماء نے بہت سے مسائل اخذ کیے۔ مگر عوام ان نکتوں سے کہاں واقف ہو سکتے تھے۔ وہ تو یہی سمجھ سکتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کچھ نئی باتیں ایجاد کیں۔ لہٰذا یہ قابل عظمت نہیں بلکہ ان کو معزول کرنا وقت کا سب سے زیادہ ضروری اور سب سے اہم مطالبہ ہے۔

(۴) مروان کو افریقہ میں خمس (پانچواں حصہ) بلا مشورہ دے دیا۔

(۵) خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری مبارک کنوئیں میں کیوں گری۔

(ابن خلدون ص ۱۴۶)

مدینہ منورہ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ایک کنواں تھا۔ اس کو ''بیر اریس'' کہا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کنوئیں کی من پر تشریف فرما تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری مبارک جو سرکاری دستاویزوں پر لگائی جاتی تھی، آپ کے ہاتھ میں تھی وہ مہر اتفاق سے کنوئیں میں گر گئی۔ پھر کنوئیں کی مٹی تک نکلوادی گئی۔ مگر انگشتری مبارک دستیاب نہیں ہوئی۔ یہ اتفاقی حادثہ بھی سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جرائم میں شمار کرایا گیا۔

(ابن خلدون ص ۱۳۹ و ۱۴۰ ج ۲)

شکایتوں کی تحقیق:

بہر حال مذکورہ بالا طے کردہ طریق کار کے بموجب والیان صوبہ کے خلاف تصنیف کردہ شکایتوں کی گونج خلیفہ سوم کی سمع مبارک تک پہنچی تو آپ نے ملک کے ہر حصہ میں مشاہدین روانہ فرمائے جو مقامی حالات، عوام کے رجحانات اور ان شکایتوں کے متعلق تحقیق کریں۔ طبری اور ابن اثیر نے ان میں سے چار کے نام لکھے ہیں۔

سیّدنا محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ، سیّدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو بصرہ، سیّدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو شام، سیّدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو مصر (الکامل لابن اثیر جلد ۳ ص ۷۸ و طبری ص ۹۹ ج ۵)

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے علاوہ باقی سب حضرات نے واپس آ کر رپورٹ دی۔

ما انکرنا شیئًا ولا انکره اعلام المسلمین ولا عوامهم وقالوا جمیعا الامر امر المسلمین الا ان امراء هم یقسطون بینهم ویقومون علیهم. (طبری، ج۵، ص۹۹ و ابن اثیر ج۲ ص۷۸)

''ہم نے کوئی غیر معمولی بات دیکھی نہ مسلم عمائدین اور عام مسلمان کوئی غیر معمولی بات محسوس کرتے ہیں جس طرح مسلمانوں کا کام ہونا چاہیے اسی طرح کام ہو رہا ہے مگر ان کے امراء کچھ زیادتی کرتے ہیں اور نگرانی کڑی رکھتے ہیں''۔

نوٹ: قسط بینھم کے معنی تو یہ ہونے چاہئیں کہ انصاف سے کام لیتے ہیں مگر لفظ ''الا'' کی مناسبت سے ہم نے ''قسط بینھم'' کے معنی وہ لیے ہیں جو قسط علیھم کے ہونے چاہئیں۔ کچھ حضرات نے اس کے یہ معنی بھی بیان کیے ہیں کہ صرف یہ بات ہے کہ ان کے امراء انصاف کرتے ہیں اور ان کا خیال رکھتے ہیں۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی واپسی کا انتظار ہو رہا تھا کہ والیٔ مصر حضرت عبداللہ بن سعد ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے اطلاع دی۔

''عبداللہ بن السوداء (عبداللہ بن سبا) خالد بن ملجم، سودان بن حمران اور کنانہ بن بشر جو مصر میں ٹھہرے ہوئے ہیں انہوں نے حضرت عمار کو ملا لیا ہے۔ حضرت عمار ان سے مل گئے ہیں اور ان کے ساتھ رہنے لگے ہیں۔'' (طبری ص۹۹ ج۵)

حافظ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ۳۵ھ کا واقعہ قرار دیا ہے یعنی جیسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حج بیت اللہ شریف سے واپس ہوئے لوگوں کی شکایتیں پہنچیں جن کی بنا پر آپ نے مشاہدین کو بھیجا اور رپورٹ حاصل کی۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس وقت تک خویش پروری اور اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کرنے کی کوئی شکایت نہیں ہے۔

مراسلہ اور اجتماع:

جیسے ہی رپورٹ پہنچی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک گشتی مراسلہ جملہ حکام اور امراء کے نام بھیجا۔

اما بعد فانی اخذا العمال بملاقاتی فی کل موسم وقد سلطت الامة منذ ولیت الامر بالمعروف والنھی عن المنکر فلا یرفع علٰی شئ ولا علیّ احد من عما لی الا اعطیته ولیس لی ولعیالی حق قبل الرعیة الا متروک لھم وقد رفع الی اھل المدینة ان اقواما یشتمون فاخرون یضربون فیا من ضرب سرّ او شتم سرّا ومن اوغی شیئا من ذالک فلیواف بالموسم فلیاخذ بحقه حیث کان منی او من عما لی او تصد قوا فان الله یجزی المتصدقین (طبری ج۵ (۹۹ء)

''ہر سال حج کے موقع پر کار پردازانِ حکومت سے میری ملاقات ہوتی ہے، تو میں ان سے مواخذہ کیا کرتا ہوں۔ میں جب سے خلیفہ بنایا گیا ہوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مسلط کرتا ہوں (اور اس کو غالب رکھتا ہوں) پس مجھ پر یا مرے کسی عامل پر جو مطالبہ بھی لازم کیا جاتا ہے میں اس کو ادا کر دیتا ہوں۔ یہ اس حالت میں کہ میرا اور میرے عیال کا عوام کی جانب جو بھی حق ہے وہ ان کے حق میں چھوٹا ہوا ہے۔ (معاف ہے)۔

اہل مدینہ نے مجھے یہ شکایت پہنچائی ہے کہ کچھ لوگ ہیں جن کو گالیاں دی جاتی ہیں اور کچھ ہیں جن کو خفیہ طور سے مارا پیٹا جاتا ہے۔ پس جس شخص کو بھی خفیہ طور پر پیٹا گیا ہو (جس کے گواہ نہ ہوں) یا پوشیدہ طور پر اس کو گالی دی گئی ہو، ہر ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ حج کے موقع پر آئے، مجھ سے ملاقات کرے اور اپنا حق لے لے، وہ مجھ پر لازم ہو یا مرے کسی عامل پر، یا صدقہ کر کے معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو جزائے خیر عطا فرماتا ہے۔''

تین آدمی محمد طلحہ اور عطیہ جو اس کے راوی ہیں وہ بیان کرتے ہیں۔

فلما قری بالامصارا بکی الناس ودعو العثمان وقالوا ان الامۃ لتمحض بشر.

''جب یہ گشتی مراسلہ شہروں میں پہنچا اور لوگوں کو پڑھ کر سنایا گیا تو اس نے لوگوں کو رُلا دیا۔ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دعا دیتے تھے اور کہتے تھے کہ افسوس لوگ خالص (نری) شرارت پر اُتر آئے ہیں۔''

(طبری ص۹۹ ج۵)

سیّدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ نے گشتی مراسلہ پر ہی کفایت نہیں کی بلکہ امراء اجناد (صوبوں کے گورنروں) کو بھی طلب فرمایا۔

سبائیوں کا اجتماع اور منصوبہ:

سبائیوں کو معلوم ہوا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے صوبائی امراء کو طلب کیا ہے اور یہ امراء وہاں جائیں گے تو مصر کے مرکز سے کوفہ اور بصرہ کی پارٹیوں اور اپنے تمام ہم نواؤں کو لکھا گیا: یہ امراء مدینہ جا رہے ہیں، ان کے دارالحکومت خالی ہوں گے، ایک دن مقرر کر کے سب جگہ بغاوت کر دو، پھر ان امراء کو اپنے مرکزوں تک نہ پہنچنے دو، لیکن اس منصوبہ پر صرف کوفہ میں کچھ عمل ہو سکا، جب کہ یہاں کے امیر حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ مدینہ گئے ہوئے تھے تو یزید بن قیس کوفہ کے عوام کا ایک انبوہ لے کر کوفہ سے روانہ ہو گیا۔ ارادہ یہ تھا کہ مدینہ پہنچ کر خلیفہ سے مطالبہ کریں کہ وہ معزول ہو جائیں لیکن یہاں کے افسر افواج قعقاع بن عمرو (کمانڈر انچیف) کو پتہ چل گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر یزید بن قیس اور اس کی عوامی فوج کا محاصرہ کر لیا۔ یزید بن قیس کو محسوس ہوا کہ عزلِ خلیفہ کا منصوبہ اس وقت کامیاب نہیں ہو سکتا تو قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ وہ خلیفہ کے پورے وفادار ہیں۔ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کے یہاں کا گورنر سعید بن العاص یہاں سے ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ حضرتِ قعقاع نے اس کو چھوڑ دیا۔ پھر ان لوگوں نے مقامِ جرعہ پر جمع ہو کر حضرت سعید رضی اللہ عنہ کا راستہ روک لیا اور ان کو مدینہ واپس ہونے پر مجبور کیا۔ (طبری ص۱۰۱ و ۱۰۲ ج۵)

بارگاہِ عثمانی میں امراء اجناد (گورنر دربارِ خلافت میں):

امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین سیّدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی طلب پر گورنر شام حضرت معاویہ، گورنر مصر حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، گورنر کوفہ حضرت سعید بن العاص، گورنر بصرہ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہم مدینہ طیبہ پہنچے۔ آپ نے مصر کے سابق گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بھی مشورہ میں شریک کیا۔ آپ نے فرمایا:

ویحکم ما ھذہ الشکایة وما ھذہ الا ذاعه انی واللہ لخائف ان تکونوا مصدوقا علیکم وما یعصب ھذا الابی (طبری ص۹۹ ج۵)

"یہ کیا شکایتیں پہنچ رہی ہیں، یہ کیا پروپیگنڈہ ہو رہا ہے مجھے خدشہ ہے کہ یہ شکایتیں صحیح ہوں اور تم پر ان کی ذمہ داری آتی ہو، نتیجہ یہی ہوگا کہ لوگ مجھ پر نرغہ کر کے آئیں گے۔"

والیانِ مملکت نے عرض کیا:

کیا آپ نے مشاہدین کو نہیں بھیجا تھا؟ کیا ہم نے خود آپ تک لوگوں کے حالات نہیں پہنچائے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آپ کے مشاہدین گئے اور کسی نے بھی ان کے سامنے کوئی بات نہیں کی، (کوئی شکایت نہیں کی) جو لوگ آپ سے شکایتیں کرتے ہیں قسم بخدا وہ سچ نہیں بولتے اور نہ وہ کوئی بھلائی کا کام کرتے ہیں، یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، ہمارے علم میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، آپ کوئی ایک بات لے لیجیے، تحقیقات کیجیے یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی واقعیت آپ کے سامنے آ جائے، یہ جو کچھ ہے سراسر پروپیگنڈہ ہے۔ آپ کے لیے درست نہیں ہے کہ اس کی بنا پر آپ کسی کی گرفت کریں اور نہ یہ درست ہے کہ آپ اس کو آخری بات سمجھیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اب مجھے مشورہ دو میں کیا کروں۔ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا "یہ سب جعل اور سازش ہے۔ باتیں راز میں طے کی جاتی ہیں۔ ان کو واقف لوگوں کے سامنے رکھا جاتا ہے، وہ دوسروں کو اس کی خبر دیتے ہیں پھر مجلسوں میں انکے چرچے ہونے لگتے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اس کا کیا علاج؟

حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ سازش کرنے والوں کا پتہ لگائیے جو مجرم ثابت ہوں ان کو موت کی سزا دیجیے۔

حضرت عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ والی مصر نے عرض کیا۔ ''جب آپ لوگوں کو ان کے حقوق ادا کر رہے ہیں تو ان کو ڈھیلا نہ چھوڑیے، حق وفا جو ان پر لازم ہے سختی سے اس کا مطالبہ کیجیے۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ: آپ نے حکومت میرے سپرد کی۔ آپ نے ایک ایسی قوم کا مجھے حاکم بنا رکھا ہے کہ اس کی طرف سے آپ کو خیر ہی پہنچے گی۔ (کوئی شر نہیں پہنچے گا) وہ آپ کی خیر خواہ و وفادار ہی رہے گی۔ میرے علاقہ کی بات تو یہی ہے باقی یہ دونوں صاحبان اپنے علاقہ کے حالات سے زیادہ واقف ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ ان علاقوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''حسن الادب'' ان کی صحیح تربیت ہونی چاہیے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص سے فرمایا۔ آپ اپنی رائے ظاہر فرمائیں۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ: جناب والا! آپ ان کے حق میں بہت نرمی برتتے ہیں۔ مواخذہ میں تاخیر سے کام لیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو جو حیثیت دے رکھی تھی آپ نے ان کو اس سے بڑھا دیا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے دونوں پیشرو ساتھیوں کا طریقہ اختیار کیجیے۔ سختی کی جگہ سختی اور نرمی کی جگہ نرمی برتیے جو شخص شرارت پھیلانے میں کوتاہی نہیں کرتا، دوسروں کو شر بھی پہنچاتا ہے اس کے لیے سختی مناسب ہے اور جو لوگوں کا خیر خواہ ہو دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے میں کوتاہی نہ کرے وہ نرمی کا مستحق ہے۔ آپ نے دونوں کے لیے نرمی کا بستر ہی بچھایا۔ (طبری ص ۱۰۰ ج ۵)

جوابات کے الفاظ اور مفہوم میں کمی بیشی ہے۔ مثلاً یہ بھی روایت ہے کہ گورنر بصرہ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ کسی ملک پر فوج کشی کر کے ان کو

جہاد میں مشغول کر دیجیے۔ حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح والی مصر نے یہ بھی فرمایا کہ یہ لوگ دولت کے بھوکے ہیں۔ ان کو عطا اور بخشش سے نوازیئے۔ یہ سب آپ کے ہو جائیں گے۔ (طبری ص ۹۴ ج ۵)

بہر حال صوبائی حکومتوں کے ان ذمہ داروں نے اپنی اپنی رائے آزادی سے پیش فرمائی مگر آئندہ کے لیے کوئی لائحہ عمل طے نہیں ہوا کیونکہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے میں اس کا وقت گزر چکا تھا۔ اب اگر ہو سکتا تھا تو یہ کہ فوجی طرز کی حکومت قائم کی جائے اور جس پر شبہ ہو اس کو گرفتار کر کے سزا دی جائے۔ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تقویٰ اس غیر محتاط طرز حکومت کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ آپ نے اپنی قربانی منظور کی، مگر یہ گوارا نہ کیا کہ آپ کے سلسلہ میں کسی کے خون کا کوئی قطرہ بھی زمین پر گر سکے۔

اس وقت ان حضرات کے جواب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو تقریر کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان صوبائی امراء اور گورنروں سے زیادہ آپ کو حالات کا علم تھا اور ان حالات کے متعلق آپ کا مطالعہ بہت کافی گہرا تھا۔ ان امراء کے بیانات میں قدر مشترک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرم پالیسی پر تنقید تھی۔ رشتہ داروں کے ساتھ نہیں بلکہ عام کار پردازان حکومت اور عام قومی رہنماؤں اور کارکنوں کے بارے میں۔ اس سلسلہ میں یہ بھی کہا گیا کہ آپ حضرت صدیق اکبر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کا طریق عمل اختیار کیجیے۔ مگر ان تنقید کرنے والوں نے یہ نہیں خیال کیا کہ عوام کے حالات میں کس قدر تبدیلی ہو چکی ہے۔ جب بے قصور کو قصوروار قرار دے کر بغاوت کا منصوبہ بنایا جائے تو اگر کوئی قصور ہو تو بغاوت کے لیے کسی منصوبہ کی ضرورت بھی نہ ہوگی یہ خلیفہ کی نہیں بلکہ حالاتِ عوام کی تبدیلی تھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے درہ کو بڑے سے بڑا شخص برداشت کر لیتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرم بات کا بھی جواب سخت ہوتا تھا۔ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک تقریر میں یہ شکایت فرمائی تھی۔

(طبری ج ۵ ص ۹۷)

سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جواب:

امراء صوبجات کی تقریریں سننے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خطبہ مسنونہ

پڑھا۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی۔ پھر فرمایا:

''آپ صاحبان نے جن خیالات کا اظہار کیا اور جو مشورے دیے ان سب پر میں نے غور کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر ایک معاملہ کا دروازہ ہوتا ہے۔ اسی دروازہ سے اس تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ معاملہ اور یہ حادثہ جس کا خطرہ ہے پیش آ کر رہے گا۔ اس کا وہ دروازہ جس پر تالہ پڑا ہوا تھا، جس کی وجہ سے حدودِ الٰہیہ کے علاوہ اور معاملات میں نرمی، موافقت اور یکجہتی حاصل کر لی جاتی تھی، بہت جلد یہ دروازہ کھل جائے گا۔ اس کا تالہ ٹوٹ جائے گا۔ میرے خلاف کوئی صحیح حجت، کوئی معقول دلیل کسی کے پاس بھی نہیں ہے جو پیش کر سکے۔''

اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ میں نے لوگوں کے ساتھ اور خود اپنے آپ کے ساتھ خیر اور بھلائی میں کوتاہی نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ فتنہ کی چکی گردش میں آنے والی ہے۔ عثمان مستحق مبارکباد ہوگا، اگر وہ اس حالت میں مر جائے کہ اس کی چکی کو گردش میں لانے میں اس کا کوئی حصہ نہ ہو۔ (یہی جذبہ تھا جس کی وجہ سے آپ نے اپنے تمام جان نثاروں اور فداکاروں کو سخت تاکید کر دی کہ آپ کی طرف سے کوئی مدافعت نہ کرے۔ یعنی خون ریزی کے آغاز میں آپ کا یا آپ کے کسی متوسل و منتسب کا کوئی حصہ نہ ہونا چاہیے۔''

سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سلسلہ خطاب جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

''لوگوں کو اعتراض کرنے کا موقع مت دو۔ کوئی صحیح الزام تم پر نہ آنا چاہیے۔ لوگوں کے حقوق تسلیم کرو اور ان کو ادا کرو اور درگزر سے کام لیتے رہو۔ ہاں اللہ کے حقوق میں اگر لین دین شروع ہو جائے تو اس میں مداہنت نہ برتو (کمزوری نہ دکھاؤ)۔ (طبری ص ۹۹ ج ۵ وص ۱۰۰)

سبائیوں کا پہلا اقدام اور اس کا جواب:

وہ منصوبہ کہ جب گورنر صاحبان مدینہ منورہ جائیں تو بغاوت کر کے ان کی واپسی کو ناممکن

بنا دیا جائے، کوفہ کے علاوہ اور کسی جگہ کامیاب نہیں ہوا، تو اب خط و کتابت کے ذریعے یہ طے کیا گیا کہ تینوں مرکزوں کے کچھ نمائندے مدینہ منورہ پہنچیں۔ خود مدینہ والوں کے خیالات و رجحانات کا بھی اندازہ لگائیں اور امر بالمعروف کی قسم کے (اصلاحی) مطالبات رکھیں۔ مطالبات تسلیم نہیں ہوں گے، تو پروپیگنڈے کا موقع ملے گا۔ چنانچہ تحریک کے خاص خاص ارکان مدینہ منورہ پہنچے۔ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو علم ہوا تو آپ نے دو آدمی مقرر کر دیے کہ ان کے نظریات اور ان کے آئندہ پروگرام کا پتہ لگائیں۔ ان صاحبان نے ان میں گھل مل کر ان کے منصوبہ کا پتہ لگالیا منصوبہ یہ تھا:

نرید ان نذکرله اشیاء قد زرعناها فی قلوب الناس ثم نرجع الیهم فنزعم لهم انا قررناه بها فلم یخرج منها ولم یتب ثم نخرج کا ناحجاج حتّی نقدم فنحیط به ننخلعه فان ابی قتلناه و کانت ایاها

''ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم خلیفہ سے ان باتوں کا تذکرہ کریں جن کو ہم نے لوگوں کے دلوں میں بویا ہے (جن کا پروپیگنڈہ کر کے لوگوں کے ذہنوں میں جمایا ہے) پھر ہم واپس ہو کر عوام کے پاس پہنچیں اور ہم ان سے کہیں کہ ہم نے سب کچھ ان سے کہا سب کچھ ثابت کر دیا۔ نہ وہ جواب دے کر الزمات سے نکل سکے اور نہ (آئندہ کے لیے) توبہ کی۔ اس کے بعد ہم اپنے اپنے مقامات سے حاجی بن کر نکلیں گے۔ یہاں تک کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچ کر ان کا محاصرہ کرلیں گے اور ان کو خلافت سے الگ کر دیں گے اور اگر چون و چرا کریں گے تو ان کو قتل کر دیں گے۔ (یہی ہو کر رہا)۔'' (طبری ص ۱۰۲ ج ۵)

ان صاحبان نے دریافت کیا کہ کیا کچھ مدینے والے بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔ جواب دیا گیا تین آدمی ؎ محمد بن ابی بکر، محمد بن ابی حذیفہ، عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ)۔

سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں واپس آ کر ان صاحبان نے رپورٹ پیش کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پہلے تو ہنسے۔ پھر آپ نے فرمایا اے اللہ! ان لوگوں کو

سلامت روی کی توفیق دے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ افتراق پیدا کر دیں گے۔ پھر فرمایا[6] حضرت عمار تو اس لیے مجھ سے ناراض ہیں کہ میں نے ان کو تادیب کی تھی کیونکہ انہوں نے عباس بن عقبہ بن ابی لہب کو پیٹ دیا تھا۔

محمد بن ابی بکر اپنی حیثیت سے بلند تر عہدہ چاہتے تھے اور ایسے آزاد ہیں کہ اپنی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے۔ (وہ عہدہ نہ ملنے کی وجہ سے خار کھائے بیٹھے ہیں) محمد بن حذیفہ فتنے پیدا کرنے کے عادی ہیں۔

جلسہ عام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تقریر[7]

پھر آپ نے کوفہ اور بصرہ کے باشندوں کو جو مدینہ میں تھے بلوایا اور عام جلسہ کا اعلان کرا دیا۔ کوفی اور بصری صاحبان کو منبر کے قریب بٹھایا اور عام مسلمان ان کے گرداگرد بیٹھے۔ پھر آپ نے ان سازشی لوگوں کی مدینہ منورہ میں آمد کا تذکرہ فرمایا پھر ان دونوں کو جنہوں نے پتہ لگا کر رپورٹ دی تھی سامنے کھڑا کیا اور تمام حالات لوگوں کے سامنے بیان فرمائے حاضرین نے ایک آواز ہو کر کہا۔ ان کو قتل کر دیجیے، ان کی گردنیں اُڑا دیجیے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب ایک امام موجود ہے تو اگر کوئی شخص خود اپنے سے یا کسی اور شخص سے بیعت کی دعوت دیتا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ اس کو قتل کر دو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے ایسے شخص کے واسطے میں عام مسلمانوں کے لیے ایک ہی بات جائز قرار دیتا ہوں کہ اس کو قتل کر دیں اور قتل کرنے والے مجھ کو بھی اپنا شریک کار سمجھیں۔ (اس ذمہ داری میں میں بھی برابر کا شریک ہوں)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ میں اس کی تو اجازت نہیں دیتا بلکہ ہم عفو و درگزر سے کام لیں گے، ان کی معذرت قبول کریں گے، ان کو سمجھائیں گے اور اس کا موقع دیں گے کہ وہ معذرت کریں اور ہم سزا اسی کو دیں گے جو کوئی ایسا فعل کرے گا جو شرعاً قابل سزا ہے۔ (جس کی شریعت نے کوئی سزا (حد) مقرر کی ہے) یا اس کو جو کفر کا اظہار کرے۔

الزامات کا جواب:

پھر آپ نے فرمایا یہ لوگ کچھ الزام لگاتے ہیں اور ان کے الزامات کے جوابات بھی ان کو معلوم ہیں۔ مگر پھر بھی وہ مجھے بار بار ٹوکتے ہیں اور ان الزاموں کو اُچھالتے ہیں۔ منشا یہ ہے کہ عام لوگ جو واقف نہیں ہیں ان کی نظریں مجھے مجرم گردان دیں۔ ایک الزام یہ ہے کہ میں سفر میں نماز قصر نہیں پڑھتا، پوری نماز پڑھتا ہوں، بے شک میں نے منیٰ میں قصر نہیں کیا۔ پوری نماز پڑھی اس لیے کہ مکہ میں میرے اہل وعیال ہیں۔ اس لیے میری حیثیت یہاں مسافر کی نہیں رہتی اور اس لیے بھی کہ بہت بڑی تعداد ان نومسلموں کی آ گئی تھی جو احکام اسلام سے واقف نہیں تھے، وہ یہی سمجھ جاتے کہ ان نمازوں کی رکعتیں دو دو ہی ہیں۔ فرمایئے میں نے ٹھیک کیا۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ میں نے مدینہ کا ایک رقبہ چراگاہ کے لیے مخصوص کر دیا۔ یہ صرف میں نے ہی نہیں کیا مجھ سے پہلے بھی رقبے چراگاہوں کے لیے مخصوص کیے جاتے رہے ہیں۔ (تاکہ جو اُونٹ زکوٰۃ وصدقات میں آتے ہیں وہ وہاں چر سکیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فوج کے گھوڑوں کے لیے ایک چراگاہ مخصوص کی تھی۔ اس پر بھی بہت اعتراض کیا گیا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس کا جواب دینا پڑا تھا) (بخاری شریف ص ۴۳۰) پھر میں نے کسی شخص کی مملوکہ زمین چراگاہ میں شامل نہیں کی۔ میں نے اسی علاقہ کو مخصوص کیا جس پر مدینہ والے زبردستی قابض ہو گئے تھے۔ بایں ہمہ کسی کو وہاں مویشی چرانے کی ممانعت نہیں ہے اور نہ کسی کو وہاں سے ہٹایا گیا ہے۔ یہ چراگاہ صدقات کے اونٹوں کے لیے مخصوص ہے اور یہ تخصیص اور حد بندی اس لیے کی جاتی ہے کہ لوگوں سے جھگڑا نہ ہو۔ بے شک کچھ وہ تھے جو روپیہ خرچ کر کے اپنا حق قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کو بلاشبہ اس کا موقع نہیں دیا گیا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرے پاس میری سواری کی صرف دو اُونٹنیاں ہیں۔ ان کے علاوہ نہ میرے پاس اُونٹ ہے نہ بکری۔ آپ سب حضرات کو معلوم ہے کہ جب میں خلیفہ بنایا گیا تو مدینہ میں سب سے زیادہ اُونٹ اور بکریاں میرے پاس تھیں۔ مگر آج میرے پاس نہ اُونٹ ہے نہ بکری۔ صرف دو اُونٹ ہیں جو سفر حج کے لیے میں اپنے پاس رکھتا ہوں فرمایئے جو

کچھ میں نے کیا صحیح ہے۔ آواز بلند ہوئی، بالکل ٹھیک ہے۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ میں نے قرآن پاک کے متفرق نسخوں کو ختم کر کے صرف ایک نسخہ باقی رکھا ہے۔ تو دیکھئے قرآن ایک ہی ہے۔ اس کی طرف سے نازل ہوا جو واحد ہے۔ میں نے جو کچھ کیا اس میں اتباع کی ہے۔ (بڑوں کے نقش قدم پر چلا ہوں) کہ ابو بکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے قرآن کو جمع کیا۔ وہ صرف سینوں میں تھا۔ اس کو مرتب کر کے کاپیوں کی شکل میں رکھا۔ میں نے ان کاپیوں کی ایک کتاب بنا دی۔ فرمائیے میں نے غلط کیا۔ حاضرین نے بالاتفاق کہا غلط نہیں کیا بلکہ صحیح کیا۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ حکم بن العاص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے نکال کر طائف بھیج دیا تھا۔ میں نے اس کو واپس بلا لیا، یہ غلط ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی اس کو اجازت دی تھی، پس آپ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) ہی اس کو نکالنے والے ہیں۔ آپ ہی واپسی کی اجازت دینے والے **فرسول الله صلی الله علیه وسلم سیره ورسول الله صلی الله علیه وسلم رده** (طبری ص۱۰۲ و ص۱۰۳) فرمائیے واقعہ یہی ہے۔ حاضرین نے کہا بالکل ٹھیک۔

کہتے ہیں میں نے جوانوں کو منصب دے دیے ہیں۔ بے شک مگر میں نے انہی نوجوانوں کو منصب دیے ہیں جو منصب کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے ہیں [۸] اور تمام شرطیں پوری کرتے ہیں۔ وہ لوگ موجود ہیں۔ آپ صاحبان خود تحقیق کر لیجیے اور مجھ سے پہلے ان سے بھی کم عمر نوجوانوں کو بڑے بڑے منصب دیے گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ایک فوج کا افسر اعلیٰ بنایا تھا تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کے متعلق بھی چہ میگوئیاں تھیں، فرمائیے میں سچ کہہ رہا ہوں! حاضرین نے ایک زبان ہو کر جواب دیا: آپ ٹھیک فرما رہے ہیں۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ میں نے ابن ابی سرح کو پورا مالِ غنیمت دے دیا۔ یہ غلط ہے میں نے خمس کا یعنی مالِ غنیمت میں بیت المال کا پانچواں حصہ ہوتا ہے۔ میں نے اس پانچویں کا پانچواں بطور انعام دیا تھا، وہ ایک لاکھ ہوتا تھا اور جہاد کے موقع پر حوصلہ افزائی کے لیے ایسے

انعامات حضرت ابو بکر اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما بھی دیتے رہے ہیں۔ مگر لشکر والوں نے کہا کہ ان کو یہ پسند نہیں ہے اور ان کو اس سے ناگواری ہے۔ میں نے اس کو ابن ابی سرح سے واپس لے کر تمام لشکر والوں پر تقسیم کر دیا۔ حالانکہ لشکر والوں کو یہ ناگواری نہ ہونی چاہیے تھی۔ آپ حضرات بتائیے واقعہ یہی ہے۔ سب نے جواب دیا بے شک واقعہ یہی ہے۔

اعتراض کرتے ہیں کہ میں اپنے اہل بیت سے محبت کرتا ہوں اور ان کو عطیے دیتا ہوں۔ بے شک مجھے اپنے اہل بیت سے محبت ہے۔ مگر یہ [9] محبت ان کے ساتھ کسی ظلم پر کبھی مائل نہیں ہوئی۔ بلکہ اس نے ان کے اُوپر حقوق لادے ہیں۔ رہا عطیے دینا تو جو کچھ میں نے کسی کو دیا اپنے پاس سے دیا۔ مسلمانوں کے مال کو میں نہ اپنے لیے جائز سمجھتا ہوں نہ کسی بھی انسان کے لیے اور میں خاص اپنے مال سے بڑے بڑے عطیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں بھی دیتا رہا ہوں اور حضرت ابو بکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی۔ حالانکہ میں اس وقت اپنی عمر کے اس دور میں تھا جب انسان بخیل اور مال کا حریص ہوا کرتا ہے اور اب جب میں اس عمر کو پہنچ گیا ہوں جو میرے خاندان کے لوگوں کی ہوتی ہے اور میری زندگی بیت چکی ہے اور جو کچھ میرا میرے اہل وعیال میں تھا اس کو رخصت کر چکا ہوں تو یہ بے دین یہ باتیں کہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے کسی بھی شہر پر کسی محصول (ٹیکس) کا اضافہ نہیں کیا کہ اس طرح کی شکایتوں کا جواز ثابت ہو (بلکہ) واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے اضافہ کو میں نے مسترد اور نامنظور کیا ہے۔ میرے پاس صرف خمس آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ بھی میرے لیے حلال نہیں ہے۔ مسلمان ہی ذمہ دار ہوتے ہیں کہ خمس کی رقومات کو اس کے مستحقوں کو ادا کریں اور جائز موقعوں پر صرف کریں اور اللہ کے مال میں سے ایک پیسہ بے موقعہ صرف نہ کریں۔ میں اس مال میں سے کچھ بھی اپنے لیے وصول نہیں کرتا۔ میرا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ میں صرف اپنے مال سے کھاتا ہوں۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو زمینیں دی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اراضی مفتوحہ میں حضرات مہاجرین اور انصار سب شریک تھے۔ پھر جن حضرات نے ان مفتوحہ علاقوں میں قیام فرمایا وہ وہاں کے ساکن ہو گئے، تو ان کی وہی حیثیت ہو گئی جو وہاں کے باشندوں کی ہے۔

ان کے وہی حقوق ہیں جو اس علاقے کے دوسرے لوگوں کے حقوق ہیں اور جن حضرات نے وہاں قیام نہیں فرمایا وہ اپنے وطن واپس آ گئے، تو اس سے ان کا وہ حق تو ضائع نہیں ہوا جو اللہ تعالیٰ نے ان مفتوحہ جائیدادوں میں ان کے لیے مقرر کیا ہے۔ میں نے ایسے حضرات کے حصوں کی تحقیق کرائی۔ پھر میں نے ان کے ان حصوں کو ان کی فرمائش پر ان لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جو بلاد عرب میں صاحب جائیداد ہیں۔ فروخت کرنے کے بعد یہ حصے ان کے نام منتقل کر دیے، وہ ان کے قبضے میں ہیں۔ میرے قبضے میں نہیں (اور ان کے قبضہ میں میری بخشش سے نہیں پہنچے، بلکہ انہوں نے قیمت ادا کی۔ تب ان کو ملے ہیں)۔

معترضہ:

(۱) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود اپنی تمام املاک اور جائیدادوں کو تقسیم کر دیا تھا اور صرف اپنے وارثوں پر نہیں بلکہ اپنے مورث اعلیٰ اُمیہ کی تمام اولاد پر اس طرح کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لڑکوں کو بھی اتنا ہی حصہ ملا تھا جو اُمیہ کے پوتوں کو ملا۔ دادا کی اولاد میں سے ہر ایک کے حصہ میں دس ہزار آئے تھے۔ اسی طرح دس دس ہزار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صلبی لڑکوں کو ملے۔ خاندانِ بنو اُمیہ کی اور شاخوں بنی عاص، بنی عیص اور بنی حرب کے افراد کو بھی اسی نسبت سے حصے ملے تھے۔ (طبری ج ۵ ص ۱۰۳)

(۲) سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایام حج سے پہلے محصور ہو گئے تھے۔ آپ نے اپنی طرف سے سیّدنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو انتظامات حج کا امیر بنا کر بھیجا اور ایک خطبہ تحریر فرما کر آپ کو دیا جس کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے سیّدنا امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے پڑھ کر سنایا۔ خطبہ میں زیادہ تر قرآن پاک کی آیتوں سے استفادہ کیا ہے۔ دو تہائی سے زیادہ حصہ میں وہ آیتیں جن میں مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق، اطاعت امیر، اعمال صالح، قیامِ نظم اور احساناتِ خداوندی کے شکر وغیرہ کی تلقین ہے۔ پھر موجودہ حالات پر نہایت لطیف اور مدبرانہ تبصرہ ہے۔ اعتراضات کے جوابات ہیں۔ نیز یہ کہ شکایتوں کی تحقیق کی گئی جن امراء کو الگ کرنے کے لیے کہا گیا ان کو معزول کر دیا گیا۔ آئندہ کے لیے بھی یہ کہہ دیا گیا کہ جن اصلاحات کی ضرورت ہوگی نافذ کی جائیں گی۔

مگر ان کو میری زندگی بھاری معلوم ہو رہی ہے۔ وہ قضائے الٰہی کو جلد سے جلد جاری کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال میری ہدایت یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو۔ طالبِ دنیا نہ بنو۔ آخرت کے ثواب کی کوشش کرو، کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے خون ریزی کا سلسلہ شروع ہو اور میں خدا کی قسم اور اسلام کا واسطہ دیتا ہوں کہ حق پر قائم رہو۔ انصاف سے کام لو، میرے ساتھ بھی حق وانصاف کا معاملہ کرو اور مجھ سے بھی اسی کا مطالبہ کرو۔ بے شک میں نے کچھ لوگوں کو سزائیں دی ہیں۔ مگر جن کو سزا دی وہ اسی حق کی خاطر...... آخری الفاظ یہ ہیں:

وانا اسئال الله عزوجل ان يغفرلي ولكم ويولف بين قلوب هذه الامة على الخير و يكره اليها الفسوق والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته ايها المؤمنون و المسلمون (ص ۱۴۰ تا ۱۴۲ جلد ج ۵)

تقریر کا اثر:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تقریر کا جو ترجمہ پیش کیا گیا ہے وہ تحت اللفظ ہے۔ مفہوم نہیں ادا کیا بلکہ لفظی ترجمہ کیا ہے۔ اس تقریر کے بعد صورتِ حال کیا تھی علامہ طبری کے الفاظ یہ ہیں:

لانت حاشية عثمان لاولئك الطوائف وابى المسلمون الا قتلهم وابى الا تركهم. (طبری ج ۵ ص ۱۰۳)

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا رُخ ان (گمراہ) جماعتوں کے لیے نرم ہی رہا۔ مسلمان صرف یہ بات مانتے تھے کہ ان کو قتل کر دیا جائے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے درگزر اور چھوڑ دینے کے علاوہ کسی بات کو تسلیم نہیں کیا''۔

غور فرمایئے اب مدینہ منورہ وہ نہیں رہا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ مبارک میں تھا۔ اس پچیس سال کے عرصہ میں مدینہ کی آبادی تقریباً تین میل سلع پہاڑ تک پہنچ گئی تھی۔ اس میں آباد ہونے والے صرف حضراتِ مہاجرین وانصار اور ان کی اولاد نہیں بلکہ آباد ہونے والے وہی ہیں جو کوفہ اور بصرہ میں آباد ہو رہے تھے۔ حضراتِ

مہاجرین وانصار کی تعداد چند سے زیادہ نہیں۔ باقی ہزاروں کی تعداد میں موالی (یعنی عجمی) اور ان قبائل کے لوگ ہیں جو بعد میں مسلمان ہوئے، لیکن ان سب کا اصرار یہ ہے کہ ان نکتہ چین سازش کرنے والوں کو قتل کر دیا جائے۔ صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں کہ آڑے آ رہے ہیں۔ ان کا دل ان کے لیے نرم ہے اور صرف درگزر کا اصول ہی اختیار کر رہے ہیں۔

نیا جال لائے پرانے شکاری

سبائیوں کا دوسرا اقدام:

سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تقریر نے سازش کے تمام تار بکھیر دیے۔ جو بیج لوگوں کے دلوں میں بوئے تھے ان کی جڑیں اُکھڑ گئیں تو اب لامحالہ نئے نعروں کی ضرورت ہوئی۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ والیانِ مملکت (گورنر صاحبان) کا جو اجتماع ہوا تھا اُس میں سب وہ تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے خاندانی رشتہ بھی رکھتے تھے۔ پھر حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو اگرچہ کوفہ سے واپس کر دیا گیا تھا اور ان کی جگہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا تقرر ہو چکا تھا۔ مگر حضرت معاویہ (والی شام) حضرت عبداللہ بن عامر والی کوفہ اور حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح والی مصر رضی اللہ عنہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے۔ اب یہی برسرِ اقتدار تھے تو ان کو پراپیگنڈے کے لیے اس سے بہتر مواد کیا مل سکتا تھا۔ اب تک پروپیگنڈہ یہ تھا کہ رشتہ داروں کو بے جا عطیات دیتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کا مسکت جواب دے دیا تو اب پروپیگنڈہ یہ شروع کیا کہ تمام صوبوں میں اپنے رشتہ داروں کو بھر رکھا ہے اور سارا اختیار اقتدار اپنے خاندان والوں ہی کے حوالے کر دیا ہے۔ لہٰذا مملکت اسلامیہ کی مصلحت یہ ہے کہ ان رشتہ داروں کو ہٹایا جائے۔ ورنہ خود خلیفہ دست بردار ہوں۔ یہ باتیں بظاہر سنجیدہ تھیں اور اگرچہ اب تک کی تمام شرارتوں کی بنیاد یہ باتیں نہیں تھیں، مگر اب انہیں باتوں سے کام لیا گیا اور اس شدت سے پروپیگنڈا کیا گیا کہ اچھے اچھے ذہن بھی اس سے اس طرح متاثر ہو گئے کہ انہوں نے تاریخ کو بھی متاثر کر دیا۔ اس وقت عشرہ مبشرہ اور بعنوانِ

دیگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جن کو شوریٰ کے لیے نامزد کیا تھا ان میں سے تین بزرگ باقی تھے۔ سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ، سیّدنا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ وسیّدنا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ۔

سبائیوں کا خیال یہ تھا کہ بنی اُمیہ کے غیر معمولی اقتدار پھر مصلحت مملکت اور مصلحت اُمت کے مؤثر پروپیگنڈے کے ساتھ جب ان حضرات سے درخواست کی جائے گی تو ان میں سے کوئی ایک صاحب خلیفہ بننا ضرور منظور کر لیں گے۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اگر دستبردار ہو گئے تو آئندہ خلیفہ ہمارے زیر اثر ہو گا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دست بردار نہ ہوئے تو خانہ جنگی ہو گی۔ مقصد بہر حال حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ پہلے ان لوگوں نے ان بزرگوں کی خدمت میں خلافت کی پیشکش کی اور جب ان سب حضرات نے سختی سے تردید کر دی تو پھر بغاوت کا راستہ تھا جو اختیار کیا اور اس طرح نظام اسلامی کو درہم برہم کرنے کا نصب العین حاصل کیا۔ طبری کے حوالے سے تفصیل ملاحظہ ہو۔

علامہ ابن جریر طبری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا تقریر اور اس کے اثر کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

یہ لوگ چلے گئے اور یہ تہیہ کر کے اپنے اپنے شہروں کو واپس ہوئے کہ اب زمانۂ حج کے قریب حج کے بہانہ سے آئیں گے اور اس وقت ان لوگوں سے غزوہ کریں گے۔ چنانچہ اپنے اپنے مقامات پر پہنچ کر سازش کے تمام مرکزوں سے خط و کتابت کی اور یہ طے کر لیا کہ ماہِ شوال میں سب مدینہ پہنچ جائیں۔ چنانچہ خلافت عثمانی کے بارہویں سال ماہ شوال میں یہ لوگ حج کے نام پر اپنے اپنے مقامات سے روانہ ہوئے اور مدینہ پہنچے۔ روانہ ہونے والوں کی تعداد ہر جگہ سے چھ سو سے ایک ہزار تک بیان کی گئی ہے۔ پوری تعداد اور ان کے رہنماؤں اور سرداروں کے ناموں کی تفصیل طبری وغیرہ میں دی گئی ہے۔ (ملاحظہ ہو طبری ص ۱۰۴ ج ۵)

مصر کی پارٹی آئی تو عبداللہ بن سبا بھی ان کے ساتھ تھا۔ یہ سب پارٹیاں اس پر متفق تھیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود دست بردار نہ ہوں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔ البتہ آئندہ خلیفہ کے متعلق آپس میں اختلاف تھا۔

اہل مصر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہل بصرہ حضرت طلحہ کو رضی اللہ عنہ اور اہل کوفہ حضرت

زبیر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ اوّل ان لوگوں نے مدینہ سے تین تین منزل کے فاصلہ پر قیام کیا۔ وہاں سے تھوڑی تھوڑی تعداد میں مدینہ کے قریب پہنچے اور متفرق مقامات پر قیام پذیر ہو گئے۔

بصرہ والے مقام ''ذی خشب'' میں، اہل کوفہ ''اعوص'' میں خیمہ زن ہوئے، جبکہ مصر والے مقام ''ذی مروہ'' میں مقیم تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تقریر کے بعد جو اہل مدینہ کا رنگ ہو گیا تھا اس سے یہ لوگ خائف تھے کہ وہ ہم لوگوں کو جیسے ہی دیکھیں گے قتل کر ڈالیں گے۔ یہ بھی سنا تھا کہ مدینہ میں فوج لگا دی گئی ہے۔ اس لیے طے کیا گیا کہ پہلے چند آدمی جا کر مدینہ والوں کا رنگ دیکھیں اگر یہ لوگ قتل کر دیے گئے تو باقی لوگ مناسب منصوبہ بنا کر کام کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا دل مجرم تھا اس لیے خوفزدہ تھے۔ مدینہ منورہ میں نہ کوئی فوج تھی اور نہ مدینے والے خودسر تھے کہ خلیفہ کے حکم کے بغیر کسی کو قتل کر دیں۔ چنانچہ جب ان نمائندوں نے مدینہ کی فضا ساکن دیکھی تو اب ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ کچھ لوگ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کچھ لوگ حضرت علی وطلحہ وزبیر رضی اللہ عنہم کی خدمت میں پہنچے اور کہا کہ ہم لوگ حج بیت اللہ کا ارادہ کیے ہوئے ہیں اور یہاں اس لیے آ گئے ہیں کہ صوبائی حکمرانوں سے جو شکایتیں ہیں وہ خلیفہ کے سامنے پیش کریں اور ان سے درخواست کریں کہ وہ ان کو معزول کر دیں۔ ہم آپ سے یہ چاہتے ہیں کہ آپ اجازت دے دیں کہ ہمارے ساتھی بھی مدینہ منورہ میں آ جائیں (جو باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور موسمی اثرات سے متاثر ہوئے ہیں)۔

ازواج مطہرات اور دوسرے حضرات نے کیا جواب دیا۔ ابن جریر کی روایت کے بموجب جواب کیا الفاظ یہ ہیں۔

فکلھم ابی ونھی وقال بیض ما یفرخن (طبری ۱۰۴ ج ۵)

''ان میں سے ہر ایک نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ مدینہ میں داخل ہونے سے ان کو منع کیا اور کہا۔ انڈے ہیں جن کے بچے نہیں نکلے۔ (یعنی مبہم اور مشتبہ معاملہ ہے نہیں معلوم ان کی تہ میں کیا ہے)''

علامہ ابن جریر نے یہ روایت سند متصل کے ساتھ چار حضرات سے نقل کی ہے۔ محمد، طلحہ، ابوحارثہ اور ابوعثمان۔ انہیں چاروں حضرات سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ان کے بعد ان سبائیوں کے وفود ان تینوں بزرگوں حضرت علی، حضرت زبیر، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم کے پاس پہنچے اور خلافت کی پیشکش کی، مگر ان سب حضرات نے ان کو سختی سے ڈانٹ دیا۔ ان کے صاحبزادگان نے بھی ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے اور ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ

لقد علم المسلمون ان جیش ذی المروة وذی خشب والاعوص ملعونون علی لسان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) فارجعوا لاصحبکم اللہ (ص ۱۰۴ ج ۵ طبری)

''مسلمان جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لشکروں پر لعنت بھیجی ہے جو ذی مروہ، ذی خشب اور الاعوص پر پڑاؤ ڈالیں گے۔''

یہ جوابات سن کر لوگ واپس ہو گئے اور ظاہر یہی کیا کہ وہ اس ارادے سے باز آ گئے ہیں۔ اہل مدینہ مطمئن ہو گئے، مگر باز آنے کے بجائے اُن کا اقدام اس کے برعکس ہوا۔

فلما بلغ القوم عساکرھم کروابھم فبلغوھم فلم یفجأ اھل المدینة الا والتکبیر فی نواحی المدینة (طبری ص ۱۰۵ ج ۵)

''جب یہ لوگ اپنے لشکروں میں پہنچے تو لشکر والوں کو لے کر واپس ہوئے اور اچانک ان پر پہنچ گئے جنہوں نے ان کو واپس کیا تھا۔ (واپس جانے کے لیے کہا تھا) دفعتاً مدینہ والوں نے اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ مدینہ کے چاروں طرف سے تکبیر کی آوازیں آرہی تھیں۔''

مدینہ پہنچ کر باغیوں کے لشکر، لشکر گاہ میں ٹھہر گئے (چھاؤنی کی عمارتوں پر قبضہ کر لیا) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حویلی کا محاصرہ کر لیا اور شہر میں اعلان کر دیا کہ اس کو امن جو ہم پر حملہ نہ کرے۔ (صفحہ ۱۰۵ ج ۵ طبری)

مدینہ کے حضرات جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے ان کے پاس پہنچے کہ آپ لوگ

واپس چلے گئے تھے پھر کیوں آئے؟ تو جواب یہ دیا کہ خلیفہ نے ہمارے ساتھ غداری کی ہے۔ اُس نے حاکم مصر کو لکھ دیا کہ یہ لوگ جب وہاں پہنچیں تو ان کو قتل کر دو۔

کوفہ اور بصرہ والوں نے کہا کہ جب مصر والے واپس ہوئے تو ان کی مدد کے لیے ہم بھی پہنچ گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب آپ اپنے اپنے علاقوں کی طرف روانہ ہو چلے تھے تو پھر اتنی تیزی کے ساتھ یہ رابطہ کیسے قائم ہو گیا کہ سب اکٹھے ہو گئے۔ یہ سب آپ لوگوں کا منصوبہ ہے جو آپ لوگ (روانگی سے پہلے ہی) مدینہ میں طے کر چکے تھے۔ **واللہ امر اُبرم بالمدینة.**

ان لوگوں نے جواب دیا کہ آپ حضرات جو کچھ سمجھیں ہم تو اس خلیفہ کو معزول کرنا چاہتے ہیں۔ (طبری ص ۱۰۵ ج ۵)

علامہ ابن جریر طبری کے انداز ے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اعتماد اسی روایت پر ہے جس کے راوی اوّل چار حضرات ہیں اس میں اختصار ضرور ہے، مگر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ قابل اعتماد ہے۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صوبائی مرکزوں کو اطلاع دی اور ان کو ہدایت کی کہ وہ امداد کے لیے فوجیں بھیجیں۔ جہاں جہاں اطلاع پہنچی وہاں اضطراب پیدا ہو گیا۔ حضرات صحابہ اور حضرات تابعین رضی اللہ عنہم خود بھی مدینہ طیبہ پہنچنے کے لیے تیار ہو گئے اور انہوں نے اور مسلمانوں کو بھی آمادہ کیا (لیکن یہ حضرات ابھی مدینہ پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ بلوائیوں نے اپنا کام پورا کر لیا)۔

اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ محاصرہ کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لاتے اور باجماعت نماز ادا کرتے تھے جمعہ کے روز حسب معمول تشریف لائے۔ نماز جمعہ کے بعد منبر پر تشریف فرما ہوئے اور لوگوں کو سمجھایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لشکر پر لعنت فرمائی ہے جو ان مقامات پر پڑاؤ ڈالے گا جہاں تمہارے لشکروں نے پڑاؤ کیا ہے۔ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جیسے ہی یہ حدیث سنائی حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ

عنہ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ میں شہادت دیتا ہوں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تائید کرتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا، لیکن فوراً ہی بصرہ کا وہ بدنام شخص حکیم بن جبلہ (جو پہلے ڈاکو تھا پھر سبائیوں کا لیڈر بن گیا تھا) کھڑا ہوا اور اُس نے زبردستی حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو بٹھا دیا۔

دوسری طرف حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تائید کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کو بلوائیوں کے دوسرے سرغنہ محمد بن ابی قتیرہ نے زبردستی بٹھا دیا۔ اس پر دوسرے غازی صبر نہ کر سکے انہوں نے بلوائیوں پر پتھراؤ کر کے ان کو نکال دیا۔ پتھراؤ کا جواب بلوائیوں نے بھی پتھراؤ سے دیا۔ ان کے پتھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لگے۔ وہ بے ہوش ہو کر منبر سے گر پڑے اور بے ہوشی کی حالت میں ان کو اُٹھا کر مکان پر پہنچا دیا گیا۔ (ص ۱۰۶ ج ۵ طبری)

قبیلہ غفار کا ایک شخص تھا جہجاہ۔ اُس نے اس افتراتفری میں حضرت خلیفہ رضی اللہ عنہ کا عصا چھین لیا اور گھٹنے پر رکھ کر توڑ دیا۔ یہ سرور کائنات رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا عصا مبارک تھا۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک بھی خطبہ کے وقت اس عصا پر رہا کرتے تھے۔ اس بے حرمتی کی سزا جہجاہ کو ملی۔ اس کے گھٹنے میں آکلہ (کینسر) ہو گیا۔ (طبری ص ۱۱۴ ج ۵) مگر جاء ماتم یہ توہین ہے جو اس بدنصیب نے کی۔

وظائف بند کرنے کے مطالبہ:

علامہ طبری نے اس سلسلے میں ابی سعید (مولی ابی اسید انصاری رضی اللہ عنہ) کی طویل روایت پیش کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اہل مصر کا ایک وفد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت موصوف مدینہ سے باہر اپنے ایک گاؤں میں قیام فرما تھے۔ یہ وفد وہیں پہنچا۔ اہل وفد نے اولاً چراگاہ وغیرہ کے متعلق اپنے اعتراضات پیش کیے اور اعتراضات میں قرآن پاک کی آیتوں کا حوالہ بھی دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے جوابات دے دیے۔ پھر کچھ ایسے اعتراضات کیے جن کے متعلق خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تحقیق نہیں تھی۔ آپ نے قصہ ختم کرنے کے لیے فرما دیا کہ اگر یہ سب کوتاہیاں بھی ہیں تو میں خدا سے توبہ کرتا ہوں۔ اس پر طرفین سے عہد و پیمان ہو گیا۔ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

نے پھر فرمایا کہ ان تمام باتوں کے باوجود یہ نہیں معلوم ہوا کہ آپ لوگوں کا منشاء کیا ہے۔ ان لوگوں نے کھل کر کہا کہ اس وقت ہر ایک باشندۂ مدینہ کا بیت المال سے وظیفہ مقرر ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ بند کیا جائے۔ صرف مجاہدین کے وظائف ہوں جو جہاد کر رہے ہوں یا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جو عمر رسیدہ (شیوخ) ہیں ان کو وظیفہ دیا جائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو منظور فرمایا۔ پھر ان کو اپنے ساتھ مدینہ لائے اہل مدینہ کے وظائف بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔ اس پر اہل مدینہ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور یہ بھی فرمایا کہ بنو اُمیہ کی چال ہے۔

(اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے تو لوگوں کو ناراضگی ہوئی، مگر وفد کا مقصد پورا ہو گیا) اہل وفد اس کارروائی سے مطمئن ہو کر واپس ہوئے۔ **فرجع الوفد المصریون** **راضین** ص ۱۰۷ ج ۵۔

اس کے بعد علامہ طبری نے کئی صفحات میں واقدی وغیرہ کے حوالے سے دو روایتیں نقل کی ہیں جن میں بلوائیوں کے رہنماؤں نیز حضرت علی، حضرت عثمان (رضی اللہ عنہما) اور مروان وغیرہ کی گفتگوؤں، تقریروں اور ان کی کوششوں کا تذکرہ ہے۔ مگر یہ سب روایتیں بے سروپا ہیں، صحیح روایتوں کے خلاف ہیں اور خود آپس میں بھی متضاد ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ملزم قرار دینے کے لیے انہیں ضعیف، موضوع اور متضاد روایتوں سے استدلال کیا جاتا ہے۔ ہم جب ان الزامات کا جواب دیں گے تو ان روایتوں کی حقیقت بھی واضح کریں گے۔ (انشاء اللہ)

اس کے بعد وہ زہرہ گداز اور جانکاہ قصہ ہے کہ ان بلوائیوں نے کس طرح ہجوم کر کے سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جامِ شہادت نوش کرایا۔ اس کا تذکرہ ہمارے موضوع سے خارج ہے لہٰذا ہم اس کا ذکر کر کے حضرات ناظرین کو بھی روحانی کوفت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے۔

معترضہ:

کچھ صاحبان اس سے متاثر ہوتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے کے بعد آئندہ خلافت کے لیے جو حضرات بلوائیوں کے پیش نظر تھے وہ سب قریشی تھے لہٰذا یہ نہیں

کہا جا سکتا کہ یہ تحریک قریشیت کے خلاف تھی۔ مگر یہ اُن صاحبان کی حد درجہ سادگی ہے۔ اس وقت سیاسی مصلحت ہی یہ تھی کہ کسی نمایاں قریشی کا نام لیا جائے تا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف قریش کا تعاون حاصل ہو سکے۔ یعنی آئندہ خلافت کے لیے کسی قریشی کا نام لینا از راہ عقیدت و احترام نہیں تھا بلکہ بتقاضاء مصلحت تھا۔

اب آپ فیصلہ فرمایئے

سیّد حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ انگیز شورش کی پوری تاریخ آپ کے سامنے پیش کر دی گئی جو کچھ پیش کیا گیا اس کا حوالہ دیا گیا۔ کوئی ایک بات بھی حوالہ کے بغیر نہیں لکھی اور حوالہ انہی کتابوں کا دیا جن کو مودودی صاحب نے تاریخ اسلام کا مستند ترین ماخذ قرار دیا ہے۔ (ص ۲۹۹ خلافت و ملوکیت) یعنی تاریخ ابن جریر، ابن اثیر، ابن کثیر اور ابن خلدون، مزید برآں کہیں کہیں بخاری شریف اور ایک جگہ ترمذی شریف کا حوالہ دیا ہے۔

ہم نے کسی واقعہ کی توجیہ یا تاویل نہیں کی، ہر ایک واقعہ کو پوری سادگی سے نقل کر دیا ہے، جو باتیں لکھی ہیں وہ کم و بیش ان چاروں کتابوں میں ہیں، مگر ہم نے ابن جریر طبری کی تاریخ ''تاریخ الامم و الملوک'' کو سامنے رکھا ہے۔ زیادہ تر اسی کے صفحات کا حوالہ دیا ہے۔ پھر عبارت کا صرف مفہوم نہیں بیان کر دیا بلکہ ترجمہ پیش کیا ہے اور بعض اہم عبارتوں کے الفاظ بھی نقل کر دیے ہیں۔ سیّدنا حضرت عثمان کی تقریر کا، نیز جو گفتگوئیں ہوئی ہیں ان کا ترجمہ ایسا کیا ہے کہ اس کو تحت اللفظ کہا جا سکتا ہے۔

اب ہم آپ سے خود دریافت کرتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے۔

(الف) یہ تمام شورش جس کا سلسلہ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ کے دور سے شروع ہوا اس کی بنیاد قبائلی عصبیت تھی یا اقتدار کی کشمکش یا ایک منظم سازش تھی۔

(ب) یہ شورش قدرتی اور غیر اختیاری اضطراب تھا جو ظالم اور خائن کے مقابلہ میں عوام میں پیدا ہو جاتا ہے یا اس شورش کو جعل و فریب کر کے مصنوعی طور پر برپا کیا گیا تھا۔ یہ سازش سیّدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ذات کے خلاف تھی یا قریش اور حضرات صحابہ رضی اللہ

عنہم کے خلاف اور بالواسطہ نظام اسلامی کے خلاف۔اس کا منشا اصلاح تھا یا تخریب۔

(ج) قبائلی عصبیت سے اس میں کام ضرور لیا گیا، مگر اس کی چنگاریاں کہاں سلگیں۔

(د) جو واقعات پوری احتیاط سے بیان کیے گئے ہیں ہمیں یقین ہے کہ ان کے مطالعہ کے بعد آپ خود اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ اقتدار کی جنگ نہیں تھی، کیونکہ اس کے حریف وہی حضرات ہو سکتے تھے جو ارکانِ شوریٰ تھے۔یعنی جن کو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے اس قابل قرار دیا تھا کہ وہ بارِ خلافت سنبھال سکتے ہیں اور تمام صحابہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تشخیص کو صحیح سمجھا تھا یعنی سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ، سیّدنا زبیر رضی اللہ عنہ، سیّدنا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ جن کو تمام مسلمان خلافتِ راشدہ کا اہل سمجھتے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ مختلف علاقوں کے لوگ ان کے حامی بھی ہو گئے تھے۔جیسا کہ پہلے گزرا کہ اہل مصر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آئندہ خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔کوفہ والے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اور بصرہ والے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو۔

مگر ان حضرات کی طرف سے تحریک کی ابتدا یا تحریک کے وسط میں تو کوئی حرکت کیا ہوتی آخری دور میں جب ان علاقوں کے نمائندے ان حضرات کے پاس پہنچے اور خلافت کی پیشکش کی تب بھی ان میں سے کسی میں کوئی لچک نہیں پیدا ہوئی بلکہ لچک اور میلان کے برخلاف ان حضرات نے پیشکش کرنے والوں کو ڈانٹا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کا حوالہ دیتے ہوئے ان سب کو مستحق لعنت قرار دیا۔

(ذ) قبائلی عصبیت کی چنگاریاں خود بھڑکیں یا عبداللہ بن سبا کی پارٹی نے اُن کو بھڑکایا، مگر وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ امراء اور عمال کے خلاف بھڑکی تھیں یا قریش کے خلاف؟ ابن خلدون کا فیصلہ یہ ہے کہ عربی قبائل جو جنگِ قادسیہ میں شریک ہوئے تھے اور وہ اپنے آپ کو سفینۂ اسلام کا ناخدا سمجھتے تھے عصبیت ان میں پیدا ہوئی، قریش کا اقتدار ان کا اکھرا۔ان کے لیے حضرات صحابہ کا اقتدار بھی ناقابل برداشت ہو گیا۔

ان کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ اہل حجاز کی زمینیں عراق میں رہیں۔چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے فروخت کر دینے یا تبادلہ پر دینے کا اہتمام فرمایا۔

اہل مصر کو یہ بھی برداشت نہیں ہوا کہ باشندگانِ مدینہ کے وظیفے باقی رکھے جائیں۔
مسطورہ بالا تفصیلات میں یہ بات بھی سامنے آ گئی کہ:

(و) خط و کتابت اور داعیان (کارپردازانِ تحریک) کے ذریعہ جو پراپیگنڈا کیا گیا وہ ہر جگہ کے عامل اور مالی کے خلاف تھا۔ (اس کے علاوہ یہ بھی واضح ہو گیا کہ):

(ز) یہ شکایتیں فتنہ پردازوں کی تصنیف کردہ تھیں، تعلیماتِ اسلام کے حامل اور ملت اسلامیہ کے حقیقی محافظ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور مرکزِ اسلام یعنی مدینہ طیبہ کے باشندوں نے نہ یہ شکایتیں کیں، نہ شکایتیں کرنے والوں کے ہم نوا بنے۔ (پھر آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ):

(ح) ابتدائی اعتراضات اور تھے اور جب سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب کا جواب دے دیا اور اہل مدینہ یہاں تک مطمئن ہو گئے کہ حضرت خلیفہ رضی اللہ عنہ سے اُن شورہ پشتوں کے قتل کا مطالبہ کرنے لگے تب اُن امراء کا نام لیا گیا جو سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے کچھ قرابت رکھتے تھے۔

(ط) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دینے کے بعد اس پروپیگنڈے کی اور زیادہ ضرورت ہوئی اور خوب ڈھول پیٹ پیٹ کر یہ پروپیگنڈا کیا گیا، کیونکہ ان ننگ انسانیت قاتلوں کے پاس صرف یہی ایک بہانہ تھا جس سے وہ اپنے اس وحشتناک اقدام کی کچھ جوابدہی کر سکتے تھے۔ پھر جب سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں جنگ کی نوبت آ گئی تو اس پروپیگنڈے میں فی الواقع جان پڑ گئی اور یہی جان ہے جو آج تک اس پروپیگنڈے کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد　　　میلش اندر طعنۂ نیکاں برد

حامیانِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور معاندین کا فرق و امتیاز

حامیانِ صحابہ کے سامنے تاریخ کے وہ کھلے ہوئے واقعات موجود ہیں جو ہم نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے گذشتہ صفحات میں نقل کیے ہیں لیکن ان واقعات کی بنا پر تمام ذمہ داری عبداللہ بن سبا اور ان کے رفقاء (اور ان اہل عراق (باشندگان کوفہ و بصرہ) پر آتی ہے جو اقتدارِ

قریش اور اقتدار صحابہ کے مخالف تھے جن کے باغی لشکر ذی مروہ اور ذی خشب واعوص میں رخت انداز ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لعنت کے مستحق ہوئے۔

مگر جن لوگوں کے دلوں میں معاذ اللہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے بغض و عناد ہے جو عبداللہ بن سبا کے حامی اور فتنہ انگیزوں کے جانشین ہیں ان کی تمام توانائیاں اور تمام صلاحیتیں اس میں صرف ہوتی ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ملزم قرار دیں۔ وہ گھوم پھر کر ایک ہی تکنک زبان پر لاتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خویش نواز تھے۔

یہ ایک کھلا ہوا فرق ہے اس کو سامنے رکھئے اور ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمایئے۔ اس کے بعد ہم سے مسئلہ نہ پوچھئے بلکہ قلم آپ خود اپنے ہاتھ میں لیں اور عبارت لکھنے والے کے متعلق منصفانہ فتویٰ صادر فرمائیں۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں۔ (قوسین کے درمیان جو عبارتیں ہیں وہ ہماری ہیں)

> ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جو شورش برپا ہوئی اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی سبب کے بغیر محض سبائیوں کی سازش کی وجہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی یا وہ محض اہلِ عراق کی شورش پسندی کا نتیجہ تھی، تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے۔ (چہ خوب)
>
> اگر لوگوں میں ناراضگی پیدا ہونے کے واقعی اسباب موجود نہ ہوتے اور ناراضگی فی الواقع موجود نہ ہوتی (درست ہے مگر واقعی اسباب مفتوحہ گروہوں کے منتقمانہ جذبات تھے اور ناراضگی اقتدار اسلام سے تھی) تو کوئی سازشی گروہ شورش برپا کرنے اور صحابیوں اور صحابی زادوں تک کو (یہ غلط ہے صرف چار نام لیے جاتے ہیں۔ محمد بن حذیفہ، محمد بن ابی بکر، عمرو بن الحمق اور حضرت عمار بن یاسر) اس کے اندر شامل کر لیتا ہے، کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔
>
> ان لوگوں کو اپنی شرارت میں کامیابی صرف اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ اپنے اقربا کے معاملہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو طرزِ عمل

اختیار فرمایا تھا اس پر عام لوگوں ہی میں نہیں بلکہ اکابر صحابہ تک میں ناراضگی پائی جاتی تھی۔ (خلافت وملوکیت ص ۳۲۸و۳۲۹)

(غلط ہے۔ نہ عوام میں ناراضی تھی نہ خواص میں۔ جب یہ شورہ پشت مدینہ منورہ پر چھا گئے تب اقارب عثمان رضی اللہ عنہ کے اقتدار کا "ہوا" لوگوں کو دکھایا گیا۔ اس وقت کچھ صحابہ نے فتنہ کو ختم کرنے کے لیے کچھ صورتیں تجویز کیں وہ رفع فتنہ کے لیے تھیں۔ اعتراضات کو صحیح تسلیم کر لینے کی بنا پر نہیں تھیں۔ تفصیل آئندہ آئے گی) (انشاء اللہ)

اقرباء نوازی کے الزام کی حقیقت:

مودودی صاحب کا الزام یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقرباء نوازی کا اثر یہ ہوا کہ قبائلیت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سلگ گئیں۔ (ص ۱۰۰)

اس شورش کی پوری تاریخ جو گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے۔ اس سے خود آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ الزام سراسر غلط ہے، افتراء اور بہتان ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کسی فعل سے قبائلیت کی کوئی چنگاری نہیں سلگی۔ اس چنگاری کو سلگانے والے اہل عراق تھے جن میں بقول علامہ ابن خلدون رگِ جاہلیت پھڑکی اور ممکن ہے عبداللہ بن سبا کی پارٹی نے ان کی طبیعتوں کا اندازہ لگا کر اس رگ کو پھڑکایا ہو۔

رہ گیا دوسرا اعتراض جس کے متعلق مودودی صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

"مگر بدقسمتی سے خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس معیار مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے۔ ان کے عہد میں بنی اُمیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے اور بیت المال سے عطیے دیے گئے اور دوسرے قبیلے اسے تلخی کے ساتھ محسوس کرنے لگے۔ ان کے نزدیک یہ صلہ رحمی کا تقاضا تھا، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ عمر خدا کی خاطر اپنے اقرباء کو محروم رکھتے تھے اور میں خدا کی خاطر اپنے اقرباء کو دیتا ہوں۔ ایک موقع پر انہوں نے یہ فرمایا کہ "ابو بکر بیت المال کے معاملہ میں اس بات کو پسند کرتے تھے

کہ خود بھی خستہ حال رہیں اور اپنے اقرباء کو بھی ایسی حالت میں رکھیں،
مگر میں اس پر صلہ رحمی پسند کرتا ہوں۔'' (ص ۹۹ و ص ۱۰۰) (خلافت و ملوکیت)

جو صفحات آپ کے سامنے ہیں ان کے مطالعہ کے بعد آفتاب نیم روز کی طرح روشن اور واضح ہو جائے گا کہ یہ الزامات بھی سراسر افتراء اور بہتان ہیں اور خلیفہ ثالث کا دامن تقدس ان تمام دھبوں سے پاک ہے۔ مگر حقیقت پسندانہ فیصلہ کے لیے ہمیں پس منظر پر نظر ڈالنی پڑے گی۔ ہمیں اس سرحد پر پہنچنا ہو گا جہاں دورِ فاروقی ختم ہوتا ہے اور خلافتِ عثمانی کا آفتاب طلوع ہوتا ہے۔

سیّدنا عمر بن الخطاب الفاروق الاعظم رضی اللہ عنہ کے جہاں اور کارنامے بے نظیر ہیں اُن کے دورِ خلافت کا آغاز بھی بے نظیر ہے۔

خلیفہ اوّل سیّدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کو ایسی مملکت کا سربراہ اور خلیفہ بنایا تھا کہ اس کے اندرونی فتنے ختم ہو چکے تھے۔ مملکت کے اربابِ حل وعقد ایک شیرازہ میں منسلک تھے۔ شقاق و نفاق کا نام و نشان نہ تھا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے زمامِ خلافت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ افواج اسلام کے سالارِ اعظم، بے نظیر فاتح اور کامیاب ترین سپہ سالار سیّدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا جن کی فتوحات ہر ایک مسلمان کے لیے باعثِ فخر تھیں مگر اس کے خلاف کوئی شورش برپا نہیں ہوئی۔ بیرون مملکت قیصر و کسریٰ کی تمنائیں کچھ بھی ہوں مگر شورش کسی طرف نہیں تھی اور سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی حسن تدبیر اور حسن سیاست نے مملکت کو اس قابل بنا دیا تھا کہ اس کی طرف سے اقدام ہو سکتا تھا۔ چنانچہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کی وصیت بھی کر دی تھی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے اس وصیت کو جامۂ عمل پہنایا۔

اس کے برخلاف سیّدنا عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک پر بیعت خلافت ہوئی تو حالات مختلف تھے۔

پہلا فرق وہ تھا جس کی بنا پر خلیفہ دوم نے نہ کسی ایک کو نامزد کیا اور نہ کسی ایک کے لیے سفارش فرمائی بلکہ معاملہ چھ حضرات کے حوالے کر دیا کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنا دیں۔

ایک فرق یہ بھی تھا کہ سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کو سازش کا نتیجہ سمجھا گیا۔ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے منجھلے صاحبزادے عبیداللہ کا یہی احساس تھا جس کی بناء پر آپ نے ہرمزان (سابق والی تستر) کو قتل کر دیا تھا۔ سازش کا قانونی ثبوت فراہم نہیں ہوا۔ اس لیے اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں ہوا لیکن جس چیز کی شہادت فراہم نہ ہو سکے یہ ضروری نہیں ہے کہ اصل میں وہ چیز موجود بھی نہ ہو جب کہ اس کے وہ قرائن موجود ہوں جس کا تذکرہ چند سطروں کے بعد ملاحظہ سے گزرے گا۔

یہ حالات کا فرق اندرونِ ملک تھا اور بیرونِ ملک کا حال یہ تھا کہ گویا ایک آتش فشاں تھا جو سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت پر دفعۃً پھٹ پڑا۔

غور فرمایئے! ایران کا بہت بڑا علاقہ فتح ہو چکا تھا۔ اس علاقے کے باشندوں کی گردنیں جھک گئی تھیں، مگر ان کے دل رام نہیں ہوئے تھے۔ یزدجرد (شاہ ایران) زندہ تھا اور اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ ظاہر ہے مفتوحہ علاقوں کے پرانے رؤسا اور سابق امراء جو باقی تھے ان کے دل یزدجرد کے ساتھ تھے۔ سیّدنا عمر بن الخطاب کی شہادت میں اگر ان کی خفیہ سازش کو دخل نہیں تھا تو یہ ضرور تھا کہ اس کو ان سب نے فال نیک سمجھا اور جیسے ہی شہادت فاروق رضی اللہ عنہ کی خبر پھیلی ان سب نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک علم بغاوت بلند کر دیے۔ تمام معاہدے ختم کر دیے اور اپنی اپنی جگہ اپنے استقلال کا اعلان کر دیا۔

یہ عراق اور ایران کا حال تھا۔ دوسری جانب شام اور مصر کے وہ علاقے تھے جو بازنطینی شاہنشاہیت کے فرماں رواؤں سے حاصل کیے تھے۔ ان کے متعلق ابن جریر طبری کے الفاظ ہیں۔

جاشت الروم حتی استمد من بالشام من جیوشی المسلمین من عثمان مددًا. (طبری ص ۴۶ ج ۵)

"روم میں تلاطم برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے جو لشکر شام میں تھے انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کمک کی درخواست کی۔"

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو رپورٹ خلیفہ وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجی

اس میں یہ تھا۔

ان الروم قدا اجلبت علی بجموع عظیمة (طبری ص۴۶ ج ۵)

"روم نے بڑے بڑے لشکروں کو لا کر مجھ پر چڑھائی کر دی ہے۔"

اس وقت جبکہ پوری مملکت اسلامیہ خطرے میں تھی غور فرمائیے کس نے اس کو سنبھالا۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ وہی لوگ سر ہتھیلی پر لیے ہوئے سامنے آئے جو بقول مودودی صاحب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے۔

ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے محاذ سے اقدام کر کے آذر بائیجان اور آرمینیہ وغیرہ کو دوبارہ فتح کیا (طبری ص۴۵ ج ۵) ایک روایت کے بموجب شام کی امداد کے لیے بھی آٹھ ہزار مجاہدین کی فوج بھیجی۔ (طبری ص۴۶ ج ۵)

یہ ۲۴ھ کا واقعہ ہے ولید بن عقبہ کوفہ کے گورنر نہیں ہوئے تھے ابھی گورنر کوفہ حضرت مغیرہ بن شعبہ تھے (رضی اللہ عنہ) یا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔ اسی علاقہ میں اسی محاذ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایک دوسرے عزیز کا کارنامہ ملاحظہ ہو۔ طبری کی روایت ہے۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو آپ نے عبداللہ بن عامر کو کابل بھیجا، یہ کابل پہنچے اور اس علاقہ پر مکمل فتح حاصل کی۔ (طبری ص۴۴ ج ۵)

شام و مصر کے واقعات علیحدہ بیان کیے جائیں گے (انشاء اللہ) یہ عراق اور کوفہ کا تذکرہ ہے جہاں تقریباً ڈیڑھ سال بعد حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو گورنر بنایا گیا۔ پھر تقریباً چار سال بعد بصرہ میں عبداللہ بن عامر کو گورنری کا منصب سونپا گیا۔ حضرات مؤرخین نے ان حضرات کا تعارف کراتے ہوئے ان کا رشتہ بھی بیان کر دیا۔

مودودی صاحب جیسے نکتہ چین حضرات نے اس رشتہ ہی کو لے لیا، ان کے کارناموں کا مطالعہ نہیں کیا یا تجاہل عارفانہ کے طور پر قصداً نظر انداز کر دیا۔

عقبہ بن ابی معیط بے شک بدترین کافر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کمینہ ترین دشمن تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی والدہ نے اس سے شادی بھی کر لی تھی، مگر یہ کیا بات تھی کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات پر یہ پورا علاقہ باغی ہو گیا تو اسی عقبہ کے لڑکے

ولید کو توفیق ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر ان باغیوں کے مقابلہ پر سینہ سپر ہوا اور اسی نے اس خارج شدہ صوبوں کو دوبارہ اسلامی مملکت میں داخل کیا۔ مودودی صاحب کا یہ فقرہ کتنا مغالطہ انگیز بلکہ توہین آمیز ہے کہ:

> ''حضرت سعد بن ابی وقاص کو معزول کر کے انہوں نے کوفہ کی گورنری پر اپنے ماں جائے بھائی ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو مقرر فرمایا اور اس کے بعد یہ منصب اپنے ایک عزیز سعید بن عاص کو دے دیا۔
>
> (ص ۱۰۷ خلافت وملوکیت)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ معزول ضرور ہوئے مگر کیا اس وجہ سے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس منصب پر اپنے کسی عزیز کو فائز کرنا چاہتے تھے۔ عزیز کو فائز کرنا ہوتا تو پہلے ہی کیوں نہ نامزد کر دیا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا تقرر ہی کیوں کیا تھا جو دورِ فاروقی میں اس منصب سے معزول ہو چکے تھے۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

ہر ایک مؤرخ یہی لکھتا ہے اور یہی حقیقت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی معزولی اس اختلاف کی بنا پر ہوئی جو سیّدنا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہو گیا تھا۔ ہم پہلے تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ اس اختلاف کی صورت میں لامحالہ ایک کو معزول کرنا تھا جو خدمات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے وابستہ تھیں وہ ایسی خوبی سے انجام پا رہی تھیں کہ ان کو معزول کر دینا گویا دین کے ایک ستون کو اُکھاڑ دینا تھا۔ آپ کی خدمات کا ایک شعبہ وہ تھا جس کے طفیل فقہ خصوصاً فقہ حنفی مرتب اور مدوّن ہوا۔ ان کے مقابلہ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو واپس بلانے میں کوئی ایسا نقصان نہیں تھا۔ لہٰذا ان کو واپس بلا لیا۔ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے اب تک فوجی خدمات متعلق تھیں۔ کوفہ کی چھاؤنی ان کا مرکز تھا اور یہیں سے وہ باغی اور سرکش علاقوں کو فتح کر کے اپنا غیر معمولی اثر قائم کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کوفہ کی گورنری کے لیے اس سے زیادہ کوئی موزوں نہیں ہو سکتا تھا جو اس علاقہ کا فاتح ہو۔ اس علاقہ کے فاتح اوّل حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تھے۔ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب کوفہ آباد کیا تو حضرت سعد ہی کو اس علاقہ کا والی بنایا۔ رضی اللہ عنہ۔ بغاوتوں کے بعد اس

علاقہ کے فاتح ولید بن عقبہ تھے۔ اب اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو کوفہ کا گورنر بنایا تو سنت فاروقی پر عمل کیا رضی اللہ عنہ۔ مگر مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ ماں جایا ہونے کا لحاظ کیا۔ (معاذ اللہ) یہ بات تو مودودی صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ:

''اپنے خاندان کے جن لوگوں کو سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے حکومت کے یہ مناصب دیے انہوں نے اعلیٰ درجے کی انتظامی اور جنگی صلاحیتوں کا ثبوت دیا اور ان کے ہاتھوں بہت سی فتوحات ہوئیں''

(خلافت وملوکیت ص ۱۰۸)

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ولید بن عقبہ کوفہ کے گورنر ہوئے تو جیسا کہ پہلے تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے یہ سب سے زیادہ ہر دلعزیز گورنر تھے۔ اہل کوفہ ان کے گرویدہ تھے اور ان کی حالت یہ تھی کہ قیام گاہ پر پھاٹک تک نہیں لگوایا تھا۔ (طبری ص ۵۹ ج ۵)

اس کے بعد شورہ پشت شرارت پسندوں کی شرارت کا سلسلہ شروع ہوا ان پر شراب نوشی کا الزام ثابت کر کے ان کو معزول کرایا گیا لیکن ان شریر شورہ پشتوں کے علاوہ عام باشندگان کوفہ کو ان کی علیحدگی کا اتنا صدمہ ہوا کہ ان لوگوں نے کئی روز تک ماتم کیا۔ (طبری ص ۶۲ ج ۵)

ہر ایک خدا ترس، صداقت پسند سے اپیل ہے کہ وہ انصاف فرمائیں کہ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کیا قصور ہے جس کا الزام اس خلیفہ مظلوم پر لگایا گیا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ولید بن عقبہ کو گھر سے بلا کر گورنر نہیں بنایا نہ چھوٹے عہدے سے دفعۃً بلند کر کے اس منصب پر فائز کیا۔

ولید بن عقبہ اپنی عظیم مجاہدانہ سرگرمیوں سے اس علاقہ کے فاتح بن چکے تھے۔ کیا اس مجاہد فاتح کو پیچھے دھکیل دینا انصاف تھا جس کی شان یہ تھی کہ دورِ صدیقی کے آغاز سے آج تک مختلف منصبوں پر فائز کیے گئے اور جس منصب پر فائز کیے گئے اس کے لیے بہترین اور موزوں ترین ثابت ہوئے پھر قابل توجہ یہ ہے کہ پانچ سال تک کوفہ والوں کی آنکھ کا تارہ بنے رہے۔ الزامات ثابت کرنے میں خواہ کوئی حرکت کی گئی ہو، مگر قانونی طور پر جیسے ہی الزام ثابت ہوا اسی اقربا پرور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ضابطہ کی سزا دلوائی پھر اس کو معزول کر دیا۔

اقربا پروری کا تقاضا یہ تھا کہ کوفہ کی گورنری سے معزول کیا گیا تھا تو کسی انتظامی یا فوجی منصب پر ان کو مامور کر دیا جاتا مگر اس سلسلے میں کوئی نرمی اس اقربا پرور سے ظاہر نہیں ہوئی۔ دوسری طرف یہ ولید بن عقبہ کی خودداری تھی کہ علیحدگی کے بعد نظامِ حکومت میں رہنا پسند نہیں کیا بلکہ سیاست سے ہی کنارہ کش ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔ (الاستیعاب وغیرہ)

یہ عجیب بات ہے کہ مودودی صاحب کو تیرہ صدیاں گزرنے کے بعد اور عبداللہ بن سبا کی پارٹی والوں کو تقریباً نو سال گزرنے کے بعد یاد آیا کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ایک جرم یہ بھی تھا کہ اپنے ماں جائے کو کوفہ کا گورنر بنایا تھا۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں "دوسرے قبیلے تلخی کے ساتھ محسوس کرنے لگے"۔ یہ احساس کب پیدا ہوا؟ تاریخ شاہد ہے کہ خلافتِ عثمانی کے آخری دور میں اس طرح کی شکایتیں پیدا کرائی گئیں۔ یعنی جب کہ ولید بن عقبہ کے تقرر کو تقریباً نو سال گزر چکے تھے اور تقریباً چار سال ہوئے تھے وہ معزول ہو کر خانہ نشین بھی ہو چکے تھے۔ کیا تاریخ کی کسی بھی کتاب سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ جب حضرت ولید کا تقرر ہوا تو لوگوں میں اس لیے تلخی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ماں جائے ہیں۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ غلط کام کو سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل وانصاف کا تقاضا ہے نہ دین کا مطالبہ۔ (ص ۱۱۶)

مگر مودودی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صحیح کام کو سخن سازیوں سے غلط ثابت کرنا کس چیز کا تقاضا ہے۔

حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ:

اسی طرح کا معاملہ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے کہ حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے حضرت عثمان کا اتنا تعلق ضرور تھا کہ وہ آپ کے ہم جد تھے مگر سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو پروان چڑھانے والے سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تھے۔

ان کا تازہ دم کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے معرکہ طبرستان میں کامیابی حاصل کی تھی اور ان کے درجہ کا امتیاز اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی فوج میں سیدنا حسن، حسین، عبداللہ بن عباس،

عبداللہ بن زبیر جیسے نوجوان صحابہ اور سیدنا حذیفہ بن یمان جیسے سن رسیدہ بھی شریک تھے۔ (رضی اللہ عنہم)

ان کے تقرر پر نہ کوئی ناگواری ہوئی نہ کسی کو یہ احساس ہوا کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار ہیں بلکہ خاص ان لوگوں نے جو حضرت ولید بن عقبہ کے مخالف تھے، ان کا خیر مقدم کیا اور وہ پرتپاک استقبال کیا کہ روزانہ کی محفل میں حاضر ہوتے تھے۔

ناراضی اس وقت ہوئی جب از خود یا عبداللہ بن سبا کی پارٹی کے اُکسانے سے قریشی اور غیر قریشی کا سوال پیدا ہوا جس کی انتہا اس وقت ہوئی کہ جب یہ مدینہ منورہ گئے تو واپسی پر ان کا راستہ روک لیا اور مدینہ واپس ہونے پر مجبور کیا۔ ان تمام کھلے ہوئے واقعات کی موجودگی میں اُن کے تقرر کو شورش کے اسباب میں وہی شمار کر سکتا ہے جس کا ضمیر انصاف اور حقیقت پسندی سے محروم ہو اور جس کا نصب العین یہ ہو کہ جس طرح بھی ہو سکے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دامن کو ملوث اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت کو مجروح کرے۔

یہ عجیب بات یہاں بھی ہے کہ اگر بقول مودودی صاحب ان کے تقرر پر تلخی محسوس کی گئی تو اس وقت جب یہ منصب سے برطرف بھی کئے جا چکے ہیں یعنی تقریباً پانچ سال پہلے کا فعل اس وقت تلخی پیدا کر رہا ہے۔ جب تلخی کا مواد بھی ختم ہو چکا ہے۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ غلط کام کو سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل اور انصاف کا تقاضا ہے نہ دین کا مطالبہ۔ (ص ۱۱۶)

مگر آپ کا یہ اشارہ حضرات صحابہ کو مجرم ثابت کرنے کے لیے ہے اور جہاں ان کی برأت ثابت ہوتی ہو وہاں آپ کے انصاف کا تقاضا اس کے برعکس ہے۔

اسی طرح کا دجل آمیز، پرفریب جملہ یہ بھی ہے۔

> ''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بصرے کی گورنری سے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر کو ان کی جگہ مامور کیا۔''
>
> (خلافت وملوکیت ص ۱۰۷)

گویا عبداللہ بن عامر بیکار تھے۔ کہیں روزگار نہیں مل رہا تھا یا ایک خالی آدمی تھے جو مکہ کی

مجلسوں میں اپنا وقت تفریحات میں صرف کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ لہٰذا آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کو بصرہ کی گورنری سے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی کو ان کی جگہ اس عہدہ پر چپکا دیا۔ (معاذ اللہ) یہ تو مودودی صاحب کا حسنِ ظن ہے سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس الزام کے دو پہلو ہیں (۱) حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی معزولی (۲) حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور ان کا تقرر۔ ہم دونوں کی وضاحت علیحدہ علیحدہ کرتے ہیں۔

یہ قطعاً اور صریحاً غلط ہے کہ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سیّدنا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کو بلاوجہ محض اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر بصرہ کی گورنری سے معزول کر دیا۔

مودودی صاحب واقف ہوں یا نہ واقف ہوں مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت ابو موسیٰ رحمہ اللہ عنہ کی عظمت اور آپ کی جلالتِ قدر سے واقف تھے اور ایسا نہیں کر سکتے تھے لیکن اُن کو خود اہل بصرہ نے مجبور کیا اور اصرار کیا کہ جو کچھ بھی ہو، انہیں یہاں سے ہٹا دو۔

شکایت اور اصرار کرنے کا جو انداز اہلِ بصرہ نے اختیار کیا ہماری ہمت نہیں ہے کہ ہم ان کو اپنے الفاظ میں بیان کریں۔ ہم یہی کر سکتے ہیں کہ نقل کفر کے طور پر ابن جریر کی عبارت کا ترجمہ پیش کر دیں، مگر ترجمہ پیش کر دینے سے پہلے یہ یاد دلا دینا ضروری ہے کہ اسی بصرہ میں وہ گینگ تھا جس کا سربراہ حکیم بن جبلہ تھا جو چوری کیا کرتا تھا اہل ذمہ پر ڈاکے بھی ڈالا کرتا تھا۔ شورش کرنا اور فساد پھیلانا اس کا خاص مشغلہ تھا۔ عبداللہ بن سبا جب بصرہ پہنچا تو اس پارٹی نے اس کی آؤ بھگت کی تھی۔ (طبری ص ۹۰ ج ۵ تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

اس گینگ کے ہم جنس وہ تھے جن کو قریش کی طرح حضرات صحابہ کی قیادت بھی اُکھرنے لگی تھی۔ اکابر صحابہ کی عظمت کو مجروح کرنا ان کا ابتدائی کام تھا۔ اسی قماش کے یہ لوگ ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق کہتے ہیں:

ہمیں ان کی جو باتیں معلوم ہیں وہ ہم آپ سے کہنا نہیں چاہتے۔ بس

ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ان کو بدل دیجیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ ان کی جگہ کن کو پسند کرتے ہو تو غیلان بن خرشہ نے کہا۔

''یہ غلام جس نے ہماری جائیدادیں کھالیں (ہڑپ کر لیں) اور جاہلیت کے طریقے ہمارے اندر پھر سے رائج کر دیے۔ ہر شخص اس غلام کا بدل ہو سکتا ہے (معاذ اللہ) ہم اس اشعری کو برداشت نہیں کر سکتے۔ جو اشعری لوگوں کے سامنے اپنے ملک کی عظمت بیان کرتا ہے اور بصرہ کی تحقیر کرتا ہے۔ کسی چھوٹے کو امیر بنا دو (وہ بھی اس کا عوض ہو سکتا ہے۔ جمیع الناس (عوام الناس) میں سے کوئی متوسط درجہ کا ہو نہ چھوٹا ہو نہ بڑا وہ بھی اس کا عوض ہو سکتا ہے۔ (طبری ص ۵۵ ج ۵)

اے قریش! کیا تم میں کوئی خسیس نہیں ہے کہ اس کو ہمارا امیر بنا کر ہم پر بلندی دے دو۔ کیا تم میں کوئی فقیر نہیں ہے کہ اس کو ہمارا حاکم بنا دو۔ یہ اشعری بوڑھا کب تک ہمارے ان شہروں کو کھاتا رہے گا۔ (ایضاً طبری ص ۵۵ ج ۵)

معترضہ:

یہ وہی ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہیں جن کے قلبِ مبارک میں خود بخود اسلام کا جذبہ پیدا ہوا تھا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر جو کم و بیش تیس تھے اپنے وطن سے جو دار الکفر تھا نکل کھڑے ہوئے۔ سمندر طے کرنے کے لیے کشتی پر سوار ہوئے۔ بادِ مخالف نے کشتی کو افریقہ کے ساحل پر پہنچا دیا وہاں حبش میں پہنچ کر وہ سیّدنا حضرت جعفر رضی اللہ عنہ وغیرہ یعنی ان مہاجرین میں شامل ہو گئے جو مکہ معظّمہ سے ہجرت کیے ہوئے تھے۔ پھر وہاں سے عرصہ کے بعد مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ بارگاہِ رسالت کے حاضر باش رہے۔ قرآن پاک سے ان کو ایسا شغف تھا اور ایسے پیارے انداز سے پڑھا کرتے تھے کہ خود آقاء دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم نے جن پر قرآن پاک نازل ہوا کرتا تھا اس کی تحسین فرمائی۔ ارشاد ہوا۔

اعطیت مزمارا من مزامیر آل داؤد (متفق علیہ مشکوٰۃ باب جامع المناقب)

''تمہیں حضرت داؤد علیہ السلام کی بانسری (خوش الحانی) عطا کر دی گئی ہے''

اوراس خفیہ جانفشانی اور بلاکشی کی تو کسی کو خبر ہی نہیں ہے جس کو ایک مرتبہ آپ نے خود ہی بیان کردیا۔ پھر بعد میں پچھتائے کہ میں نے کیوں بیان کیا ہم تو اپنی جانکاہ سرگزشت بیان کردینے کے عادی نہیں ہیں۔ کچھ اہلِ علم میں بات یہ چل رہی تھی کہ غزوہ ذات الرقاع کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا ہم چھ یا سات آدمی ایک غزوہ بن گئے۔ سیّد الانبیاء محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت بابرکت ہم پر سایہ فگن تھی۔ ہم سب کے پاس صرف ایک اُونٹ تھا۔ اسی پر یہ چھ آدمی نمبروار سوار ہوتے تھے۔ (اس سنگلاخ میں ہمیں زیادہ تر برہنہ پا چلنا پڑا تھا) نتیجہ یہ ہوا کہ پیروں میں زخم ہوگئے۔ میرے ناخن بھی جھڑ گئے۔ ہم زخمی پیروں پر چیتھڑوں کی پٹیاں باندھا کرتے تھے۔ اسی لیے اس غزوہ کو غزوہ ذات الرقاع کہا جاتا ہے (چیتھڑوں کی پٹیوں والا غزوہ) (بخاری شریف ص ۵۹۲)

اشعری وہی اشعری حضرات ہیں جن کے متعلق سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا تھا۔

ھم منی وانا منھم (بخاری شریف ص ۳۲۸)

''وہ میرے ہیں، میں اُن کا ہوں''

اور رات کو جب وہ قرآن پڑھتے ہیں تو میں ان کی قرأت کی آواز سے پہچان لیتا ہوں کہ کون کہاں ٹھیرا ہوا ہے۔ (بخاری شریف)

مودودی صاحب الزام لگاتے ہیں کہ خلیفہ سوم کی اقرباء نوازی سے قبائلیت کی چنگاریاں سلگیں نگران کی نظر بصرہ پر نہیں جاتی ابھی وہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کسی کا تقرر نہیں کیا تھا اس سے پہلے ہی وہاں اشعری اور غیر اشعری کا سوال کھڑا کردیا گیا تھا اور گورنر کی تبدیلی اسی لیے چاہ رہے تھے کہ وہ یمن کا باشندہ اشعری ہے لیکن اہل عراق کی شورش کا ذکر کیا جائے تو مودودی صاحب فرماتے ہیں یہ تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے۔ (خلافت وملوکیت ص ۳۲۸)

مودودی صاحب کے معیار پر تاریخ کا صحیح مطالعہ یہ ہے کہ موضوع روایتوں کو سامنے رکھ کر الزامات تراشے جائیں اور ناکردہ گناہ خلیفہ شہید کو ملزم اور مجرم گردانا جائے۔

جرم کیا تھا:

سیّدنا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا جرم کیا تھا جس پر یہ برہمی پیدا ہوئی طبری کی

روایت کے پیش نظر جرم یہ تھا کہ آپ نے جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے یہ فرمادیا تھا کہ اگر سواری میسر نہ آئے تو پیدل ہی روانہ ہو جاؤ۔ خلافت عثمانی کے سال سوم کا یہ واقعہ ہے کہ اہلِ اِیذج اور کردوں میں بغاوت پھیل گئی اور کچھ قبیلے (معاذ اللہ) مرتد بھی ہو گئے۔

سیّدنا حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے تقریر کی، آپ نے جہاد کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے یہ فرمادیا کہ پیادہ سفر کرو تو اس میں اور بھی ثواب ہے۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ یا کوئی بھی امن پسند تصور نہیں کرسکتا تھا کہ یہ فقرہ سبب فتنہ بن جائے گا لیکن شورش پسند نکتہ چینوں نے اس پر اشتعال پھیلانا شروع کردیا کہ:

''ابوموسیٰ اشعری جو پاپیادہ سفر کے فضائل بیان کرتے ہیں، کیا وہ خود بھی پاپیادہ سفر کریں گے، اگر خود سوار ہو کر جائیں تو ان کی سواریاں چھین لو، قول کچھ ہو، عمل کچھ، اسے ہرگز برداشت نہ کرو''۔

دیوانہ را ہوئے بس ست۔ وہ پست ہمت بزدل جو جہاد سے جان بچانا چاہتے تھے ان کو بہانہ مل گیا، جس روز روانگی کا دن تھا ان کی بھیڑ قصر ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ پر پہنچ گئی۔ حضرت ابوموسیٰ اور اُن کے رفقاء کا سامان چالیس خچروں پر تھا۔ اس بھیڑ نے خچروں کو گھیر لیا۔ حضرت ابوموسیٰ کی سواری کی باگ پکڑ لی کہ ہمیں پاپیادہ سفر کی ترغیب دیتے ہو، خود عمل نہیں کرتے۔ یہ تمام خچر ہمارے حوالہ کردو۔ ہم سوار ہو کر جائیں گے۔

بہرحال اس وقت ان فتنہ انگیزوں کو راستہ سے ہٹایا گیا۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوئے اور یہ لوگ شکایت لے کر بارگاہ خلافت میں پہنچ گئے۔ (طبری ص ۵۴و۵۵ ج۵)

یہ ہے وہ تماشہ جس کی انتہا اس پر ہوئی کہ خواہ کسی کو بھیج دو۔ کالے چور کو ہمارا امیر بنادو مگر ابوموسیٰ کو وہاں سے ہٹادو۔ (طبری ص۵۵ ج۵)

حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور ان کا تقرر:

یہ ہے سیّدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی معزولی کا قصہ، اب حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے تقرر کا قصہ ملاحظہ فرمایئے:

مودودی صاحب کو موضوع روایتوں کے یہ جملے یاد ہیں کہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔

''عمر خدا کی خاطر اپنے اقرباء کو محروم کرتے تھے اور میں خدا کی خاطر اپنے اقربا کو دیتا ہوں۔'' (خلافت وملوکیت ص ۱۰۰)

مگر ہمارے سامنے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وہ تقریر ہے جو آپ نے اہلِ مدینہ کے مجمع عام میں فرمائی تھی۔ جس میں بصرہ اور کوفہ کے لوگ خاص طور پر مدعو کیے گئے تھے اور اُن کو منبر کے قریب بٹھایا گیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس تقریر کے ایک ایک جملہ پر حاضرین سے تصدیق لیتے رہے تھے اور حاضرین تصدیق کرتے رہے تھے۔ یہ وہی تقریر ہے جس کو سننے کے بعد اہل مدینہ کا فیصلہ یہ ہوا تھا کہ اس سازش کرنے والے گروہ کو موت کی سزا دی جائے۔

اس تقریر میں آپ نے برسرِ عام فرمایا تھا۔

فاما حبّی فانه لم یمل معهم علی جور بل احمل الحقوق علیهم

''مجھے اپنے خاندان والوں سے محبت ضرور ہے مگر یہ محبت کسی ظلم پر کبھی اُن کے ساتھ نہیں جھکی، بلکہ اس محبت نے ان کے اوپر حقوق کا بوجھ لادا ہے۔'' (طبری ص ۱۰۳ ج ۵)

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ کے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً بیس سال ہے۔ (ممکن ہے پوری طرح داڑھی بھی نہ آئی ہو) کہ آپ اُن پر فتح کابل کا بوجھ لاد دیتے ہیں۔

تقریباً یہی عمر حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اس فوج کا قائد بنایا تھا جو شام پر حملہ کرنے کے لیے مامور تھی۔ حضرت عتاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کی بھی تقریباً یہی عمر تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کی ذمہ داری اُن کے سپرد کی، اسلام کا سب سے پہلا حج آپ ہی کے دورِ امارت میں ہوا۔

یہ عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ وہ ناز پروردہ تھے کہ جب بچپن میں سیّد الثقلین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش ہوئے تو آپ نے لعاب مبارک اُن کے منہ میں

ڈالا۔ یہ اس نونہال کی سعادت تھی کہ اس نے لعاب کو نگل لیا۔ اس سعادتمندی کا اثر خاطر مبارک پر یہ ہوا کہ آپ نے فرمایا:

ارجو ان یکون سقیا (الاستیعاب ص۳۸۲ وھکذا فی الاصابہ وغیرہ)

"مجھے توقع ہے کہ یہ بچہ ہمیشہ سیراب رہے گا۔"

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ توقع پوری ہوئی۔ یہ خود بھی خوش حال و سرسبز رہے۔ بقولِ صاحب استیعاب کان شجیعا کریمًا حلیماً، میمون البقیۃ کثیر المناقب (الاستیعاب ص۳۸۲)

اور جو جائیداد آپ کی ملک میں آتی تھی اس میں اگر چشمہ نہیں ہوتا تھا تو چشمہ نکل آتا تھا اور سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی توقع کا ظہور تھا کہ آپ نے عرفات میں پانی کے سقائے بنوا دیے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیّدنا حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا تھا۔ "میرا یہ بچہ سیّد ہے اُمید ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ دو بڑی جماعتوں میں صلح کرا دے گا"۔ (بخاری شریف ص۳۷۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو جو سیرابی اور شادابی کی دعا دی تھی۔ غالباً اُسی کی برکت تھی کہ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ اس صلح کرانے میں واسطہ[1] بنے جس کے نتیجہ میں کئی سال کی مسلسل پریشانی کے بعد اُمت نے اطمینان اور سکون حاصل کیا اور گلشن اسلام پر تازگی آئی۔

آپ نے بحکم سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کابل کی طرف اقدام کیا۔ سارا علاقہ فتح کر لیا تو بطورِ اداء شکر حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے اور جب نیشاپور پہنچے تو احرام باندھ لیا۔ اتنے لمبے سفر میں اتنے طویل عرصہ تک احرام باندھے رکھنا ان کے جذبۂ فداکاری و قربانی کے لیے باعثِ تسکین ضرور ہوگا۔ مگر نظر شریعت میں پسندیدہ نہیں ہے۔ چنانچہ جیسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے آمنا سامنا ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے ماموں زاد بھائی کے اس فعل پر ناپسندیدگی ظاہر کی۔ (الاستیعاب والاصابہ وغیرہما)

یہ تھی آپ کی شخصیت۔ باقی جن لوگوں نے سیّدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی تھی کہ

(معاذ اللہ) یہ بوڑھا ہمارے کام کا نہیں ہے۔ انہیں لوگوں نے اس نوجوان کو سر پر بٹھایا جس کی عمر اب تقریباً ۲۵ سال تھی۔

سیّدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اگرچہ اُن کاملین میں سے تھے جن کو نہ کسی عہدے کے ملنے کی خوشی ہوتی ہے نہ علیحدگی کا غم۔ البتہ اس کا افسوس ہوسکتا ہے کہ آپ کو علیحدہ کرانے کے لیے نہایت بھونڈا طریقہ اختیار کیا گیا اور اس بنا پر جدید تقرر سے بھی ناگواری ہوسکتی تھی لیکن آپ نے بھی اس تقرر پر مسرت ظاہر کی اور خود ہی اہل بصرہ کو نوجوان گورنر کی آمد کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:

یأتیکم غلام خواج ولاج کریم الجدات والخالات والعمات یجمع له الجندان. (طبری ص ۵۵ ج ۵)

''تمہارے یہاں ایک نوجوان آرہا ہے، نہایت ہوشیار، نہایت چست نجیب الطرفین دونوں لشکر اس کے ماتحت ہوں گے۔''

دیگر مؤرخین:

مودودی صاحب فرماتے ہیں۔ یہ تمام واقعات اس امر کی ناقابل تردید شہادت بہم پہنچاتے ہیں کہ فتنہ کے آغاز کی اصل وجہ وہ بے اطمینانی ہی تھی جو اپنے اقرباء کے معاملے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کی وجہ سے عوام اور خواص میں پیدا ہوگئی تھی اور یہی بے اطمینانی اُن کے خلاف سازش کرنے والے فتنہ پرداز گروہ کے لیے مددگار بن گئی، یہ بات تنہا میں ہی نہیں کہہ رہا بلکہ اس سے پہلے بہت سے محققین یہی کہہ چکے ہیں۔ (خلافت وملوکیت ص ۳۳۲)

اس کے بعد مودودی صاحب نے تین حضرات کے اقوال نقل کیے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہم ان حضرات کی تقلید کیوں کریں جبکہ کھلے ہوئے واقعات ہمارے سامنے ہیں جن کو پہلے بیان کیا جاچکا ہے اور انہیں حضرات مؤرخین کے حوالے سے بیان کیا جاچکا ہے جن پر یہ سب حضرات اعتماد کرتے ہیں۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

بااین ہمہ ہم ہر ایک کا جواب آگے دیں گے۔ (انشاء اللہ)

شام اور سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

فتوحاتِ شام میں بنوامیہ کا حصہ

سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں مودودی صاحب کا قلم بڑی تیزی سے رواں ہوتا ہے، روانیٔ قلم کا جواب بھی اسی طرح کی روانی سے دیا جا سکتا ہے مگر یہ خدمت دوسرے حضرات انجام دے چکے ہیں۔ ہمارے پیش نظر صرف وہ اعتراضات اور الزامات ہیں جن کا تعلق سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں امیر المومنین شہید سیّدنا حضرت عثمان بن عفان ذی النورین رضی اللہ عنہ پر مودودی صاحب کے تین اعتراض ہیں۔

۱- یہ طلقاء میں سے تھے:

ارشاد ہے:

''اُس خاندان کے جو لوگ دورِ عثمانی میں آگے بڑھائے گئے وہ سب طلقاء میں سے تھے اور طلقاء سے مراد مکہ کے وہ خاندان ہیں جو آخری وقت تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دعوتِ اسلامی کے مخالف رہے۔ فتح مکہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معافی دی اور وہ اسلام میں داخل ہوئے۔ حضرت معاویہ، ولید بن عقبہ، مروان بن الحکم انہیں معافی یافتہ خاندانوں کے افراد تھے۔'' (ص ۱۰۹)

''فطری طور پر یہ بات کسی کو پسند نہ آ سکتی تھی کہ سابقین اولین جنہوں

نے اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے جانیں لڑائی تھیں اور جن کی قربانیوں
ہی سے دین کو فروغ نصیب ہوا تھا پیچھے ہٹا دیے جائیں اور ان کی جگہ
یہ لوگ اُمت کے سرخیل ہو جائیں۔'' (خلافت وملوکیت ص ۱۰۹)

۲-حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاقہ کو وسیع کیا:

فرماتے ہیں:

''حضرت معاویہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صرف دمشق
کی ولایت پر تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی گورنری میں
دمشق، حمص، فلسطین، اُردن اور لبنان کا پورا علاقہ جمع کر دیا۔'' (ص ۱۰۸)

۳-مسلسل طویل مدت تک ایک ہی صوبہ کی گورنری پر رکھا:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مسلسل
بڑی طویل مدت تک ایک ہی صوبہ کی گورنری پر مامور کیے رکھا۔ وہ
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں چار سال سے دمشق کی ولایت پر
مامور چلے آ رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایلہ سے سرحد
روم تک اور الجزیرہ سے ساحل بحر ابیض تک پورا علاقہ ان کی ولایت
میں جمع کر کے اپنے پورے زمانۂ خلافت بارہ سال میں ان کو اسی صوبہ
پر برقرار رکھا۔ یہی وہ چیز ہے جس کا خمیازہ آخر کار حضرت علی رضی اللہ
عنہ کو بھگتنا پڑا۔ شام کا یہ صوبہ اس وقت کی اسلامی سلطنت میں بڑی
اہم جنگی حیثیت کا علاقہ تھا۔'' (ص ۱۱۵)

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس صوبہ کی حکومت پر اتنی طویل مدت
تک رکھے گئے کہ یہاں انہوں نے اپنی جڑیں پوری طرح جما لیں اور
وہ مرکز کے قابو میں نہ رہے بلکہ مرکز ان کے رحم وکرم پر منحصر ہو گیا۔''

(خلافت وملوکیت ص ۱۱۵)

جوابات

کوئی بات مودودی صاحب کے خلافِ منشا ہوتی ہے تو فرما دیتے ہیں یہ تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے (خلافت وملوکیت ص ۳۲۸) اور خود آپ کے مطالعہ کے حدودِ اربعہ وہ موضوع اور ضعیف روایتیں ہوتی ہیں جن سے آپ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین پر الزام ثابت کر سکیں۔ اسی کتاب میں تقریباً انہی صفحات میں وہ روایتیں ہوتی ہیں جو اس موضوع روایت کی تردید کریں۔ مگر آپ کی نظرِ تحقیق ان کے مطالعہ کا رُخ ہی نہیں کرتی اور اگر مطالعہ میں آتی ہیں تو پھر ان کو نظر انداز کرنے کی وجہ تحقیق طلب ہے۔

ہر ایک صاحب بصیرت جانتا ہے کہ حال ماضی کا ثمرہ اور نتیجہ ہوتا ہے۔ زمانۂ حال کے کسی واقعہ کے متعلق صحیح فیصلہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک دورِ گزشتہ کے واقعات یعنی حالیہ واقعہ کا پس منظر سامنے نہ ہو۔

مان لیجیے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ طلیق ہی ہیں اور یہ روایت صحیح نہیں ہے کہ آپ فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو گئے تھے۔ (البدایہ والنہایہ ص ۱۱۷ ج ۸)

اور مان لیجیے کہ یہ بات فطری طور پر کسی کو پسند نہیں ہو سکتی تھی کہ طلیق کو آگے بڑھا دیا جائے اور سابقین اوّلین کو پیچھے ہٹا دیا جائے۔ (خلافت وملوکیت ص ۱۰۹)

تو یہ غلطی سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نہیں تھی وہ اس بارے میں صرف مقلد تھے۔ غلطی کے اصل مرتکب سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تھے کہ آپ نے ایک طلیق کو والئ دمشق بنایا اور مودودی صاحب کے نظریہ کے بموجب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے صرف یہی غلطی نہیں کی تھی بلکہ ایک غلطی اور بھی کی تھی کہ پہلے والئ دمشق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی حضرت یزید بن ابی سفیان تھے۔ ان کی وفات ہوئی تو اسی خاندان بلکہ اسی گھر کے دوسرے ممبر کو یہاں کا والی بنا دیا، یعنی میراث جیسی شکل قائم کر دی۔

اس سے بڑھ کر ایک غلطی اور بھی کی کہ جب سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیت المقدس سے واپسی پر دمشق تشریف لے گئے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بڑی شان وشوکت سے

آپ کا استقبال کیا۔

تلقاه فی موکب عظیم (البدایہ والنہایہ ص۱۲۴ ج ۸)

سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو شاہانہ شان وشوکت پسند نہیں آئی۔ آپ نے اعتراض کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا اس سے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ لاجواب ہو گئے، مگر انشراح صدر کے ساتھ مطمئن نہیں ہوئے، ان تمام باتوں کے مشاہدہ کے باوجود آپ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے منصب پر قائم رکھا۔ نہ تنبیہ کی اور نہ تبادلہ کیا۔

اور آپ لفظ طلیق ''طلقاء'' کا تکلف ہی کیوں برتتے ہیں، صاف کہہ دیجیے کہ حضرت معاویہ اسی ہندہ کے بیٹے تھے جس نے جنگِ اُحد کے موقع پر سیّدنا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کرایا تھا پھر شہداء کے ناک، کان کاٹ کر ان کا ہار بنایا تھا اور سیّدنا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر چبایا تھا۔

اور حضرتِ معاویہ اسی ابوسفیان کے بیٹے ہیں جو اسلام کے مقابلہ میں کفر کا علمبردار اور سیدالانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں قریش کا سردار اعظم رہا تھا اور اسی عتبہ کے نواسے اور ولید کے بھانجے تھے جو غزوۂ بدر میں سب سے پہلے میدانِ جنگ میں نبرد آزما ہوئے تھے۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ انہیں ''طلقاء'' کے متعلق اسی حدیث بلکہ اسی جملہ انتم الطلقاء سے پہلے لفظ کو سخن پروری نہ مانا جائے اور لسانِ رسالت سے صادر شدہ کلمات کو حقیقت اور حکم شریعت سمجھا جائے تو قطعاً جائز نہیں ہوگا کہ بحث وتنقید کے وقت ان حضرات کی حیثیت گھٹانے کے لیے طلیق ہونے کا طعنہ دیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا اذھبوا انتم الطلقاء جاؤ تم سب آزاد ہو (تم کو جنگ کے عام قاعدہ کے مطابق غلام نہیں بنایا جاتا) تو اس سے پہلے آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔

اقول لکم کما قال یوسف لاخوته لا تثریب علیکم الیوم

''میں وہی کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا -
آج کوئی ملامت نہیں۔''

یہی ہندہ جنہوں نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبایا تھا بارگاہِ رسالت میں عرض پردازہ ہوئیں۔

''یارسول اللہ پشتِ زمین پر جتنے بھی اہل خباء (خاندان) تھے ان میں سے کسی کے بھی ذلیل ہونے کی مجھے ایسی تمنا اور آرزو نہیں رہا کرتی تھی جیسی میری تمنا اور آرزو تھی کہ آپ کے اہل بیت ذلیل وخوار ہوں۔ پھر آج حالت یہ ہے کہ پشت زمین پر بسنے والوں میں سے کسی کے بھی باعزت ہونے کی مجھے ایسی تمنا اور آرزو نہیں ہے جیسی تمنا اور آرزو یہ ہے کہ آپ کے اہل بیت کی عزت ہو اور وہ باعظمت ہوں۔''

سیّد الانبیاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تردید نہیں فرمائی بلکہ ارشاد یہ ہوا اور قسم کے ساتھ ارشاد ہوا۔

وایضاً والذی نفسی بیدہ

''یہی حالت اپنی بھی ہے قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔'' (بخاری شریف ص ۵۳۹)

غور فرمائیے یہی معاویہ، ابوسفیان اور ہندہ جو کل تک بدترین دشمن تھے، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم قسم کھا کر ارشاد فرمارہے ہیں کہ آپ کی تمنا ہے کہ ان کی عزت ہو، دنیا ان کی تعظیم کرے۔

یہ مکالمہ مصنوعی نہیں تھا، دونوں نے جو کچھ فرمایا عمل سے اس کی مکمل ترین تصدیق کی۔ اسلام لانے سے چند ہفتے بعد حنین کا معرکہ پیش آیا، حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اس میں شرکت کی۔ پھر کچھ دنوں بعد غزوۂ طائف میں شرکت کی اور ایک آنکھ قربان کردی۔ جنگِ یرموک میں دوسری آنکھ بھی اللہ کی راہ میں قربان کردی۔ (الاستیعاب)

جنگِ یرموک میں حضرت ابوسفیان جملہ اہل وعیال کے ساتھ شریک جہاد تھے۔ پورے لشکر کے قائد حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تھے اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے یزید رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ الگ الگ لشکروں کی قیادت کررہے

تھے۔ اس جنگ میں عورتوں نے بھی بڑی ہمت سے حصہ لیا اور بہادری کے جوہر دکھائے۔ حضرتِ حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبانے والی ہندہ پیش پیش تھیں۔ مجاہدین کو جوش دلاتیں اور فرماتی تھیں۔

عضدوا الغلفان بسیوفکم

''ہاں بہادرو! اپنی تلواروں سے ان غیر مختون نامردوں کے ٹکڑے ٹکڑے کردو''۔ (فتوح البلدان ص ۱۴۱-۱۴۲)

دوسری طرف سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بارانِ شفقت موسلا دھار تھی۔ (ایں طرفہ تماشہ بیں) مکہ پر حملہ ہو رہا تھا تو اسی ابوسفیان کو یہ شرف بخشا گیا یا اعلان کیا گیا کہ: جو ابوسفیان کی حویلی میں پہنچ جائے اس کو امن۔ (مسلم شریف ص ۱۰۴، ج ۲ باب فتح مکہ)

غزوۂ حنین کے بعد اموالِ غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو تمام خاندانوں میں سب سے زیادہ اسی خاندان کو نوازا اور اسی کو عزت بخشی۔

صفوان بن امیہ، قیس بن عدی، اقرع بن حابس سردارانِ قریش کو جن کی تعداد تقریباً دس ہے سو سو اُونٹ دیے۔ پچیس تیس سردارانِ قبائل کو پچاس پچاس اُونٹ دیے، لیکن حضرت ابوسفیان اور ان کے صاحبزادوں (حضرت یزید اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم) کو تین سو اُونٹ اور ان کے علاوہ بارہ سو اوقیے چاندی بخشی (جس کا وزن پندرہ سیر سے زیادہ ہوتا ہے)

(سیرت ابن ہشام وطبقات ابن سعد وغیرہما)

مودودی صاحب کی یہ بات غلط نہیں ہے کہ:

''فطری طور پر یہ بات پسند نہیں آ سکتی تھی کہ سابقین اوّلین جنہوں نے اسلام کو سربلند کرنے کے لیے جانیں لڑائی تھیں اور جن کی قربانیوں ہی سے دین کو فروغ نصیب ہوا تھا پیچھے ہٹا دیے جائیں۔'' (خلافت و ملوکیت ص ۱۰۹)

مگر اس موقع پر یہ فطری ناپسندیدگی امتحان کا پرچہ بن گئی تھی جن کا ایمان کامل تھا وہ کامیاب ہوئے اور جن کے دلوں میں نفاق تھا وہ راندۂ درگاہ ہو گئے۔

حضرات انصار کے کچھ نوجوانوں کی زبان پر آیا کہ انعامات ان کو دیے جارہے ہیں جن کے خون کے قطرے ہماری تلواروں سے اب تک ٹپک رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضراتِ انصار کو طلب فرما کر دریافت فرمایا۔ حضراتِ انصار نے عرض کیا کہ ہم میں سے کسی سنجیدہ شخص نے یہ نہیں کہا کچھ ناسمجھ نوخیز ہیں جن کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک میں نے کچھ غیر معمولی عطیات دیے ہیں، مگر میرا مقصد یہ ہے کہ وہ اسلام سے مانوس ہو جائیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو اس نعمتِ عظمیٰ کی طرف توجہ دلائی جو پوری نوع انسان میں حضراتِ انصار کے لیے مخصوص ہوئی تھی۔ ارشاد ہوا:

''کیا تمہاری خوشی کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ تم رسول اللہ کو لے کر اپنے گھروں کو واپس ہو، جبکہ لوگ اُونٹوں اور بھیڑوں اور بکریوں کے گلّے لے جارہے ہوں۔''

فوراً ان عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، شیدایانِ ملت کی آوازیں بلند ہوئیں۔

بلٰی یارسول اللہ قد رضینا

''بے شک یارسول اللہ ہماری خوشی یہی ہے۔ ہم اسی پر راضی ہیں ہم کو صرف رسول اللہ درکار ہیں۔'' (صلی اللہ علیہ وسلم)

حضراتِ انصار کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے یہاں تک کہ داڑھیاں تر ہو گئیں۔ (بخاری شریف ص ۴۴۵ و ۶۲۱ وغیرہ و فتح الباری)

یہ تھے پاکبازانِ با اخلاص، پختہ مغزانِ عشق جو سربلندیٔ اسلام کے لیے اپنے آپ کو فنا کر چکے تھے۔ یہاں سربلندیٔ اسلام اسی میں تھی کہ ان کو پیچھے رکھا جائے۔ اور ان کو انعامات سے ان کو نوازا جائے جو اب تک نورِ ایمان سے محروم تھے جن کے دلوں میں اب تک عشق مولیٰ اور حب رسول کی چنگاریں نہیں سلگی تھیں، ان عطیات کو عشق و محبت کی چنگاریاں بنانا مقصود تھا۔

ان بزرگوں نے محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اقدام کو نہایت مبارک اور مسعود سمجھا کہ اس سے بیگانے یگانہ اور نا آشنایانِ عشق آشنا بن جائیں گے لیکن جن کے دلوں میں نورِ ایمان کے بجائے نفاق کی ظلمت بھری ہوئی تھی، جن کے پاس دعوے بہت کچھ تھے مگر

عمل کا نام ونشان نہیں تھا انہوں نے اس کڑوے انداز سے تنقید کی کہ زبانِ مبارک سے صادر ہوا کہ:

''اللہ تعالیٰ سیّدنا موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے، اُن کو اس سے بھی زیادہ ایذا دی گئی اور وہ صبر کرتے رہے۔ (بخاری شریف ص ۶۲۱ و ۴۴۶ وغیرہما)

ایک موقع پر اسی طرح کی تنقید ذوالخویصرہ نے بھی کی تھی کہ یہ سراسر انصاف کے خلاف ہے ان سے زیادہ ہم مستحق ہیں۔ یارسول اللہ خدا کا خوف کیجیے۔

اس کے گستاخانہ اعتراض پر سیّدنا خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کو جوش آ گیا، عرض کیا یارسول اللہ مجھے اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن اُڑا دوں، ارشاد ہوا اس کی اجازت نہیں، یہ نماز پڑھتا ہے اور مجھے اس کا حکم نہیں ہے کہ میں لوگوں کے دلوں کو چیر کر دیکھوں۔

آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کی اجازت نہیں دی، البتہ یہ فرمایا کہ اس کے سلسلہ سے تعلق رکھنے والے وہ ہوں گے جو اتنی نمازیں پڑھیں گے اور اس طرح تلاوت کیا کریں گے کہ تم ان کے مقابلہ میں اپنی نمازوں اور اپنی تلاوت کو ہیچ سمجھو گے، مگر ان کی تلاوت نوک زبان تک ہوگی۔ دلوں کے سنگلاخ اسی طرح تاریک رہیں گے، جن میں نور ایمان کی کرن تک نہ ہوگی۔ (بخاری شریف ص ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۷۳ وغیرہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئی پوری ہوئی اور یہ ذوالخویصرہ سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں خوارج کی قیادت کرتے ہوئے مارا گیا۔ (بخاری شریف)

پھر یہ انعامات وقتی نہیں تھے حقیقت یہ ہے کہ جب یہ فرمادیا گیا تھا۔ لا تثریب علیکم الیوم آج کوئی ملامت نہیں، سب کچھ فراموش تو اب آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک ان کے طبعی جوہروں اور فطری صلاحیتوں پر تھی۔ ''ہر کسے را بہر کارے ساختند'' کا رمز شناس آپ سے زیادہ کون ہوسکتا تھا۔ خود آپ کا ارشاد ہے۔

الناس معادن کمعادن الذھب و الفضۃ

''جس طرح سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں انسان بھی (مختلف صلاحیتوں کے) معدن اور کان ہوتے ہیں۔'' (صحاح)

چنانچہ انہیں طلقاء کو جو کل تک اسلام کے حق میں تخریب کار تھے اب نظامِ اسلامی کے مختلف شعبوں کا ذمہ دار اور حکومت اسلام کا کار پرداز بنا دیا۔

بیت اللہ شریف اور حرمِ محترم کی ذمہ داریاں ان کو سپرد کیں جو خاندانی طور پر ذمہ دار ہوتے چلے آ رہے تھے، پورے مکہ کے نظم ونسق کا ذمہ دار حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو بنایا جو جوہر اعلیٰ رکھتے تھے اگرچہ ابھی عمر مبارک کے بیس دور بھی پورے نہیں کیے تھے۔

(زاد المعاد ص ۳۲ ج ۱ و الاستیعاب ص ۱۵۳)

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو نجران کا امیر (الاستیعاب ص ۱۰۷ زاد المعاد ص ۳۲ ج ۱) ان کے صاحبزادے (حضرت زید بن ابی سفیان) کو "بنی فراس" کا عامل مقرر فرما دیا۔ (الاصابہ ص ۳۴۱ ج ۶) ابوجہل کے فرزند (سیّدنا عکرمہ بن ابی جہل) کو قبیلہ ہوازن کا عامل (الاستیعاب ص ۵۲۷) حضرت عثمان بن ابی العاص کو طائف کا (الاستیعاب ص ۴۹۶) حضرت ابان بن سعید بن العاص کو بحرین کا۔ (الاستیعاب ص ۳۵) امیر مقرر فرمایا (وغیرہ ذالک) رضی اللہ عنہم اجمعین۔

بہرحال ایک طرف فطری طور پر پسند و ناپسند ہے جس کا سہارا مودودی صاحب لے رہے ہیں۔ دوسری طرف تمام غلط سہاروں اور بہانوں کو ختم کر دینے والا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل اور طریقۂ کار (پالیسی) ہے۔ سوال یہ ہے کہ خلیفۂ راشد پر کیا واجب تھا، فطری طور پر پسند و ناپسند کی منطق کی تقلید واجب تھی یا آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل خلیفۂ راشد کا دستور العمل بن سکتا تھا۔

پاسِ قرابت:

مان لیجیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رشتہ داروں کی رعایت کی مگر کیا اسی جذبہ کی بنا پر جو ہمارے اندر ہوتا ہے جو بسا اوقات ہمیں جاہلانہ عصبیت پر آمادہ کیا کرتا ہے ع

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

واقعہ یہ ہے اگر ہم اپنے جذبات پر قیاس کریں اور سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نفس مبارک میں اپنے جذبات کو اُچھلتا کودتا دیکھنا چاہیں تو سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو جیسے ہی

بحیثیتِ خلیفہ اختیارات حاصل ہوئے تھے ان سب رشتہ داروں کو گولی کا نشانہ بناتے یا حبس دوام کی سزا دیتے جن کو انہوں نے بقول مودودی صاحب غیر معمولی طور پر نوازا۔ یہ رشتہ دار ہی تو تھے کہ جیسے ہی سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے ان سب کے خون سفید پڑ گئے۔ محبت کا نام ونشان ختم ہو گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایذا پہنچانا اور پریشان کرنا ان کے کفر اندوز دلوں کا جذبہ بن گیا تھا، مروان چچا کا بیٹا تھا، مگر عم محترم کا سلوک کیا رہا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ادھیڑ عمر کے ایک شریف انسان، گھر کے رئیس، شہر میں باعزت، علم وفضل میں مشہور، آپ کے چچا حکم بن العاص کو جب معلوم ہوا کہ عثمان مسلمان ہو گئے ہیں تو ان کو پکڑ کر رسیوں سے باندھ دیا اور قسم کھالی کہ جب تک اسلام سے باز نہیں آؤ گے تمہیں اسی طرح جکڑ بند رہنا ہوگا۔ (طبقات ابن سعد ص ۳۸، جلد ۳)

یہ ایذا رسانی کی ابتداء تھی، انتہا یہ تھی کہ تمام ریاست، دولتمندی اور خوشحالی کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ میں اطمینان نصیب نہیں ہوا، مکہ معظمہ کی زندگی دوبھر ہو گئی، چنانچہ سب سے پہلی کھیپ جس نے کفار کی مصیبتوں سے تنگ آ کر مکہ چھوڑا اور حبشہ میں جا کر پناہ لی اس میں سرفہرست سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی ہے۔

کچھ عرصہ بعد توقع ہوئی کہ شاید رشتہ داروں کے دل کچھ نرم ہو گئے ہوں، آپ اور آپ کے رفقاء حبشہ سے واپس آئے، مگر اب ایذا رسانی کے کانٹے پہلے سے کہیں زیادہ تیز تھے اور خطرات کا جنگل پہلے سے زیادہ بھیانک ہو چکا تھا۔ فوراً آپ کو دوبارہ حبشہ واپس ہونا پڑا۔

ان ظالم رشتہ داروں کے ساتھ رعایت ومراعات نفس کشی تو ہو سکتی ہے خویش پروری نہیں ہو سکتی، مگر مودودی صاحب کو حقائق سے کیا واسطہ انہیں تو الزام اور طعن کے لیے بہانہ کی تلاش رہتی ہے۔

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبے است

سیاستِ نبوی:

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ طلقاء جن کو فتح مکہ کے موقع پر معافی دی گئی ایک طاقت تھے۔ یہی طاقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دعوتِ اسلام کا مقابلہ کرتی رہی، یہ ہو

سکتا تھا کہ اس طاقت کا قلع قمع کر دینا نصب العین بنایا جاتا لیکن اس طرح قوم کی ایک طاقت ختم ہو جاتی اور ظاہر ہے اس کے ختم کر دینے میں اپنی طاقت بھی صرف کر دینی پڑتی یعنی قومی نقطۂ نظر سے دوہرا نقصان برداشت کرنا پڑتا، ایک طاقت کا خاتمہ اور اپنی طاقت کا صرف بیجا، ممکن ہے کوئی کشور کشا، ملک گیر اس پالیسی کو اختیار کر لیتا، لیکن وہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم جو اپنی پوری طاقت اس میں صرف کرتے تھے کہ دوزخ کی طرف دوڑنے والوں کی کمریں پکڑ پکڑ کر کھینچے اور راہِ جہنم سے ان کو الگ کرے۔ کب ممکن تھا کہ وہ ان طلقاء کو اپنے سے متنفر کر کے جہنم کے راستہ پر لگا دے۔

انا اخذ بحجز کم عن النار وانتم تقحمون فیھا. (بخاری شریف)

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشفقانہ تدبر تھا کہ اس طاقت کو برباد کرنے کے بجائے اس کو کام پر لگایا اور خود مودودی صاحب اس اعتراف پر مجبور ہیں کہ یہ لوگ جہاں بھی رہے انہوں نے اعلیٰ درجہ کی انتظامی اور جنگی قابلیتوں کا ثبوت دیا اور ان کے ہاتھوں بہت سی فتوحات ہوئیں۔ (خلافت وملوکیت ص ۱۰۸)

بنواُمیہ کا تعلق شام سے:

قریش کا تعلق شام سے بہت پرانا تھا، قصی جس نے قریش کی منتشر طاقت کو مجتمع کر کے بنوخزاعہ کو مکہ سے نکالا تھا اور مکہ میں از سرِ نو قریش کو آباد کیا تھا اس کی پرورش اس کی ننھیال بنی قضاعہ میں ہوئی تھی، یہ قبیلہ شام کی طرف آباد تھا، پھر جب قصی نے بنوخزاعہ کا مقابلہ کیا تو کہتے ہیں کہ اس میں شہنشاہِ روم کی مدد بھی شامل تھی۔ (معارف ابن قتیبہ)

قصی کے پوتے عبد شمس کے متعلق تو ابن ہشام کے الفاظ یہ ہیں **کان رجلا سفارا قلما یقیم بمکۃ** سفر کرنے کا بہت عادی تھا مکہ میں اس کا قیام بہت ہی کم ہوتا تھا لیکن اس کے بیٹے حضرت ابوسفیان کے دادا اُمیہ کے متعلق مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ ایک مرتبہ ہاشم کے مقابلہ میں ہار گیا تو شام چلا گیا تھا اور دس سال وہاں رہا۔ (کامل لابن اثیر ج ۲)

مکہ میں جمہوری طرز کا جو ایک نظام قصی کے زمانے سے قائم تھا اس میں فوجی قیادت کا منصب عبد شمس اور اس کے بعد اس کے لڑکے اُمیہ کے سپرد تھا۔ اس لیے ان کا تعلق مکہ معظمہ

سے منقطع تو نہیں ہوا، مگر چونکہ اُمیہ دولت مند تاجر بھی تھا اس لیے دس سالہ قیام کے علاوہ بھی اُمیہ کا تعلق شام سے رہا۔

اُمیہ کے بعد اس کا بیٹا ''حرب'' مشغلہ تجارت کے ساتھ اس منصب کا ذمہ دار رہا۔ منصبِ قیادت کو ہم وزارتِ جنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں، کیونکہ جنگ کے موقع پر ہی ان کو فرائضِ قیادت انجام دینے پڑتے تھے۔ قریش کی مشہور لڑائیاں جو ذات نکیف، جنگ عکاظ، فجار اوّل، فجار دوم کے ناموں سے مشہور ہیں۔ یہ سب حرب بن اُمیہ کی قیادت میں لڑی گئیں۔ (تاریخ مکہ ازوتی ص ۱۱۵ ج ۱) (مطابع دار الثقافہ مکہ مکرمہ)

حرب کے بعد اس کا بیٹا ابو سفیان ان خاندانی خصوصیتوں میں اپنے باپ کا جانشین تھا۔ وہ تاجر بھی تھا اور قائد حرب بھی۔ ایک ہزار اُونٹوں کا عظیم الشان تجارتی قافلہ لے کر شام گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قافلہ پر حملہ کا ارادہ کیا تھا یہ ابو سفیان کی ہوشیاری تھی کہ اس نے راستہ بدل کر قافلہ کو صحیح سالم مکہ پہنچا دیا اور قریش کو مشتعل کر کے مسلمانوں کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا، جس سے غزوۂ بدر کبریٰ پیش آیا۔

غزوۂ بدر نتیجہ کے لحاظ سے قریش کے حق میں پیش خیمہ فنا تھا لیکن ابو سفیان نے جس ہوشیاری سے کام لیا اس نے ابو سفیان کو قریش مکہ کا مسلمہ لیڈر بنا دیا۔ چند سال تک وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرتا رہا۔ غزوۂ اُحد اور غزوۂ احزاب میں قریش کا قائد ابو سفیان ہی تھا، لیکن صلح حدیبیہ کے بعد جیسے ہی کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو ابو سفیان پھر شام پہنچ گیا۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہنشاہِ روم ہرقل کے نام اپنا دعوتی فرمان بھیجا اور حضرت دحیہ اس فرمان کو لے کر ایلیا پہنچے جہاں شہنشاہِ روم مقیم تھا تو ان ایام میں ابو سفیان ایلیا پہنچا ہوا تھا۔ (بخاری شریف ص ۶ وغیرہ)

اہلِ مکہ خصوصاً اولادِ اُمیہ کے یہی تعلقات تھے جن کی بنا پر شام کی جنگی مہمات میں ان حضرات سے خاص طور پر کام لیا گیا۔ طبری کی روایت ہے کہ ۱۲ھ میں جب سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر مدینہ تشریف لائے تو آپ نے شام کی مہم کے لیے فوجیں مہیا کیں۔ خاص خاص حضرات کو سپہ سالار بنا کر فوجوں کو روانہ کیا۔

سب سے پہلا شخص جس کو امیر الافواج بنا کر شام بھیجا، وہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے خلف رشید یزید بن ابی سفیان تھے۔ (رضی اللہ عنہ)

کان اول الامراء الذین خرجوا الی الشام و خرجوا فی سبعة الاف

(طبری ص ۲۸ ج ۴)

جو حضرات عشر و صدقات وصول کرنے پر مامور تھے (مقامی امراء) ان کو بھی جہاد کی دعوت دی۔ اس دعوت کو سب نے ہی قبول کیا اور اپنی اپنی جگہ نائب مقرر کر کے مجاہدین میں شریک ہو گئے۔ اسی لیے ان کی فوج کو جیش البدال کہا گیا۔ (طبری ص ۲۹ ج ۴)

خاص خاص حضرات کو خاص طور پر دعوت دی۔ مثلاً حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا، آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے جو خدمت انجام دے رہے ہیں وہ بھی بہتر ہے، مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ایسی خدمت سپرد کروں جو دین اور دنیا کے لحاظ سے اس سے بہتر ہو۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

''میں اسلام کا ایک تیر ہوں، آپ کو اللہ تعالیٰ نے تیرانداز بنایا ہے۔ آپ تیر جمع بھی کرتے ہیں اور پھینکتے بھی ہیں۔ جو نشانہ سب سے زیادہ سخت، سب سے زیادہ خطرناک اور عنداللہ سب سے افضل ہو، اس تیر کو (عمرو بن العاص کو) اسی نشانہ پر مار دیجیے۔''

حضرت ولید بن عقبہ کو بھی جو قضاعہ کے محاصل وصول کرنے پر مامور تھے۔ (طبری ص ۲۹ ج ۴) صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسی مضمون کا خط تحریر فرمایا۔ ان کا جواب بھی یہی آیا کہ وہ جہاد میں قربان ہونے کو اور موجودہ خدمت کے مقابلہ میں محاذ پر جانے کو بہتر اور افضل سمجھتے ہیں۔

فاجابه بایثار الجهاد (طبری ص ۲۹ ج ۴)

جب جوابات آ گئے تو سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو امیر الافواج بنا کر فلسطین کی طرف روانہ کیا۔

حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو امیر الافواج بنا کر اردن اور ایک بہت بڑے لشکر کا

امیر حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو بنایا اور حمص کی طرف ان کو روانہ کیا۔ اس لشکر میں حضرت سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ جیسے مکہ کے ممتاز حضرات اور ان کے علاوہ وہ بہت سے مجاہدین تھے جنہوں نے دعوتِ جہاد پر لبیک کہا تھا (بقول علامہ طبری جمہور من انتدب لہ) جب اس لشکر عظیم کو رخصت کیا تو بہت دُور تک حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس کے ساتھ پیدل تشریف لے گئے۔ (طبری ص ۳۰ ج ۴)

اس کے بعد اور مجاہدین کا لشکر تیار ہو گیا تو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر بنایا اور حکم دیا کہ حضرت یزید رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے پہنچ جائیں۔ (طبری ص ۳۰ ج ۴)

فتوحاتِ شام کی تاریخ بیان کرنی مقصود نہیں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب مرتدین وغیرہ کے اندرونی جھگڑوں سے فراغت پالی تو شام کی طرف توجہ فرمائی، جہاں غزوۂ موتہ (۸ھ) سے جنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ شرکتِ جہاد کے لیے اگرچہ آپ کی دعوت عام تھی، مگر بڑھ چڑھ کر حصہ انہی اہل مکہ نے لیا جو طلقاء تھے۔ گویا اس طرح ان بزرگوں نے اپنی سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کی۔

اہل مکہ میں حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ اور ان کے متعلقین بھی تھے جو آخر تک قریش مکہ کے قائد اور سربراہ رہے تھے۔ ان کی اس قائدانہ حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا اور یہ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ اور آل سفیان کی خوش نصیبی تھی کہ انہوں نے بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا۔

طرفین کے اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما آگے آئے اور سب سے پہلے انہیں کو جند عظیم کا امیر بنا کر روانہ کیا گیا۔

روانگی کی شان عجیب تھی۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ سوار تھے اور جانشین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پیدل ساتھ چل رہے تھے۔ حضرت یزید برداشت نہ کر سکے تو عرض کیا کہ یا خلیفہ رسول آپ بھی سوار ہو جائیے ورنہ مجھے اپنے ساتھ پیدل چلنے کی اجازت دیجیے۔ فرمایا نہ تمہیں اُترنے کی ضرورت نہ میں سوار ہوں گا، میں جو قدم رکھ رہا ہوں اس میں ثواب کی اُمید لگائے ہوئے ہوں۔ (موطا امام مالکؒ ص ۱۷۶ باب النہی عن

قتال النساء)

چند ماہ تک چھوٹی چھوٹی لڑائیوں نے جنگِ یرموک تک پہنچا دیا جو تاریخ کی مشہور جنگ اور اس علاقہ کا سب سے بڑا فیصلہ کن معرکہ تھا۔ جس نے رومی شہنشاہیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شام کے علاقہ سے محروم کر دیا۔

سیّدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے میدانِ جنگ میں مقابلہ کے لیے فوج کی ترتیب اس طرح کی تھی کہ فوج کے جو پانچ حصے مشہور ہیں میمنہ، میسرہ، قلب، عقب، مقدمہ ان میں سے ہر ایک حصہ کو کئی کئی ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا تھا، یہ ٹکڑیاں موجودہ اصطلاحات کے لحاظ سے شاید کمپنیاں کہلائیں، اس وقت ان کو کردوس کہا گیا تھا۔ ان کی تعداد ۲۶ ہوگئی تھی، ہر کردوس میں کم وبیش ایک ہزار مجاہدین تھے، ہر ایک کردوس کا ایک افسر تھا اور کئی کئی کردوسوں پر ایک افسر اعلیٰ۔ حضرتِ خالد رضی اللہ عنہ قائد اعظم تھے، ان کردوسوں کے افسروں میں زیادہ تعداد انہیں طلقاء کی تھی مثلاً ابوجہل کے فرزند حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ، ابوجہل کے پوتے عمرو بن عکرمہ، اُمیہ بن خلف کے فرزند حضرت صفوان بن اُمیہ (رئیس مکہ) عتبہ بن ربیع کے ایک فرزند ہاشم بن عتبہ (رئیس مکہ) سہیل بن عمرو، خالد بن سعید، ہبار بن سفیان بن عبدالاسد المخزومی۔

ایک کردوس کے افسر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے فرزند عبدالرحمٰن بھی تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۱۸ سال تھی۔ (طبری ص ۳۳، ۳۴ ج ۴)

حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس محاذ پر پہلے سے کام کر رہے تھے، مگر جنگ یرموک میں خود حضرت ابوسفیان بھی شریک ہوئے اور اپنے تمام ہی اہل بیت کو لے آئے۔

طبری کی روایت ہے کہ جنگِ یرموک میں عورتیں بھی جہاد میں شریک ہوئیں اور بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ ان میں حضرت ابوسفیان کی لڑکی جویریہ بھی شامل تھیں۔ جویریہ کے شوہر (حضرت ابوسفیان کے داماد) بھی اس جہاد میں شریک تھے۔ (طبری ص ۳۶، ج ۴)

پہلے گزر چکا ہے کہ زوجہ ابوسفیان حضرت ہندہ جو غزوۂ احد میں ترانے گا گا کر قریش کو جوش دلا رہی تھی یہاں اس کے کفارہ کے طور پر مسلمانوں کو جوش دلا رہی تھیں کہ ان غیر مختون

نامردوں کے ٹکڑے ٹکڑے کردو۔ (فتوح البلدان ص ۱۴۱ و ۱۴۲)

خود حضرت ابوسفیان کردوسوں (فوجی کمپنیوں پر چکر لگا رہے تھے) اور جگہ جگہ تقریریں کر رہے تھے:

> ''اللہ! اللہ! تم محافظین عرب اور مددگارانِ اسلام ہو، وہ محافظین روم اور مددگارانِ شرک ہیں۔ قوموں کی تاریخوں میں جو بڑے بڑے معرکے پیش آئے ہیں۔ یہ معرکہ ایسا ہی بڑا معرکہ ہے۔ یہ فیصلہ کن معرکہ ہے۔ اے اللہ! اپنے بندوں پر اپنی نصرت نازل فرما۔'' (طبری ص ۳۴ ج ۴، فتوح البلدان ص ۱۴۲) (رضی اللہ عنہم اجمعین)

معترضہ:

(۱) پہلے صفحات میں گزر چکا ہے کہ ایرانیوں کے مقابلہ کے لیے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ربیعہ، مضر اور بنی اسد وغیرہ قبائل عرب کو دعوت دی تھی اور فرمایا تھا میں ملوکِ عرب سے ملوکِ عجم پر ضرب لگاؤں گا۔ سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی اس طرح کا جملہ ہمارے سامنے نہیں ہے، لیکن ان کا عمل ہمارے سامنے ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اہل شام پر اہل مکہ اور ان کے حلیفوں کے ذریعہ ضرب لگائی۔ اہل مکہ نے دادِ شجاعت دی۔ تین ہزار مجاہدین اس جنگ میں شہید ہوئے۔ ان میں سے جن کے نام حضراتِ مؤرخین محفوظ رکھ سکے وہ مکی ہی ہیں۔ مثلاً عکرمہ خلف ابوجہل، عمرو بن عکرمہ (نبیرۂ ابوجہل) سلمہ بن ہشام (برادر ابوجہل) عمرو بن سعید، ابان بن سعید، خالد بن سعید، ہبار بن سفیان بن عبدالاسد المخزومی، ہشام بن العاص، طفیل بن عمیر بن وہب، ہبار بن سفیان (یہ سب مکہ معظّمہ کے ممتاز حضرات میں سے تھے)۔

(۲) ۸ھ میں مکہ فتح ہوا، اس وقت تک حضرت ابوسفیان قریش کے قائد اعظم تھے، یہی امیر الحرب ہوتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرما کر کہ ابوسفیان کا مکان بھی پناہ گاہ ہے جو وہاں پہنچ جائے گا مامون رہے گا۔ ابوسفیان کو پھر ایک طرح کی قائدانہ حیثیت عطا فرما دی۔

جنگِ یرموک میں اگرچہ ابوسفیان امیر الحرب نہیں تھے، مگر جس ولولہ کے ساتھ خود ابوسفیان، ان کی اہلیہ محترمہ، لڑکوں اور لڑکیوں نے اس جہاد میں شرکت کی۔ اس نے ابوسفیان اور ان کے ہر دو فرزند یزید اور معاویہ کی نمایاں حیثیت کو اور مستحکم کر دیا۔

(۳) مودودی صاحب یہ الزام امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے سر تھوپتے ہیں کہ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس صوبہ کی حکومت پر اتنی طویل مدت تک رکھا کہ یہاں انہوں نے اپنی جڑیں پوری طرح جمالیں۔ (خلافت وملوکیت ص ۱۱۵)

مگر یہ مودودی صاحب کی کوتاہ بینی، تاریخ سے ناواقفیت اور سراسر لاعلمی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی جڑیں اس وقت جم چکی تھیں جب غزوۂ یرموک اور اس سے پہلے اور بعد کی لڑائیوں میں ان حضرات نے قوت ہمت اور حسنِ تدبر سے کام کیا تھا۔

(۴) اس محاذ پر جملہ افواجِ اسلام کے قائد اعظم حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ تھے جن کی جنگی مہارت اور غیر معمولی کامیابیوں نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ دشمن طاقتوں کو بھی حیرت زدہ اور خوف زدہ کر رکھا تھا۔ سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی محتاط طبیعت کو ان کی کچھ باتیں ناگوار تھیں، تو جیسے ہی زمامِ خلافت حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آئی تو باوجودیکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہیبت انگیز معرکوں میں مصروف تھے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے پہلا کام یہی کیا کہ ان کو قیادتِ عظمیٰ کے منصب جلیل سے معزول کر کے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو افسر اعلیٰ اور قائد اعظم بنا دیا۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ جو قدیم الاسلام تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یمن کے ایک علاقہ کا والی بنا رکھا تھا۔ پھر جب علاقہ شام میں معرکے شروع ہوئے تو انہوں نے قائدانہ حیثیت سے جہاد میں شرکت کی۔ ذی المروہ وغیرہ کی جنگ انہی کی قیادت میں لڑی گئی، لیکن ان کی بھی کچھ باتوں سے سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو اختلاف تھا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر اصرار کر کے ان کو عہدہ سے معزول کرایا۔ (طبری ص ۲۸ و ۳۰، ج ۴)

لیکن سیّدنا حضرت یزید اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکمل اعتماد حاصل رہا۔

چنانچہ دمشق فتح ہوا تو اس کے سب سے پہلے امیر حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ بنائے گئے (طبری ص ۵۶ ج ۴) حضرت یزید رضی اللہ عنہ تقریباً چھ سال تک امیر کی حیثیت سے اپنے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے رہے۔ ان کے اعلیٰ کردار اور حسن اخلاق کی بنا پر ان کو ''یزید الخیر'' کہا جاتا تھا۔ طاعون پھیلا۔ اس میں حضرت یزید رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو سیّدنا عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو گورنر بنادیا۔ (الاستیعاب ص ۲۶۱) یعنی بھائی کی جگہ بھائی کو جو ابوسفیان کے فرزند دوم تھے۔

سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور شام و فلسطین واردن

شہادت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بعد جنگ کی پالیسی میں تبدیلی

مودودی صاحب جیسا شخص جو ایک جماعت کا امیر بھی ہے اور چاہتا ہے کہ اُس کا علم قیادت بلند ہو، ضروری ہے کہ وہ صاحب الرائے، صائب الفکر ہو، اس کا ظرف بھی وسیع ہونا چاہیے اور کسی موضوع پر کچھ لکھے تو اس کا مطالعہ بھی وسیع ہونا چاہیے مگر افسوس ہمارا تجربہ اس کے خلاف ہے، مثال ملاحظہ ہو۔ تحریر فرماتے ہیں:

> ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس صوبہ کی حکومت پر اتنی طویل مدت تک رکھے گئے کہ انہوں نے اپنی جڑیں پوری طرح جمالیں۔'' (ص ۱۱۵)

آپ نے یہ اعتراض مختلف پیرایوں میں بار بار دہرایا ہے۔ مثلاً ص ۱۰۸، ۳۳۵ وغیرہ لیکن یہ اعتراض وہی کر سکتا ہے جو فہم و فراست، انصاف و دیانت، فکر و دانش سے کام نہ لے یا وہ واقعات سے ناواقف اور اس کا مطالعہ تاریخ کے چند صفحات تک محدود ہو یا بغض وعناد نے اس کی فہم و فراست اور انصاف پسندی کو بالائے طاق رکھ دیا ہو۔

واقعات کو نظر انصاف سے ملاحظہ فرمایئے آپ کا فیصلہ یہ ہوگا کہ یہ صورت ہرگز نہیں ہے کہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس صوبہ کی حکومت سے الگ کر سکتے تھے اور الگ نہیں کیا۔ بلکہ صورتِ حال یہ ہے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو الگ کرتے تو ملت کے حق میں بہت بڑی خیانت کرتے اور مملکت

اسلامیہ کے مفادات کو خود اپنے ہاتھ سے فنا کے گھاٹ اُتار دیتے، اس معمہ کا حل ملاحظہ فرمایئے۔

پہلے گزر چکا ہے کہ جیسے ہی فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملک سے باہر پہنچی تو شکست خوردہ قوموں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ مخالف طاقتیں مملکت اسلامیہ پر ٹوٹ پڑیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاقہ پر رومی فوجوں نے ایسی شورش کر دی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جو دوسروں کی مدد کیا کرتے تھے اس وقت مرکز سے امداد لینے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ کم وبیش دس ہزار مجاہدین کی فوج ان کی امداد کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے بھیجی گئی۔ (تاریخ طبری ص ۴۶، ج ۵) تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

پالیسی میں تبدیلی:

شام اور فلسطین کا پورا علاقہ فتح ہو چکا اور تطہیر جزیرۃ العرب کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان گرامی کی تعمیل ہو گئی تو سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے قائدین افواج کو اقدام کی اجازت نہیں دی۔

شام کے امیر سیّدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا اصرار تھا کہ ان کو قبرص پر حملہ کی اجازت دی جائے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ بھی لکھا کہ یہ علاقہ شام کی سرحد سے اتنا قریب ہے کہ رات کو اس طرف کتے بھونکتے ہیں تو ان کی آواز اس طرف سنائی دیتی ہے۔ مگر سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اقدام کی اجازت نہیں دی۔ (طبری ص ۵ ج ۵)

ممکن ہے سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہو کہ تسخیر مملکت کے بجائے دلوں کو مسخر کرنا زیادہ مفید اور دعوتِ اسلام کے مقصد کے عین مطابق ہے۔

سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اس پالیسی کا اثر یہ ہوا کہ شہنشاہِ روم نے فوجی طاقت بڑھانے کے بجائے سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے دوستانہ تعلقات بڑھانے شروع کر دیے۔ یہاں تک کہ گویا وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک باخدا رہنما ماننے لگا چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو لکھا۔

”مجھے ایسی بات تحریر فرمایئے جو فہم و دانش کا مخزن ہو، گویا پورا علم اس

میں سمویا ہوا ہو۔''

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے تحریر فرمایا۔

احب للناس ما تحب لنفسک و اکرہ لهم ما تکرہ لنفسک.

''سب انسانوں کے لیے وہ چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو اور جو اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کرو''

ایسے ہی سوالات اور بھی کیے جن کے دانشمندانہ جوابات حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی طرف سے دیے گئے۔

استفادہ اور افادہ سے بڑھ کر تحفوں اور ہدیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی ایک اہلیہ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اُم کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ انہیں کچھ خیال آیا، انہوں نے شہنشاہِ روم کی بیوی کو کچھ چیزیں بطورِ ہدیہ بھیجیں۔

ملکہ رُوم اس غیر متوقع نوازش سے اتنی خوش ہوئی کہ اس نے گویا ایک جشن منایا۔ عورتوں کو دعوت دے کر بلایا اور کہا شاہ عرب کی بیگم نے جو اُن کے نبی کی نواسی بھی ہے۔ یہ ہدیہ بھیجا ہے۔ ان سے میری خط و کتابت بھی رہتی ہے۔ مجھے اس کا کیا جواب دینا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں بھی کچھ تحفے بھیج رہی ہوں۔

ملکہ رُوم نے جو ہدیے بھیجے اُن میں ایک بہت قیمتی ہار بھی تھا۔ یہ قیمتی ہدیے ملکہ اسلام کے پاس پہنچے تو شہنشاہِ اسلام سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شان دوسری تھی۔ آپ نے فوراً ایک عام اجتماع کیا۔ پہلے دو رکعتیں پڑھیں۔ پھر مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

جو کام مشورے کے بغیر کیا جائے اُس میں ''خیر'' نہیں ہوتی۔ اُم کلثوم نے کچھ تحفے ہرقل کی بیوی کو بھیجے تھے اس نے یہ قیمتی چیزیں ہدیہ میں بھیجی ہیں۔ آپ حضرات مشورہ دیں کہ ان کا کیا کرنا چاہیے۔

حاضرین نے جواب دیا کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہدیہ کے جواب میں ہدیہ بھیجا گیا ہے۔ لہٰذا جس نے بھیجا تھا اس کو یہ چیزیں ملنی چاہئیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لیکن قاصد تو سرکاری تھا، جس سواری پر سفر کیا وہ سرکاری

تھی اور اس کا اثر تمام مسلمانوں پڑا ہے کہ آپ سب اس کو بڑی بات سمجھ رہے ہیں۔ پھر یہ انفرادی اور شخصی بات کیسے رہی۔ اس میں تو سب مسلمانوں کا حصہ ہے، چنانچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان ہدایا کو فروخت کرا کر قیمت بیت المال میں داخل کرادی۔ البتہ حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا کا جو خرچ ہوا تھا وہ ان کو دلوادیا۔ (طبری ص ۵۲ ج ۵)

شہنشاہِ روم اور اس کی بیوی کا یہ تعلق سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ان کے اہلِ خانہ سے تھا جس میں کہیں جنگ وجدال اور حرب وقتال کی بو نہیں آتی۔

ممکن تھا کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا مشفقانہ انداز بارآور ہوتا اور اسی راہ سے دعوتِ اسلام کا عظیم ترین مقصد کامیابی کی منزل تک پہنچ جاتا لیکن شہادت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خبر خدا جانے کیسی بجلی تھی جس نے سفید فام رومیوں کے دلوں کی سیاہی کو ایک دم نمایاں کر دیا۔ جیسے ہی یہ خبر پھیلی یہی رومی دوست دشمن بن گئے اور اُن کے لشکروں نے شام کو اس طرح گھیر لیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مرکز سے امداد طلب کرتے ہوئے لکھنا پڑا۔

ان الروم قد اجلبت علے المسلمین بجموع عظیمة[11] (طبری ص ۴۶، ج ۵)

اب معاملہ صرف دفاع کا نہیں رہا بلکہ سوال پالیسی کا ہو گیا یعنی یہ سوال پیدا ہو گیا کہ دشمن کی موجودہ پوزیشن کو ختم کرنے کے بعد ہماری جدوجہد صرف سرحدوں کی حفاظت کے انتظام تک محدود رہنی چاہیے یا ایسا اقدام کرنا چاہیے کہ دشمنوں کی ہمتیں پست ہو جائیں اور وہ آئندہ اس طرح یورش نہ کرسکیں۔ نیز یہ کہ ہماری مملکت کی آخری حدود یہی رہنی چاہئیں جو اَب ہیں یا ان حدود کی حفاظت کے لیے ہمیں کچھ آگے بڑھ کر دفاعی لائن قائم کرنی چاہیے۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اصرار تھا کہ قبرص پر حملہ کی اجازت دی جائے، مگر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اجازت نہیں دی۔ اب پھر موقع آیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ثالث سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے قبرص پر حملہ کرنے کی اجازت چاہی۔ قبرص پر حملہ صرف ایک چھوٹے سے جزیرے پر حملہ نہیں تھا جو اتنا قریب ہے کہ وہاں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ بلکہ قبرص پر حملہ کرنے کے معنی یہ تھے کہ:

۱۔ رومیوں کی رگِ حمیت پر ضرب لگائی جارہی ہے۔

۲- اب تک رومیوں کو اپنے ملک یعنی جزیرۃ العرب سے نکالا تھا اب اُن کی ایسی نو آبادی پر حملہ کیا جا رہا ہے جس سے کوئی جغرافیائی، نسلی یا مذہبی تعلق عربوں کا نہیں ہے۔

۳- عرب بری (خشکی کی) جنگ کے عادی تھے اس میں انہوں نے غیر معمولی فتوحات حاصل کیں اب ان کو بحری جنگ کے لیے اُبھارا جا رہا ہے جس کا ان کو پہلے سے تجربہ نہیں ہے۔

۴- عربوں کی بحری طاقت صفر ہے۔ ایسی حالت میں ان کو ایسی شہنشاہیت کے مقابلہ پر لایا جا رہا ہے جس کی بحری طاقت بے پناہ ہے۔

سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سب سے زیادہ احساس نمبر۳ و نمبر۴ کا تھا وہ اس کو درست نہیں سمجھتے تھے کہ مہارت اور طاقت کے بغیر بحری جنگ کا سلسلہ شروع کیا جائے ایسی حالت میں کہ ناکامی یقینی ہو اقدام جائز نہیں۔ چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہی تحریر فرمایا کہ میرے نزدیک ایک مسلمان کی جان روم کی پوری مملکت سے زیادہ محبوب ہے۔ **تا للہ لمسلم احب الی مما حوت الروم** (طبری ص ۵۲، ج ۵)

اس کے علاوہ ایران کے معرکوں سے بھی ابھی پوری طرح فراغت نہیں ہوئی تھی یزدجرد شاہ ایران زندہ تھا اور اس کی ریشہ دوانی جاری تھی اور فاروق اعظم کی فراست و بصیرت ان جراثیم کو بھی دیکھ رہی تھی جو ایران میں موجود تھے جو آگے چل کر خطرۂ عظیم بننے والے تھے۔ ایسی صورت میں بہت مشکل تھا کہ عربوں کو بحری محاذ پر کھڑا کر دیا جائے۔

اب اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو قبرص پر حملہ کی اجازت دی جاتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ایسی جنگ کا ذمہ دار بنایا جا رہا ہے جس کا عرض وطول بہت وسیع ہو سکتا ہے جو ساحلِ افریقہ سے آگے بڑھ کر یورپ تک پہنچ سکتا ہے جس کے لیے بحری طاقت بھی فراہم کرنی ہوگی۔ جہازوں کی تیاری کے لیے بہت بڑا سرمایہ، سرمایہ کے ساتھ بیشمار کاریگر، انجینئر اور بحری جنگ کے ایسے ماہر بھی فراہم کرنے ہوں گے جو عربوں کو بحری جنگ کی مشق کرائیں۔

مودودی صاحب کے دماغ پر تو صرف ایک بات مسلط ہے کہ حضرت معاویہ، حضرت

عثمان رضی اللہ عنہم کے ہم جد تھے لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ ان کو دمشق کی گورنری سے یک قلم برخاست کر دیتے، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ بات عقل سلیم سے بہت بعید ہے۔

یہ درست ہے کہ ایران کے محاذ پر بہت ہی خطرناک صورت حال درپیش تھی۔ جب سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سیّدنا حضرت سعد بن ابی الوقاص رضی اللہ عنہ کو امارت کوفہ سے معزول کیا تھا اور بہت ہی نازک صورت حال شام کے محاذ پر درپیش تھی جب سیّدنا خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کو اُن کے منصب سے معزول کیا تھا۔ اس محاذ کی سب سے بڑی جنگ، جنگِ یرموک کا میدان گرم تھا یا اس کی ہماہمی تھی۔ جب سیّدنا خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کے پاس منصب سے معزولی کا فرمانِ فاروقی پہنچا تھا مگر سیّدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے متعلق اہلِ کوفہ نے شکایتی میمورنڈم پیش کیا تھا جو اگرچہ سراسر بے بنیاد تھا، مگر بہر حال پیش کیا گیا تھا۔ سیّدنا خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کے متعلق اگرچہ عوام کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی بلکہ عوام میں ان کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت تھی، مگر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اُن سے بہت سخت شکایت تھی، لیکن سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ کمال بہت ہی زیادہ قابل قدر اور حیرت انگیز ہے کہ ان کے متعلق نہ اس وقت تک کوئی شکایت بارگاہِ خلافت تک پہنچائی جا سکی، نہ ان کے آئندہ دورِ حکومت میں کوئی شکایت عوام کی طرف سے پیش ہوئی، نہ جلیل القدر خلیفہ دوم اور خلیفہ سوم کو ان سے کوئی شکایت پیدا ہوئی۔ ایسی صورت میں ان کو معزول کیا جاتا تو وہ دماغ کی بات نہ ہوتی بلکہ بے دماغی کی کھلی دلیل اور دین وملت کے حق میں بہت بڑی خیانت ہوتی۔

پالیسی بدلنے کی ضرورت:

اس بات کی معقولیت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ رومیوں کی غداری نے جب مملکت اسلامیہ کے لیے موت وحیات کا سوال پیدا کر دیا تھا تو مملکت اسلامیہ کے ذمہ داروں کو پائیدار تحفظ کی صورتیں سوچنی تھیں اور ان کو عمل میں لانا تھا۔

بحری جنگ کا آغاز:

سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسا مدبر اس اقدام کی اجازت طلب کر رہا تھا تو لامحالہ اقدام کے لوازم سے واقف ہوگا یعنی سامانِ جنگ اور سرمایہ وغیرہ ضروریات اقدام کا بھی اس کو اندازہ ہوگا اور پیش آنے والے خطرات کا بھی اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ اس کا کچھ انتظام بھی کر لیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی اجازت ملی بڑے ولولے اور جذبے سے انہوں نے اقدام شروع کر دیا۔ پھر حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جس طرح ان کی حمایت فرمائی اس نے ان کے ولولہ میں اور اضافہ کر دیا۔

سیّدنا ابوذر غفاری، حضرت مقداد، حضرت ابودرداء، حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ اس فوج میں شریک تھے۔ اُن کے ساتھ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ محترمہ ''ام حرام رضی اللہ عنہا'' بھی تھیں۔ (طبری ص ۵۱ ج ۵) ان کے ساتھ وہ پرواز بشارت بھی تھی جس کو سیّد الانبیاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روز عطا فرمایا تھا جس روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حجرہ کو راحت کدہ بنایا تھا۔

محترمہ ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ ہوتی تھیں آپ ان کے یہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک روز کھانا ان کے یہاں تناول فرمایا پھر کچھ آرام فرمایا۔ بیدار ہوئے تو لب مبارک پر تبسم تھا۔ حضرت اُم حرام رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یارسول اللہ! اللہ آپ کو ہمیشہ خنداں وشاداں رکھے اس وقت تبسم کیسا۔ فرمایا میرے سامنے میری اُمت کے وہ غازی فی سبیل اللہ پیش کیے گئے جو سمندر کے سینے پر سوار ہو کر سفر کریں گے اس شان سے جیسے تخت نشین بادشاہ ہوں۔

محترمہ ام حرام رضی اللہ عنہا نے عرض کیا۔ یارسول اللہ دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ ان میں مجھے بھی شامل فرمادے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی پھر آپ مشغول استراحت ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد آنکھ کھلی تو لب مبارک اسی طرح تبسم فرما تھے۔ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا نے سبب دریافت کیا تو پھر وہی جواب دیا گیا کہ میرے سامنے میری اُمت کے ایسے غازی پیش کیے گئے جو سینہ سمندر پر سوار ہو کر شاہانہ انداز سے سفر کریں گے۔ حضرت ام حرام

رضی اللہ عنہا نے پھر عرض کیا یارسول اللہ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان میں شامل فرما دے۔فرمایا تم پہلے غازیوں میں ہوگی۔(بخاری شریف ص ۳۹۱، ۴۰۳، ۴۰۴ و مسلم و ترمذی وغیرہ)

ارشادِ گرامی آئینہ مشیتِ خداوندی تھا۔حرف بحرف صادق ہوا، یہ محترمہ جب اس غزوہ سے واپس ہورہی تھی اپنی سواری سے سر کے بل گریں اور شہید ہوگئیں۔اس غزوہ کے لیے سیّدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی تیاری کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ سفر شاہانہ شان سے ہوا تھا اور جب یہ غازی خواب یا مشاہدہ روحانی میں اسی شان کے ساتھ فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیے گئے تو اس شان وشوکت نے منظوری بھی حاصل کرلی۔سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شام میں جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شاہانہ شان دیکھی تھی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کی جو مصلحت بیان کی۔فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کی نہ تصدیق کی تھی نہ تردید، مگر رویاءِ صادق اور پیغمبرانہ خواب میں جب سینہ سمندر پر سوار غازیوں کی شاہانہ شان نے شرف پسندیدگی حاصل کیا تو مستحق مبارکباد ہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کہ اُن کی مصلحت نے بھی شرف منظوری حاصل کرلیا جس طرح مستحق مبارکباد ہیں اس بحری سفر کے تمام مجاہد کہ لسان رسالت نے ان کو غازی فی سبیل اللہ فرمایا۔زہے قسمت۔

اس اقدام کے نتیجہ میں جو غیر معمولی فتوحات ہوئیں جس نے مملکت اسلامیہ کی حدود کو یورپ اور افریقہ تک پہنچادیا۔ان کا بیان کرنا موضوع سے خارج ہے۔ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ خلیفہ دوم رضی اللہ عنہ کی شہادت نے ایسا انقلاب برپا کیا کہ دوست ممالک دشمن بن گئے جس حوصلہ اور بلند آہنگی سے حملہ آور طاقتوں کا دفاع کیا گیا وہ بھی قابل قدر ہے لیکن اس سے بھی زیادہ قابل قدر یہ ہے کہ دفاع کے بعد اقدام کی ہمت کی گئی۔حالات نامساعد تھے۔اس طرف شہنشاہِ روم کی فوجیں تھیں تو دوسری طرف ایران کا وسیع علاقہ تھا جہاں جگہ جگہ بغاوت ہورہی تھی اور اس نوعمر مملکت کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

سیّدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا حوصلہ بھی قابل قدر ہے کہ آپ شہنشاہِ روم کی طاقت سے ٹکرانے کے لیے آگے بڑھے، مگر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور قابل صد ستائش خلیفہ سوم کا حوصلہ تھا جو اپنی عمر کے ستر سال پورے کرچکا تھا اور یقین کیا جاتا تھا کہ دولت کے سایہ میں یہ

ناز پروردہ تن سیمیں، فولادی انسان نہیں بن سکتا لیکن جب اس نے بیک وقت ایران، مصر اور شام کے تینوں محاذوں پر اقدام کی پالیسی اختیار کی اور اس وقت تک اس کو نباہتا رہا جب تک ہر محاذ پر مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوگئی تو ہر ایک صاحب انصاف کو یقین کرنا پڑا کہ دربارِ رسالت کا یہ فیض یافتہ فولادی انسان نہیں، بلکہ عزم واستقلال کا پہاڑ ہے۔ اس کے لیے شہید کا خطاب جو لسانِ رسالت سے صادر ہوا بالکل صحیح ہے اور وہ یقیناً اُن میں ہے جن کے صبر واستقامت اور عزم واستقلال کے پرتو سے اُحد جیسا لرزتا ہوا پہاڑ بھی سکون اختیار کر لیتا ہے۔

علاقہ میں توسیع:

آپ شام کا نقشہ سامنے رکھئے دمشق کا کوئی بھی کنارہ سمندر سے ملا ہوا نہیں ہے۔ سامنے کوہ لبنان ہے۔ پھر ساحلِ سمندر صوبہ لبنان ہے۔ اس کے ایک جانب فلسطین دوسری جانب شمال کی طرف حمص اور جانب جنوب میں اردن۔ دمشق کی نہ کوئی بندرہ گاہ ہے نہ کوئی بندرگاہ ہو سکتی ہے۔ لبنان یا فلسطین جب تک راستہ نہ دیں اہل دمشق سمندر تک نہیں پہنچ سکتے۔

سیّدنا معاویہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صرف دمشق کے والی اور امیر تھے اور اگرچہ طبری کی تحقیق یہ ہے کہ سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہی نے علاقہ اُردن اُن کی ولایت میں داخل کر دیا تھا، مگر فرض کر لیجیے یہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے علاقہ اُردن ان کے سپرد کیا لیکن سوال یہ ہے کہ جب اس محاذ کا ذمہ دار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بنایا گیا تو کیا خلیفہ کا فرض نہیں تھا کہ ان کی قوت میں اضافہ کرے۔

دورِ خلافتِ راشدہ کے مالی اور فوجی نظام کی تفصیل تو بہت طویل ہے، لیکن اس مختصر بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علاقوں کے والی (گورنر یا کمشنر) اگرچہ صلح وجنگ کی پالیسی طے کرنے میں مرکز کے محتاج اور اسی کے تابع ہوتے تھے، مگر اپنے علاقہ کے تحفظ اور دفاع کی ذمہ داری زیادہ تر ان گورنروں پر ہی ہوتی تھی کسی شدید ضرورت کے وقت ہی مرکز سے امداد دی جاتی تھی ورنہ اپنے میزانیہ (بجٹ) کے ذمہ دار وہ خود ہوتے تھے۔ شریعت کی مقرر کردہ حدود کی پابندی لازمی ہوتی تھی۔ حدودِ شریعت سے باہر نہ کچھ وصول کیا جا سکتا تھا نہ خرچ، لیکن خرچ کے لیے جائز آمدنی کا اضافہ حکومت صوبہ کے ذمہ ہوتا تھا۔ اب غور فرمایئے اس محاذ پر

جیسے جیسے جنگ کے دامن پھیلتے رہے کیا اس کے مصارف کا تحمل وہ کرسکتا تھا جس کی آمدنی کے ذرائع حدود دمشق تک محدود ہوں اقدام کی اجازت دینا اور ذرائع آمدنی میں توسیع نہ کرنا سراسر ظلم تھا، نہ صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں بلکہ مفادِ ملت کے حق میں، عظمت اسلام کے حق میں۔

یہ معاملہ اردن اور حمص کا تھا کہا جاسکتا ہے کہ ان کا اضافہ اسی لیے کیا گیا کہ سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جنگ عظیم کے بڑھتے ہوئے مصارف پورے کرسکیں۔ باقی رہ گئے لبنان اور فلسطین وہ اگر الگ رکھے جاتے اور ولایتِ معاویہ رضی اللہ عنہ میں ان کو داخل نہ کیا جاتا تو اس کی مثال ایسی ہوتی کہ بحری جنگ کا ذمہ دار گورنر سندھ کو بنا دیا جائے اور کراچی اس کے حوالے نہ کیا جائے اس کا حکمران کوئی اور ہو۔

پھر جب اس بڑھتی ہوئی جنگ کا تقاضا یہ ہو کہ مملکتِ اسلامیہ کے ساحلی علاقوں کو محفوظ کیا جائے اور اس تحفظ کے لیے بحری بیڑہ بھی رکھنا ضروری ہو تو جب تک لبنان اور فلسطین اس کے زیرِ نگیں نہ ہوں تو کیا حاکم دمشق کے لیے ممکن تھا کہ بحری بیڑہ تیار کرلیتا اور مملکت اسلامیہ کے ساحلی علاقوں کو محفوظ کردیتا۔

یہ کھلی ہوئی باتیں اور واضح حقیقتیں ہیں، ان میں نہ سخن سازی ہے نہ تصنع اور تکلف، لیکن تعجب ہے مودودی صاحب ان کھلی ہوئی باتوں کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہیں اور کیوں الزام لگا رہے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی گورنری میں دمشق، حمص، فلسطین، اُردن اور لبنان کا پورا علاقہ جمع کردیا۔ (خلافت وملوکیت ص ۱۰۸)

بے شک جمع کردیا مگر رشتہ دار کی رعایت کے لیے یا اُس فرض کو انجام دینے کے لیے جو آپ پر بحیثیت خلیفہ واجب اور لازم تھا؟

صورتِ توسیع:

ان علاقوں کے امراء کو اگر معزول کردیا جاتا یا بدل دیا جاتا تو مصالح جنگ کے لحاظ سے وہ بھی غلط نہ تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے معزول کسی کو نہیں کیا بلکہ حمص وقنسرین کے والی حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ اپنی طویل علالت

کے باعث استعفے پر مجبور ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ کوئی والی مقرر نہیں کیا۔ بلکہ اس ضلع کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے صوبہ میں داخل کر دیا۔ (طبری ص ۶۹ ج ۵) والی فلسطین حضرت عبدالرحمٰن بن علقمہ کنعانی تھے[۱۲]۔

لطیفہ:

مودودی صاحب اس انداز سے یہ الزام لگا رہے ہیں کہ جیسے فلسطین، لبنان، اُردن اور حمص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاقہ میں شامل کر کے مملکتِ اسلامیہ کا بڑا حصہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔ حالانکہ ان سب کی حیثیت کمشنری سے زیادہ نہیں۔ مبالغہ سے کام لیا جائے تب کہا جا سکتا ہے کہ حمص کا علاقہ کمشنری کے برابر تھا ورنہ علاقہ حمص وقنسرین ایک کلکٹری کے برابر تھا۔ فلسطین ولبنان اور اُردن کے حدود ایک ایک کمشنری سے زیادہ نہیں۔ ان سب کو ملانے کے بعد بھی پورا علاقہ شام مملکت اسلامیہ کا آٹھواں یا دسواں حصہ ہوتا تھا۔ عراق، نجد، حجاز، مصر، ایران وغیرہ کے علاقے جو پورے شام کے برابر یا اس سے بھی زیادہ تھے۔ مملکت اسلامیہ کے صوبے تھے۔

یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے باہمی نزاعات کے بارے میں نہ لب کشائی درست ہے نہ خامہ فرسائی۔ اس لیے ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔

تبادلہ کیوں نہیں کیا:

مودودی صاحب بغض صحابہ کے مرض میں مبتلا اور شیعی پروپیگنڈے سے متاثر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملے میں آپ ''دیوانہ وراہوئے بس است'' کی مثال بن جاتے ہیں۔ بظاہر یہ اعتراض شیعوں کا ہے جس کو آپ نے اپنا لیا ہے کہ:

> ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مسلسل ۱۶-۱۷ سال تک ایک ہی صوبے کا گورنر رہنے دینا شرعاً ناجائز نہ تھا، مگر سیاسی تدبر کے لحاظ سے نامناسب ضرور تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ خواہ مخواہ کسی قصور کے بغیر ان کو

> معزول کر دیا جاتا۔ صرف یہ بات کافی تھی کہ ہر چند سال کے بعد ان کا تبادلہ ایک صوبے سے دوسرے صوبے کی گورنری پر کیا جاتا رہتا۔ اس صورت میں وہ کسی ایک صوبے میں بھی اتنے طاقتور نہیں ہو سکتے تھے کہ کسی وقت مرکز کے مقابلہ پر تلوار لے کر کھڑا ہونا ان کے لیے ممکن ہوتا۔ (خلافت وملوکیت ص۳۲۵ ج۳۲۶)

اس بات کو آپ نظر انداز کر دیجیے کہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی مدتِ خلافت صرف بارہ سال ہے اور آپ پر الزام وہ لگایا جا رہا ہے جس کی عمر ۱۶-۱۷ سال ہے۔ مودودی صاحب کی اس انصاف پسندی سے صرف نظر کرتے ہوئے ان حالات پر نظر ڈالیے جو سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اس محاذ پر پیش آئے جن کو تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ ان واقعی حالات کو سامنے رکھا جائے تو گویا مودودی صاحب کا منشاء ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا سیاسی تدبر یہ ہوتا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد:

(الف) جب رومی فوجیں یورش کرتے ہوئے شام میں گھس آئی تھیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی پوری طاقت نیز مرکز سے مدد حاصل کر کے ان کا مقابلہ کر رہے تھے۔

(ب) یا جب دشمن فوجوں کو دھکیلنے کے بعد قبرص پر حملہ کر رہے تھے کہ مملکتِ اسلامیہ اس کے خطرہ سے آئندہ محفوظ رہے۔

(ج) یا جب دفاعی طاقت کو مضبوط کرنے کے لیے بحری بیڑا ترتیب دے رہے تھے۔

(د) یا جب فتح قبرص کے بعد اس علاقہ کی مخالف طاقتوں کو زیر کرتے ہوئے ہیبتِ اسلام کا سکہ ان کے دلوں پر بٹھا رہے تھے۔

(ہ) یا جب اس محاذ کے سب سے بڑے معرکہ میں جو ''غزوۃ الصواری'' کے نام سے مشہور ہے جس میں شہنشاہِ روم قسطنطین اپنی پوری فوجی طاقت مسلمانوں کے استیصال کے لیے میدان میں لے آیا تھا۔ (طبری ص ۶۸، ۶۹ ج ۵) سیّدنا حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما غیرت اسلام اور حمیت وشجاعت کے وہ جوہر دکھا رہے تھے جنھوں نے مخالف پرچموں کو سرنگوں اور پرچم اسلام کو ہمیشہ کے لیے سربلند کیا۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا سیاسی تدبر یہ ہوتا کہ خاص ان حالات میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول نہ کرتے تو کم از کم ان کا تبادلہ کر دیتے۔ آپ خود فیصلہ فرمائیے کہ مودودی صاحب کا یہ ارشاد کہاں تک صحیح ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ ان غزوات سے فراغت کے بعد موقع تھا کہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا تبادلہ کر دیتے لیکن اس وقت اس زمانہ کا آغاز ہو چکا تھا جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کوفہ اور بصرہ کے گورنروں کا تبادلہ کر کے اس کے تلخ نتائج کا تجربہ کر رہے تھے۔ ان تبادلوں کا نتیجہ یہ تھا کہ جب بلوائیوں کے خلفشار سے کچھ پہلے سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے صوبجات کے امراء کا اجتماع کیا تو نہ گورنر بصرہ کوئی اطمینان بخش بات کہہ سکے نہ گورنر کوفہ۔ البتہ سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

قد ولیتنی امرًا وولیت قومًا لا یاتیک عنھم الا الخیر (طبری ص ۹۹ ج ۵)

"آپ نے مجھے حکومت کا ایک منصب عطا فرمایا ہے۔ آپ نے ایک ایسی قوم کا حاکم بنایا ہے کہ اس سے آپ کو بھلائی ہی پہنچے گی۔"

اس موقع پر آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ وہ آپ کے ساتھ شام تشریف لے چلیں تو ان شرارتوں سے محفوظ رہیں گے۔ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں اپنے آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر اور اپنے دار الہجرت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں یہاں ایک فوج مقرر کر دوں، فرمایا اس سے اہل مدینہ کو پریشانی ہوگی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپ کے متعلق بہت خطرہ ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جواب تھا:

حسبنا اللہ ونعم الوکیل

بہرحال یہ درست ہے کہ سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ مضبوط امیر اور گورنر تھے اور یہ بھی درست ہے کہ ان کی جڑیں جمی ہوئی تھیں، مگر یہ مضبوطی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خویش نوازی کی رہین منت نہیں تھی، بلکہ جڑیں تو اس وقت جمی تھیں جب فتوحاتِ

شام کے سلسلہ میں اُن کے پورے گھرانے (باپ، بھائی، والدہ، بہن، بہنوئی) نے غیر معمولی قربانیاں پیش کی تھیں، کیونکہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ ہم نے اسلام لانے میں دیر کی ہے۔ اس لیے ہم بہت پچھڑ گئے ہیں۔ اب ہم سابقین اوّلین کے ہم دوش جب ہی ہو سکتے ہیں کہ اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے غیر معمولی قربانیاں پیش کریں۔ (البدایۃ والنہایۃ ص ۱۱۸ ج ۸)

پھر یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی عمل نہیں بلکہ محض اللہ کا لطف و کرم تھا کہ اُس نے اس خاندان کو غیر معمولی قربانیاں پیش کرنے اور عظیم الشان خدمات انجام دینے کا موقع بھی عنایت فرمایا۔ مثلاً حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد رومیوں نے یورش کی اور اس محاذ کے حالات نے اقدام کا تقاضا کیا تو جس بلند آہنگی اور اولوالعزمی سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس تقاضے کو پورا کیا۔ اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کسی فعل کو دخل نہیں تھا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا کہ اس نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ توفیق بخشی۔ یہ توفیق ایک کرامت تھی جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ظاہر ہوئی۔ یعنی صرف پانچ چھ سال کے عرصہ میں فتوحاتِ اسلام کا دائرہ آپ کی زیر قیادت کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ ایک مضبوط بحری بیڑہ تیار ہو گیا۔ یورپ کی تمام جبروتی طاقتیں جو اسلام کے خلاف تھیں وہ مرعوب اور ہیبت زدہ ہو گئیں اور مسلمانوں کے حوصلے اتنے بلند ہو گئے کہ بڑے سے بڑا طاقتور صاحبِ اقتدار بھی ان کی نظر میں ہیچ تھا۔

تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خود حضرت معاویہ اور سیّدنا علی رضی اللہ عنہما میں مقابلہ شروع ہو گیا تو شکست خوردہ قیصر روم نے اس خانہ جنگی کو اپنے لیے فالِ نیک سمجھا۔ اُس نے "جنودِ عظیمہ" (بڑی بڑی فوجیں) جمع کیں اور اچانک حملہ کرنے کے لیے مملکتِ اسلامیہ کی سرحد کے قریب پہنچ گیا۔ سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو جیسے ہی معلوم ہوا قیصر کو ایک تہدید آمیز خط لکھا۔ مضمون خط سے زیادہ خط کا انداز ملاحظہ فرمائیے۔ مملکت اسلامیہ کا ایک گورنر شہنشاہ روم کو کس نظر سے دیکھ رہا ہے اور کس طرح خطاب کر رہا ہے:

"او لعین! واپس لوٹ جا۔ اگر تو اپنے ملک کی طرف واپس نہ لوٹا تو میں

خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تیرے مقابلہ پر میں اور میرے ابن عم (حضرت علی رضی اللہ عنہ) صلح کر لیں گے۔ پھر میں تجھ کو تیرے اپنے شہروں سے بھی نکال دوں گا اور زمین کی تمام وسعت کو تجھ پر تنگ کر دوں گا۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ نے مکتوب گرامی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔

واللّٰہ لئن لم تنتہ ولم ترجع الی بلادک یالعین لا صطلحن انا وابن عمی علیک ولاخرجنک من جمیع بلادک ولا ضیقن علیک الارض بمارحبت (البدایہ والنہایہ ص ۱۱۹ ج ۸)

مرکز کے قابو میں نہ رہے:

اب یہ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مرکز کے قابو میں نہ رہے۔ (ص ۱۱۵ خلافت وملوکیت)
تلوار لے کر اُٹھ کھڑا ہونا ان کے لیے ممکن ہوگیا۔ (ص ۳۲۶ خلافت وملوکیت)

تو حقیقت یہ ہے کہ مقابلہ امیر المومنین سیّدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا نہیں تھا۔ یہ تو اُن میں سے تھے جن کے متعلق کلام الٰہی نے بشارت دی ہے۔

ان المتقین فی جنات وعیون ادخلوھا بسلام اٰمنین ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانًا علٰی سررٍ متقابلین لا یمسھم فیھا نصبٌ وماھم عنھا بمخرجین

"متقی حضرات باغات میں ہوں گے جن میں چشمے بہہ رہے ہوں گے ان سے کہا جائے گا کہ سلامتی کے ساتھ ان میں داخل ہو جاؤ۔ ہر طرح کا امن واطمینان اُن کو میسر ہوگا اور ان کے دلوں میں جو کچھ رنجش تھی وہ ہم نے نکال دی۔ وہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر (جلوہ افروز) ہوں گے وہاں نہ کسی طرح کا صدمہ اُن کو چھو سکے گا اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔" (سورہ ۱۵ حجر، آیت ۴۵-۴۶)

مقابلہ تھا اہلِ شام کا اور عراق کے اُن شورہ پشتوں کا جن کا نصب العین تخریب تھا جنہوں نے سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوہ کیا یہاں تک کہ ان کو شہید کر دیا۔ پھر سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دست مبارک پر بیعت کر کے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے مارِ آستین بن گئے۔

پھر ان سے ہی تعلق رکھنے والا بڑا عنصر خارجی ہو گیا جو اپنے سوا ہر ایک مسلمان کو واجب القتل کافر سمجھتا تھا جو اگرچہ سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ مگر ظاہر ہے امیر المومنین سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بھی بہت بڑی طاقت کو بے محل صرف کرایا۔ (اختصار یہ ہے، تفصیلات کتابوں کے سینکڑوں صفحات میں ملاحظہ فرمایئے)۔

نئے لوگوں کی شرکت اور ان کی پیش روی:

سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اصرار پر خلیفۂ سوم امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بحری جنگ کی اجازت دی لیکن بظاہر خلیفۂ دوم فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی پالیسی کا احترام کرتے ہوئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت بھی کر دی کہ وہ اپنی طرف سے کسی کو منتخب یا نامزد نہ کریں۔ نہ قرعہ اندازی سے محاذ پر جانے والوں کو طے کریں، بلکہ ان کو پورا اختیار دے دیں جو اپنی خوشی سے غزوہ کرنے اور محاذ پر جانے کو طے کرے اس کے لیے سامان فراہم کریں اور اس کو مدد دیں۔ (طبری ص ۵۲ ج ۵)

اس ہدایت کے نتائج دوررس ہوئے۔ بہت سے وہ آگے آ گئے جن کا پہلے وجود بھی نہیں تھا۔

مصر، حضرت عمرو بن العاص اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہما

مودودی صاحب نے حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں ایسے اختصار سے کام لیا جو مغالطہ انگیز ہی نہیں بلکہ توہین آمیز بھی ہے۔ فرماتے ہیں:

حضرت عمرو بن العاص کو مصر کی گورنری سے ہٹا کر اپنے رضاعی بھائی

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مقرر کیا۔ (ص ۱۰۷)

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اُن (حضرت فاروق رضی اللہ عنہ) کے زمانے میں مصر کے ایک فوجی افسر تھے اور بعد میں صعید مصر کے عامل بنا دیے گئے تھے۔ (ص ۳۲۴)

پھر فرماتے ہیں۔

دراصل ان کے اس طرزِ عمل کی بنیاد وہی تھی جو انہوں نے خود بیان فرمائی ہے کہ وہ اس کو صلہ رحمی کا تقاضا سمجھتے تھے۔ (ص ۳۲۱)

لیکن اسے اجتہادی غلطی کہنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ کیونکہ صلہ رحمی کا تعلق ان کی ذات سے تھا نہ کہ ان کے منصب خلافت سے۔ (ص ۳۲۱)

یہ ہے مودودی صاحب کی طباعی اور نکتہ آفرینی۔ خود ہی سوال اور اعتراض تصنیف فرما رہے ہیں اور خود ہی اس کا جواب دے کر سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی (بخیال خود) حمایت فرما رہے ہیں، لیکن حمایت فرماتے ہوئے بھی آدھی بات پیش فرما رہے ہیں۔ آدھی بات جو مودودی صاحب کی منشا کے خلاف ہے اس کو حذف فرما رہے ہیں۔

سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پوری تقریر جو آپ نے اہل مدینہ کے مجمع عام میں فرمائی تھی جس میں اعتراضات کا دندان شکن جواب دیا تھا وہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ اس میں آپ نے اپنے رشتہ داروں کے سلسلہ میں یہ بھی فرمایا تھا۔

''مجھے اُن سے محبت ضرور ہے مگر کسی غلط بات میں میری محبت کبھی ان کی طرف مائل نہیں ہوئی۔''

بل احمل الحقوق علیھم (طبری ص ۱۰۳ ج ۵)

''بلکہ میں اُن کے اُوپر حقوق لادتا ہوں (اُن پر فرائض عائد کرتا ہوں)''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کی تصدیق [۱۳] ان کے طرزِ عمل سے ہوتی ہے۔ مثلاً جس سال خلیفہ ہوئے اسی سال اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو جن کی عمر تقریباً بیس سال تھی کابل کی مہم پر بھیجا۔ انہوں نے اس پورے علاقہ کو فتح کیا۔ اس کے بعد

ان کو بصرہ کا حاکم بنایا۔ ولید بن عقبہ (ماں شریک بھائی) فتوحاتِ شام میں حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے شریکِ کار رہے پھر آذر بائیجان وغیرہ کی بغاوت کو فرو کر کے ان علاقوں کو گویا دوبارہ فتح کیا۔ اس کے بعد ان کو کوفہ کا حاکم بنایا۔ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ پہلے طبرستان کی مہم میں بہادری اور تدبر کے جوہر کامیابی کے ساتھ دکھا چکے تھے۔ اس کے بعد ان کو اہل کوفہ کے مشورہ سے حضرت ولید رضی اللہ عنہ کی جگہ کوفہ کا حاکم بنایا۔ ان تمام واقعات کی تفصیل طبری وغیرہ کے حوالہ سے پہلے گزر چکی ہے۔ اسی طرح کا معاملہ حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔

مودودی صاحب کے طرز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح فوج کے کوئی حوالدار یا کپتان تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رشتہ داری کی بناء پر ان کو بڑھایا۔ حتیٰ کہ فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو گورنری سے ہٹا کر عبداللہ بن سعد کو ان کی جگہ مصر کا گورنر بنا دیا۔

لیکن ہمیں معاف کیا جائے اگر ہم اس کو کوتاہ علمی قرار دیں جس کے ساتھ زعم ہمہ دانی ملا ہوا ہے۔

وہی علامہ ابن جریر طبری جن کو مودودی صاحب مستند ترین مؤرخ جانتے ہیں اگر مودودی صاحب انہیں کا بیان دیکھ لیتے تو ایسا افتراء تصنیف نہ کرتے۔

علامہ طبری فرماتے ہیں [۱۴]۔

> "جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے اس وقت حضرت عمرو بن العاص مصر کے حاکم تھے اُن کو اپنے منصب پر بحال رکھا اور عبداللہ بن سعد کو جن کا تعلق مصر کی فوج سے تھا ان کو فوج کا امیر بنایا۔ ان کو ایک فوج دی اور ان کو افریقہ روانہ کر دیا جہاں انہوں نے غیر معمولی فتوحات حاصل کیں۔ بہت کافی مالِ غنیمت حاصل کیا۔ جب واپس آئے تو افواجِ مصر کے افسرِ اعلیٰ یہ تھے اور تحصیلِ محاصل (خراج) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ (گورنر صوبہ) کے سپرد تھا۔ (تاریخ طبری ص ۴۹، ۵۰ ج ۵)

بہر حال طبری رحمۃ اللہ علیہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے رشتہ دار عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو یونہی گورنر مصر نہیں بنا دیا بلکہ پہلے ان کو افریقہ بھیجا۔ وہاں فتوحات حاصل کرنے کے بعد بھی دفعۃً گورنر مصر نہیں بنا دیا بلکہ پہلے ان کو فوج کا افسر اعلیٰ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بدستور گورنر رکھا۔ تحصیل محاصل کے ذمہ دار حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ تھے۔ پھر ایک موڑ ایسا آیا کہ ان دونوں میں بحث شروع ہو گئی۔ تب ایسا ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو واپس بلا لیا اور حضرت عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ کو گورنر بنا دیا۔

تبدیلی کی وجہ:

تبدیلی کی وجہ بہت عجیب ہے۔ مگر اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے انصاف کی نعمت بخشی ہو۔ اس کا دل تنقیص صحابہ کے مرض سے پاک ہو اور عشر و خراج وغیرہ کے مسائل سے اس کو واقفیت ہو۔ چند باتیں آپ ذہن نشین فرما لیں گے تو خود آپ کا فیصلہ ہوگا کہ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا وہ نہایت صحیح تھا۔ اگر کچھ خرابی یا غلطی تھی تو صرف یہ کہ عبداللہ بن سعد کی اولوالعزمی اقدام کی پالیسی کے عین مطابق تھی جو سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ایک باحوصلہ افسر تھا وہ جس طرح افریقہ کے ایک حصہ میں فتح حاصل کر چکا تھا وہ فتوحات کے سلسلہ کو اولوالعزمی اور حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھانا چاہتا تھا۔

خلیفہ سوم سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اگر چہ پچھتر سالہ بوڑھے تھے، مگر فتوحاتِ اسلامیہ کو بڑھانے اور بحر و بر پر اسلامی اقتدار کا پرچم لہرانے کے شوق میں وہ پر جوش نوجوان تھے۔

(۱) اس میں شک نہیں کہ سیّدنا حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فاتح مصر تھے، لیکن فتح افریقہ کے لیے سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا تھا۔ یہ اس کی تعمیل کر چکے تھے اور اب مصر تشریف لے آئے تھے جو افریقہ کا مرکز تھا اور خود مودودی صاحب کو اعتراف ہے کہ افریقہ کے تمام مفتوحہ علاقے مصر کے گورنر کے ماتحت

تھے۔ (خلافت وملوکیت ص ۳۲۳)

حضرت عبداللہ بن سعد کو ''جند'' پر مقرر کیا گیا۔ (طبری ص ۴۹، ج ۵)

تو آپ کا فرض صرف یہ نہیں تھا کہ جو فوجیں مصر کی چھاؤنی میں ہوں ان کی نگرانی کرتے رہیں بلکہ آپ کا فرض یہ تھا کہ مصر کے علاوہ افریقہ کے فوجی اور جنگی تقاضوں کا بھی آپ لحاظ رکھیں اور جو ضرورتیں پیش آئیں ان کو پورا کریں۔

اب بحیثیت قائد افواج یا ''جرنیل''، فوجی ضرورتیں آپ کے سامنے تھیں، لیکن ان کی تکمیل کے لیے آپ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی منظوری کے محتاج تھے۔ کیونکہ مالیات کا تعلق گورنر ہونے کی حیثیت سے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے ہی تھا۔

(۲) افریقہ کا جو حصہ بھی آپ نے فتح کیا تھا اگرچہ افریقہ سے واپسی کے وقت اس کا حاکم اور امیر آپ نے عبداللہ بن نافع بن عبد قیس کو بنا دیا تھا۔ (طبری ص ۵۰، ج ۵) مگر معاملہ اس پر ختم نہیں ہو گیا تھا بلکہ یہ فتح ایک شعلہ تھا جو افریقہ کے جنگل میں بھڑکایا گیا تھا۔ قدرتی طور پر اس کی لپٹیں سب طرف پھیلنے والی تھیں اور تقاضا تدبر یہ تھا کہ ان کے مقابلہ کا پورا انتظام پہلے سے کر لیا جائے۔

(۳) افریقہ کا جو علاقہ فتح کیا تھا اس کے لیے بحری جنگ کی ضرورت نہیں ہوئی تھی، لیکن یہ علاقہ قیصر روم کے زیر اقتدار تھا اور اس کو فتح کرنے کے معنی یہ تھے کہ بازنطینی شہنشاہیت کے مقابلہ کے لیے ایک اور محاذِ جنگ قائم کر دیا گیا تھا اس بناء پر یہ بات یقینی تھی کہ قیصر کا بحری بیڑہ حرکت میں آئے اور بحری جنگ کا سلسلہ شروع ہو جس کے مقابلہ کے لیے لازمی اور ضروری تھا کہ مسلمانوں کا بھی بحری بیڑہ ہو اور اس کے تمام مصارف فوری طور پر برداشت کیے جائیں۔

(۴) جو باتیں گزشتہ تین نمبروں میں بیان کی گئیں ان سے مصر کے گورنر سیّدنا حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بھی انکار نہیں تھا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ مصارف جنگ مرکز سے طلب کیے جائیں یا خود مصر میں یہ گنجائش ہے کہ پورے مصارف ورنہ ان کا بڑا حصہ یہاں سے وصول کیا جائے۔

یہ تھا نقطۂ اختلاف سیّدنا حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور سیّدنا عبداللہ بن سعد بن

ابی سرح رضی اللہ عنہ کا۔ عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ یہ مصارف جائز طور پر بسہولت مصر سے وصول ہو سکتے ہیں اور حکومت اسلامیہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وصول کرے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اس کے مخالف تھے۔

(۵) اس گنجائش اور عدم گنجائش کا مدار اس پر تھا کہ فتح کے وقت جو معاہدات ہوئے ان کی رُو سے حکومت کو کچھ ردوبدل اور اراضی کے جدید بندوبست کا حق ہے یا حکومت پابند ہے وہ کچھ ردوبدل نہیں کر سکتی۔

(۶) سیّدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے صرف ساڑھے تین ہزار مجاہدین کی فوج سے مصر پر حملہ کر دیا تھا اور کچھ علاقہ فتح بھی کر لیا تھا، لیکن خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اتنی فوج کو ناکافی سمجھا۔ آپ نے فوراً ہی دس یا بارہ ہزار فوج دے کر سیّدنا حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو مصر بھیج دیا۔ (فتوح البلدان ص ۲۲۰ و ۲۲۱) ان دونوں بزرگوں کے مجاہدانہ اقدامات کامیاب ہوئے اور مصر فتح ہو گیا۔

(۷) مفتوحہ علاقوں سے عشر، خراج، جزیہ وغیرہ لینے کے بارے میں جو اسلامی روایات اور ضابطے ہیں ان کے لحاظ سے فتح کی نوعیت سب جگہ یکساں نہیں رہی۔ بلکہ مختلف علاقوں میں مختلف نوعیتیں رہیں۔

(۸) اسلامی روایات اور فقہی تشریحات کے مطابق مفتوحہ اراضی کے متعلق ایک طریقہ یہ ہے کہ یہ اراضی مجاہدین کو تقسیم کر دی جائیں، وہ ان کے مالک قرار دیے جائیں۔ ان اراضی پر خراج نہیں ہو گا بلکہ ان کی پیداوار کا عشر (دسواں حصہ) اُس سے لیا جائے گا اور اگر آبپاشی کا انتظام صاحب زمین کو خود کرنا پڑے تو اس سے نصف عشر یعنی پیداوار کا بیسواں حصہ لیا جائے گا، بشرطیکہ کاشت کی جائے اور اگر یہ مالک کاشت ہی نہ کرے تو کچھ بھی لازم نہیں ہوتا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مفتوحہ اراضی مجاہدین پر تقسیم نہ کی جائیں۔ اب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اراضی بیت المال (حکومت) کی ملک قرار دی جائیں وہ وقتاً فوقتاً ان کا بندوبست کرتی رہے اور حسب حال کاشت کاروں سے خراج کا معاملہ کرتی رہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اراضی سابق مالکوں یا کاشتکاروں کی ملک قرار دی جائیں اور ان سے ان کا خراج وصول کیا جائے جو

حکومت اور کاشت کاروں کے درمیان باہم طے ہو جائے۔ پھر یہ لازم نہیں کہ یہ خراج دوامی ہو بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محدود مدت کے لیے ایک خراج طے ہو جائے پھر حکومت کو حق رہے کہ وہ اس میں قابل برداشت جائز ردّ و بدل کر سکے۔

(۹) فتح مصر کے بعد سیّدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے گورنر مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے فرمائش کی کہ مفتوحہ اراضی مجاہدین پر تقسیم کر دی جائیں۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے خلیفۂ دوم حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو لکھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی پالیسی یہ تھی کہ مفتوحہ اراضی تقسیم نہ کی جائیں، کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجاہدین تو بڑے بڑے زمیندار بن جائیں گے لیکن بعد کی آنے والی نسلیں محروم رہ جائیں گی۔ لہٰذا آپ اراضی مفتوحہ کو بیت المال کی ملک قرار دے کر مجاہدین کے وظائف مقرر فرما دیتے تھے۔ اسی کی ہدایت آپ نے اراضی مصر کے متعلق بھی فرمائی۔ (فتوح البلدان ص ۲۲۱ و ۲۲۵) لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ اراضی مصر کو عشری نہیں قرار دیا گیا۔

(۱۰) جب کہ اراضی مصر عشری نہیں یعنی مجاہدین میں تقسیم نہیں کی گئیں تو اضافہ آمدنی کی متعدد صورتیں ممکن تھیں جو اراضی ملکِ حکومت تھیں۔ حکومت ایسی صورتیں اختیار کر سکتی تھی کہ ان کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے اور ادا کرنے والوں پر بار نہ ہو۔ بہت سے علاقے وہ تھے کہ وہاں کے باشندوں سے کوئی معاہدہ ہی نہیں ہوا تھا۔ مثلاً قبطیوں کے متعلق ایک مرتبہ خود حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے منبر پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

> ''ان سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا، میں ان کو قتل بھی کر سکتا ہوں، ان پر جزیہ بھی مقرر کر سکتا ہوں اور ان کو غلام بنا کر فروخت بھی کر سکتا ہوں۔ البتہ ''اطابلس'' والوں سے معاہدہ ہوا ہے اس کا پورا کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔'' (فتوح البلدان ص ۲۲۴)

بعض علاقوں کے باشندوں سے کچھ غلہ سالانہ مقرر کیا گیا۔ بعض سے کپڑوں وغیرہ کے متعلق معاہدہ ہوا کہ اتنے جبے اونی یا سوتی، اتنے عمامے، خف (چمڑے کے موزے) وغیرہ دیے جائیں گے۔ (فتوح البلدان ص ۲۲۲)

اسکندریہ کے نواب (مقوقس) سے معاہدہ ہوا تھا کہ جو ٹیکس وہ ہرقل (قیصر روم) کو ادا کرتا ہے، اتنا ہی مسلمانوں کو ادا کرے گا۔ اس طرح مقوقس نے مسلمانوں سے تو صلح کر لی مگر ہرقل اس سے مشتعل ہو گیا اور اس نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کو شکست ہوئی جو ان کا اثر مقوقس پر تھا وہ ختم ہو گیا (طبری وغیرہ) لہٰذا وہ ٹیکس بھی ختم ہو گیا جو مقوقس ہرقل کو دیا کرتا تھا۔ اب مسلمانوں کا حق تھا کہ اس ٹیکس کو وہ خود وصول کریں۔

بہر حال ان دونوں بزرگوں (حضرت عمرو بن العاص اور حضرت عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہما) کی رائیں مختلف تھیں۔ ان حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی ایک دوسرے کی شکایت کی۔ ایک نے شکایت کی کہ میری جنگی ضرورتوں میں کسر کی جا رہی ہے۔ دوسرے نے شکایت لکھی کہ میرے مالی نظام میں رخنہ اندازی کی جا رہی ہے۔ (طبری ص ۵۱، ج ۵)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ اقدام کی پالیسی میں متحد تھے۔ اب اس رائے میں بھی ان کا اتحاد ہو گیا کہ آمدنی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے استعفاء طلب کر لیا۔ حضرت عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ نے اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنایا تو پہلے ہی سال آمدنی دوگنی ہو گئی۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں آمدنی بیس لاکھ تھی۔ اس سال حضرت عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں پہلے ہی سال چالیس لاکھ آمدنی ہو گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ آپ کے بعد مصر کی اونٹنیاں زیادہ دودھ دینے لگیں۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا مگر ان کے بچوں کو آپ لوگوں نے سکھا دیا۔ (فتوح البلدان ص ۲۲۳ و طبری ص ۵۱ ج ۵)

دوسری وجہ:

علامہ ابن عبدالبر نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی معزولی کی وجہ دوسری بیان کی ہے کہ اہل اسکندریہ کی ایک حرکت کو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے عہد شکنی قرار دیا۔ چنانچہ ان پر حملہ کر کے بالغ مردوں کو قتل کرا دیا، عورتوں، بچوں کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد ان کو

غلام کی حیثیت سے تقسیم بھی کر سکتے تھے اور فروخت بھی کر سکتے تھے۔ اس کا مرافعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عدالت میں پیش ہوا تو انہوں نے اس حرکت کو نقض عہد نہیں قرار دیا۔ آپ نے عورتوں اور بچوں کو رہا کرا دیا اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو گورنری سے معزول کر دیا۔

(الاستیعاب (ذکر عبداللہ بن سعد ص ۳۹۴)

علامہ ابن عبدالبر کے بیان کو بھی سامنے رکھا جائے تو واقعات کی ترتیب یہ ہے کہ اضافہ مالیہ کے سلسلہ میں قصہ چل رہا تھا کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے یہ غلطی بھی ہوگئی جس کی بناء پر بلا تاخیر معزول کر دیا گیا۔

یہ ہے واقعات کی صحیح نوعیت جو کتبِ تاریخ سے ثابت ہے۔ جن میں سے فتوح البلدان اور تاریخ طبری کا حوالہ ہم نے دیا۔ ان کے علاوہ اور کتابوں میں بھی یہ واقعات موجود ہیں، مگر مطالعہ کتب کی کاوش وہی برداشت کرے گا جو معاملہ کی تہہ تک پہنچنا چاہے اور جس کا مقصد صرف اعتراض اور الزام لگانا ہو اس کو اس کاوش کی کیا ضرورت ہے۔

''دیوانہ را ہوائے بس است''

نظامِ حکومت میں ایسی تبدیلی قابل اعتراض نہیں ہے بلکہ حکومت کی صلاحیت اور اس کے ترقی پذیر ہونے کی علامت ہے، مگر اس کا کیا علاج کہ:

ہنر بچشم عداوت بزرگ ترعیبے است

پاس قرابت:

نفل یعنی حوصلہ افزائی کے لیے مجاہدین سے کسی انعام کا وعدہ کر لینا کوئی نئی بات نہیں تھی بقول حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پھر سیّدنا ابوبکر صدیق اور عمر و فاروق رضی اللہ عنہما بڑے بڑے انعامات کا وعدہ فرماتے رہے تھے۔ اسی اصول اور رائج شدہ قاعدہ کے بموجب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی جب عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو فتح افریقہ کے لیے روانہ فرمایا تو اُن سے خمس الخمس کا وعدہ فرما لیا تھا یعنی مرکزی بیت المال کو جو خمس وصول ہوگا اس کا پانچواں حصہ حضرت عبداللہ بن سعد کو دے دیا جائے گا۔ یہ خمس الخمس یعنی پورے مالِ غنیمت کا ۲۵/۱ ایک لاکھ ہوتا تھا جو فتح ہونے پر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو دے دیا

گیا۔ مگر پھر ایک وفد حضرت خلیفہ سوم کی بارگاہ میں حاضر ہوا کہ اس کا اثر اچھا نہیں پڑا۔ دوسرے فوجیوں کو شکایت پیدا ہوئی۔

یہ موقع تھا کہ سیّدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قرابت کا خیال رکھتے اور مبلغ ایک لاکھ کی رقم جو اُن کے عزیز عبداللہ بن سعد کو بالکل جائز طریقے پر دی گئی تھی جس میں عدم جواز کا معمولی شائبہ نہیں تھا، واپس نہ لیتے، مگر سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرابت کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ اور تمام رقم واپس کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔

فرددته عليهم وليس ذلک لهم

''میں نے اس کو واپس کرا دیا حالانکہ اعتراض کرنے والوں کو اعتراض کا حق نہیں تھا۔'' (طبری ص ۱۰۳)

ہولناک بحری جنگ اور ابن سبا کے ایجنٹوں کی شرارت

جیسا کہ یقین تھا کہ قیصر روم افریقہ میں مسلمانوں کی فتوحات کو برداشت نہیں کرے گا اور مفتوحہ علاقوں کو واپس لینے کی جان توڑ کوشش کرے گا۔ واقعہ یہی ہوا سن ۳۱ھ میں قسطنطین بن ہرقل نے اتنی بڑی فوج سے حملہ کیا کہ بقول علامہ ابن جریر۔

لم يجتمع للروم مثله قط منذ كان الاسلام

''جب سے مسلمانوں کے اقدام کا سلسلہ شروع ہوا تھا رومیوں کی اتنی بڑی فوج مقابلہ پر نہیں آئی تھی۔'' (طبری ص ۶۹ ج ۵)

قسطنطین نے بری جنگ کے ساتھ بحری جنگ کی بھی تیاری اتنے بڑے پیمانہ پر کی کہ پانچ سو جنگی جہازوں کا بیڑا مسلمانوں کے مقابلہ پر لے آیا۔

حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی دور اندیشی اس موقع پر کام آئی۔ ایسی ہولناک صورتحال کے مقابلہ کے لیے انہوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے لڑ جھگڑ کر مصر کی آمدنی بڑھائی تھی اور فوجی طاقت خصوصاً بحری قوت فراہم کی تھی۔

بہر حال مقابلہ بہت سخت تھا اور اس لیے بھی سخت تھا کہ مسلمانوں کو باضابطہ بحری جنگ کا

تجربہ اب تک نہیں ہوا تھا۔ اُن کے لیے سمندری لڑائی کی ہر چیز نئی تھی۔ اتفاق سے پہلے روز مسلمانوں کو ''بادِ مخالف'' کی مخالفت بھی جھیلنی پڑی۔ مسلمانوں نے رومیوں کو دعوت دی کہ دونوں فوجیں جہازوں سے اُتر کر زمین پر مقابلہ کریں، لیکن رومی بحری جنگ کو ہی کامیابی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے یہ مشورہ مسترد کر دیا۔ اب بنامِ خدا مسلمانوں نے ہمت کی جہازوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر میدانِ جنگ بنایا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ سمندر کا پانی خون ہی خون ہو گیا۔ سمندر کی لہریں خون کے لوتھڑوں کو ساحل تک پہنچا رہی تھیں۔ مسلمان بھی بہت زیادہ شہید ہوئے اور حریف کی تو تقریباً تمام ہی فوج ختم ہو گئی۔

قسطنطین فرار پر مجبور ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو استقلال واستقامت کی توفیق بخشی اور شاندار کامیابی عطا فرمائی۔ جس کے بعد سمندری لڑائیوں کے لیے بھی مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔

یہ حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا عظیم الشان کارنامہ تھا۔ مگر بدقسمتی یہ تھی کہ عبداللہ بن سبا کا فتنہ شروع ہو چکا تھا اور اس کے ایجنٹوں نے فتنہ انگیزی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ یہاں بھی اس کے دو ایجنٹ موجود تھے۔ محمد بن حذیفہ اور محمد بن ابی بکر، یہ لوگوں کو بھڑکاتے رہتے کہ:

> یہ جہاد، جہاد نہیں ہے۔ یہ شخص عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اس قابل نہیں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے۔ یہ وہ ہے جو ایک دفعہ اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا خون مباح کر دیا تھا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک مغالطہ دے کر ان کو معاف کرا دیا۔ جہاد یہاں نہیں ہے جہاد کا اصل مقام مدینہ ہے جہاں عثمان بن عفان خلافت پر قابض ہے۔ نہ اس کی خلافت صحیح، نہ اُس کے نائبوں کی قیادت صحیح ہے، نہ اس کے ساتھ جہاد کرنا صحیح ہے اس کا خون مباح اور جس نے اس کو امیر البحر بنا رکھا ہے اس کا خون مباح اور اس کے خلاف جہاد کرنا لازم ہے۔ (طبری ص ۷۱ ج ۵، ابن اثیر ص ۵۸ ج ۳ و ابن خلدون وغیرہ)

واقعہ یہ ہے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت غلط ہوتی، آپ خلیفہ راشد نہ ہوتے اور حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ خلیفۂ راشد کے صحیح نائب نہ ہوتے تو خلیفہ اور نائب خلیفہ کا خون مباح کرنے والوں کا خون مباح ہو جاتا اور اس مباح پر عمل بھی کر لیا جاتا یعنی ان دونوں کی تواضع شمشیر آبدار سے کر لی گئی ہوتی، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے نائبین کا تحمل بھی کرامت کا درجہ رکھتا تھا۔

ان دونوں غدار باغیوں کو صرف یہ ہدایت کی گئی کہ وہ فوج سے الگ رہیں اور دوسرے جہاز پر سوار ہوں۔

مودودی صاحب کے اعتراض کا ماخذ:

غور فرمایئے! ان غدار باغیوں کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو موجودی صاحب نے کس طرح حرزِ جان بنالیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ تو مسلمان ہو کر مرتد ہو چکے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر جن لوگوں کے بارے میں یہ حکم دیا تھا کہ اگر وہ خانہ کعبہ کے پردوں سے بھی لپٹے ہوئے ہوں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ یہ ان میں سے ایک تھے۔ حضرت عثمان انہیں لے کر اچانک حضور کے سامنے پہنچ گئے اور آپ نے محض اُن کے پاسِ خاطر سے ان کو معاف فرما دیا تھا۔ (خلاف وملوکیت ص ۱۰۹)

مودودی صاحب نے ان باغیوں کے الفاظ رٹ لینے کا اجر عظیم حاصل نہیں کیا بلکہ اپنے ایک اجتہاد کا بھی مظاہرہ فرما دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کسی کی پاس خاطر سے حلال کو حرام قرار دے دیا کرتے تھے اور حرام کو حلال۔ (معاذ اللہ)

عجیب وغریب ذہنیت:

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس ذہنیت کے لیے کیا لفظ استعمال کریں جو حضرات صحابہ رضی اللہ

عنہم کی کمزوریوں کو تو تلاش کرتی ہے اور اس کے بیان کرنے میں قلم کا پورا زور صرف کر دیتی ہے لیکن جو خوبیاں ہوتی ہیں وہ گویا اس کو نظر ہی نہیں آتیں گویا قوتِ بینائی سلب ہو جاتی ہے۔
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سعد کو جو انعام عطا فرمایا تھا وہ بعد میں واپس ہو گیا۔ مودودی صاحب نے اس کو خوب اچھالا، لیکن مودودی صاحب کا قلم ٹوٹ گیا۔ روشنائی خشک ہو گئی جب یہ لکھنے کا وقت آیا کہ حضرت عبداللہ نے فتوحات کے ساتھ ایک مضبوط بحریہ بھی تیار کیا اور وہ عرب جن کی بحری طاقت صفر تھی ان کو بحری جنگ کا ماہر بنایا ان کی بحری طاقت کو اس زمانہ کے لحاظ سے عروج کے آخری نقطہ پر پہنچا دیا اور افریقہ کے میدانوں ہی کا نہیں بلکہ افریقہ سے ملنے والے سمندروں کا بادشاہ بھی بنا دیا۔ صدیاں گزر گئیں اور ان کی اس بادشاہت میں زوال نہ آیا۔

اس سے زیادہ مودودی صاحب کی یہ بے انصافی مستحق صد ملامت ہے کہ عبداللہ بن سعد کا یہ عیب تو بیان کیا کہ وہ مرتد ہو گئے تھے، لیکن انہیں کے تذکرہ کے آخر میں جوان کی وفات کا قابل رشک تذکرہ ہے۔ اس کو بیان کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ استیعاب اور اصابہ وغیرہ میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ سیاسیات سے کنارہ کش ہو کر عسقلان تشریف لے گئے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی نہ حضرت معاویہ کے ساتھ شریک ہوئے اور دعا مانگی کہ حالت نماز میں میری وفات ہو۔ چنانچہ نماز صبح کے بعد ایک طرف سلام پھیر چکے تھے دوسری طرف سلام پھیرنے والے تھے کہ روح پرواز کر گئی۔

رضی اللہ عنہ وارضاہ

مروان بن الحکم اور الحکم بن ابی العاص

حیثیتیں اور رعایتیں

مودودی صاحب فرماتے ہیں:

(۱) مروان بن الحکم کی پوزیشن دیکھئے۔ اس کا باپ حکم بن ابی العاص جو حضرت عثمان کا چچا تھا، فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوا تھا اور مدینہ آکر

رہ گیا تھا، مگر اس کی بعض حرکات کی وجہ سے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے نکال دیا تھا اور طائف میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ ابن عبدالبر نے استیعاب میں اس کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اکابر صحابہ کے ساتھ راز میں جو مشورے فرماتے تھے ان کی کسی نہ کسی طرح یہ سن گن لے کر وہ انہیں افشاء کر دیتا تھا اور دوسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نقلیں اُتارا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیا۔ بہر حال کوئی سخت قصور ہی اس کا ہو سکتا ہے جس کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے اس کے اخراج کا حکم صادر فرمایا تھا۔ مروان اس وقت ۷، ۸ برس کا تھا اور وہ بھی اس کے ساتھ طائف میں رہا۔ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو ان سے عرض کیا گیا کہ اسے واپسی کی اجازت دے دیں، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی اسے مدینہ آنے کی اجازت نہ دی گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے خلافت کے زمانہ میں اس کو واپس بلا لیا اور ایک روایت کے مطابق آپ نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے وعدہ فرما لیا تھا کہ اسے واپسی کی اجازت دے دیں گے۔ اس طرح یہ دونوں باپ بیٹے طائف سے مدینہ آ گئے۔

اگر مروان کے اس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس کا سیکرٹری کے منصب پر مقرر کیا جانا لوگوں کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اعتماد پر تو یہ مان سکتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی سفارش

قبول کر کے حکم کو واپسی کی اجازت دینے کا وعدہ فرمالیا تھا۔ اس لیے اسے واپس بلا لینا قابل اعتراض نہیں ہے، لیکن یہ مان لینا لوگوں کے لیے سخت مشکل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی معتوب شخص کا بیٹا اس بات کا بھی اہل ہے کہ تمام اکابر صحابہ کو چھوڑ کر اسے خلیفہ کا سیکرٹری بنا دیا جائے۔ خصوصاً جبکہ اس کا معتوب باپ زندہ موجود تھا اور اپنے بیٹے کے ذریعہ حکومت کے کاموں پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔

(خلافت وملوکیت ص ۱۱۰، ۱۱۱)

کسی تاویل سے بھی اس بات کو صحیح نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ ریاست کا سربراہ اپنے ہی خاندان کے ایک فرد کو حکومت کا چیف سیکرٹری بنا دے۔ (ص ۳۲۲)

تبصرہ:

جب آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی کوشش کی جائے تو ہم نہیں سمجھتے کہ اس کے لیے کیا لفظ استعمال کریں۔ سیکرٹری اور چیف سیکرٹری کا لفظ استعمال فرمایا گیا تا کہ ذہن ایک ہیبت ناک عہدہ کی طرف متوجہ ہو۔ پھر مروان کو اس عہدہ کی کرسی پر بٹھا کر خلیفہ سوم پر ایک الزام چسپاں کر دیا گیا (معاذ اللہ) حالانکہ پہلا فرض یہ ہے کہ مودودی صاحب ثابت کریں کہ خلافتِ راشدہ کے نظام میں سیکرٹری یا چیف سیکرٹری کا کوئی عہدہ ہوتا تھا، پھر یہ ثابت کریں کہ اس کے اختیارات اتنے وسیع ہوتے تھے کہ اتنی بڑی حکومت کو متاثر کر سکیں جو افغانستان اور ترکستان سے لے کر شمالی افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ (خلافت وملوکیت ص ۳۲۳) تب یہ اعتراض باوزن ہو سکتا تھا کہ اتنے بڑے عہدے پر اپنے ہی خاندان کے ایک فرد کو مسلط کر دیا اور اگر مروان کی حیثیت صرف ایک خادم کی ثابت ہو تو ظاہر ہے یہ الفاظ افتراء سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

مروان کے متعلق ابن سعد نے تحریر کیا ہے۔ ''کان کاتباله'' مروان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کاتب تھا۔ یہی لفظ دوسرے مؤرخین نے استعمال کیا ہے۔ مودودی صاحب تو ماشاء اللہ گریجویٹ ہیں۔

آپ جیسا قابل تو در کنار، معمولی قابلیت کا خواندہ انسان بھی جانتا ہے کہ ''کاتب'' کا ترجمہ محرر یا منشی ہوتا ہے، یہ مودودی صاحب کی افتراء آمیز جدت ہے کہ کاتب کی تصویر سیکرٹری یا چیف سیکرٹری کے لفظ سے کھینچ رہے ہیں۔ بے شک خلفاء عباسیہ اور غالباً خلفاء بنی اُمیہ کے آخری دور میں کاتب نے ایک حیثیت حاصل کر لی تھی۔ مگر وہ اختیارات کے لحاظ سے نہیں تھی بلکہ قابلیت کے لحاظ سے تھی۔

ہمارے زمانے میں اسٹینو گرافر کا کام یہ ہوتا ہے کہ ''صاحب'' جو کچھ بولیں وہ شارٹ ہینڈ سے نقش کر لیں۔ پھر اس کو صاف کر کے صاحب کے سامنے پیش کر دیں۔ وہ کوئی خط، حکم یا فیصلہ بن جاتا ہے۔ اس کو ادبیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ہمارے زمانہ میں عموماً سرکاری تحریریں ادبیت سے نا آشنا ہوتی ہیں، لیکن خلفاء اور سلاطین اسلام کے دور میں کاتب کا کام صرف قلمبند کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا فرض یہ ہوتا تھا کہ اپنے افسر یا آقا کے منشاء اور مفہوم کو نہایت موزوں اور مرصع الفاظ کا جامہ پہنائے۔ جس میں ظاہری یعنی ادبی خوبیوں کے ساتھ معنوی خوبیاں بھی ہوں اور وہ ''کلام الملوک ملوک الکلام'' کا آئینہ دار ہو۔ اسی لحاظ سے اس پیشہ نے خاص اہمیت حاصل کر لی تھی۔

کاتب ایک ایسا قابل و فاضل ہوتا تھا جو نظم و ادیبانہ نثر کی قابلیت کے ساتھ ساتھ ماحول کے حالات اور نفسیات سے بھی واقف ہو۔ وہ مکتوب الیہ کے مذاق اور اس کی نفسیات کا بھی احساس رکھتا ہو۔ حال کی طرح کچھ ماضی کا علم بھی اس کے پاس ہو۔ یعنی تاریخ سے واقف ہو۔ دیگر ممالک سے خط و کتابت ہو تو وہاں کے حالات اور ان کے نفسیات سے بھی واقفیت ضروری ہوتی تھی۔ ابوالفضل کے لکھے ہوئے خطوط تو فارسی انشاء کے سرتاج مانے جاتے ہیں۔ ان کو پڑھایا بھی جاتا ہے۔ خلفاء عباسیہ اور بنی اُمیہ کے زمانہ کے کاتبوں کے بھی بہت سے خطوط عربی انشاء کی جان ہیں۔ ''العقد الفرید''، ''المستطرف'' کشکول بہائو الدین وغیرہ میں بہت سے خطوط ادبی شاہکاروں کی حیثیت سے نقل کیے گئے ہیں۔ انہیں کاتبوں کی سہولت کے لیے ابن قتیبہ نے ایسی معلومات کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کی ضرورت اس زمانہ کے کاتبوں کو ہوا کرتی تھی۔ مکاتیب ابن قتیبہ اسی مجموعہ کا نام ہے۔

بہر حال یہ جو کچھ بھی تھا قابلیت کے لحاظ سے تھا۔ اختیارات کے لحاظ سے وہ صرف منشی یا اسٹینو گرافر ہوتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں تو اس پیشہ کی ابتدا تھی۔ اس وقت اتنی اعلیٰ اور جامع قابلیت کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم مروان کے متعلق حافظ ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں۔ کان من سادات قریش وفضلاء ھا (قریش کے عمائدین اور فضلاء میں سے تھا) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر انہیں مروان کے متعلق فرمایا۔

القاری لکتاب اللہ. الفقیہ فی دین اللہ الشدید فی حدود اللہ

(البدایہ والنہایہ ص ۲۵۷ ج ۸)

حلقہ محدثین سے بھی ان کا تعلق تھا۔ چنانچہ متعدد احادیث کی سندوں میں ان کا نام آتا ہے۔
اس علم وفضل کے ساتھ اس کا احساس خود حضرت مروان کو بھی تھا کہ وہ سیاسی جھگڑوں میں پڑ گئے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب حضرت مروان مدینہ طیبہ کے گورنر تھے تو) کہا کرتے تھے۔

قرأت کتاب اللہ منذاا ربعین سنة ثم اصبحت فی ما انا فیه یعنی اھراق الدماء وھذا الشان

''چالیس سال سے قاری کتاب اللہ ہوں۔ پھر ان حالات میں گھر گیا
جن میں گھرا ہوا ہوں یعنی خونریزی اور یہ تمام باتیں۔''

(البدایہ والنہایہ ص ۲۵۸ ج ۸)

بہر حال یہ سب باتیں علمی قابلیت کے لحاظ سے تھیں۔ اختیارات کے لحاظ سے نہ سیکرٹری اور نہ چیف سیکرٹری کا کوئی عہدہ تھا نہ اس کے اختیارات تھے، نہ اس کا کوئی اثر پڑ سکتا تھا، البتہ حاضر باش تھے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بے تکلف خادم تھے۔ اسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی معتمد بیوی نائلہ سے نوک جھونک رہتی تھی۔
اب اگر چچازاد بھائی، منہ چڑھا خادم بھی ہو اور ابن عساکر وغیرہ کی تحقیق کے بموجب وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے فرامین اور فیصلے لکھ دیتا ہو (کان کاتب الحکم بین یدیہ (البدایہ والنہایہ ص ۲۵۹ ج ۸)) تو اس پر کسی کو مشتعل ہونے کی کیا

وجہ ہوسکتی ہے اوراس کواسباب شورش میں کس طرح شمار کرایا جاسکتا ہے۔ مودودی صاحب کا یہ ارشاد بجا ہے کہ غلط کام کوخواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضا ہے نہ دین ہی کا یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے۔(ص ۱۱۶)
بے شک یہ دین کا مطالبہ نہیں ہے کہ صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے اوراس کوسخن سازی سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر کیا یہ دین کا مطالبہ ہے کہ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پرالزام ثابت کرنے کے لیے سخن سازی کی جائے اور جس غلطی سے ان کا دامن پاک ہے وہ خواہ مخواہ ان کے سر تھوپی جائے۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں نظامِ حکومت پر حاوی سیکرٹری اور چیف سیکرٹری کا عہدہ گھڑنا اور کاتب کے معنی سیکرٹری یا چیف سیکرٹری کرنا کیا سخن سازی نہیں ہے اور سخن سازی بھی اس لیے کہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ مجرم اور ملزم ثابت ہوں۔ (معاذ اللہ)

حکم بن ابی العاص:

اسی طرح مروان کے والد حکم بن ابی العاص کے معاملہ میں بھی مودودی صاحب نے سخن سازی اور آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی کوشش کی ہے۔
مدینہ منورہ سے نکالے جانے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نقلیں اُتارنے کے متعلق روایتوں کا ترجمہ تو کر دیا جو موضوع اور ضعیف ہیں اور بعض کے راوی شیعہ اور رافضی ہیں (الاصابہ ص ۲۹ ج ۲) لیکن ابن سعد (جن کو بقول مودودی صاحب تمام محدثین نے ثقہ اور قابل اعتماد قرار دیا ہے) ان کی تحقیق کو چھوڑ دیا۔
ابن سعد فرماتے ہیں۔

الحکم بن ابی العاص بن اُمیة اسلم یوم الفتح ولم یزل بهاحتی کانت خلافة عثمان ابن عفان فاذن له ان تدخل المدینة فمات بها في خلافة عثمان

”حکم بن ابی العاص بن امیہ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے اور مکہ ہی میں مقیم رہے۔ یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا

دور آیا، آپ نے ان کو مدینہ آنے کی اجازت دے دی پھر مدینہ ہی میں ان کی وفات ہوئی۔"[۱۶] (طبقات ابن سعد ص۳۳۱ ج ۵)

مؤرخ ابن سعد کی تائید علامہ ابن تیمیہ بھی کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

كان لمرو ان سبع سنين او اقل فما كان له ذنب له يطرد عليه ثم لم نعرف ان اباه هاجر الى المدينة حتى يطرد منها فان الطلقاء ليس فيهم من هاجر فان النبى صلى الله عليه وسلم قال لا هجرة بعد الفتح ولما قدم صفوان بن امية مهاجرا امره النبى صلى الله عليه وسلم بالرجوع الىٰ مكة وقصة طرد الحكم ليس له اسناد تعرف به صحتها. (میزن الاعتدال بین الرفض والاعتزال دفع مطاعن عثمان ذی النورین ص۴۹۵ بحوالہ تجدید سبائیت ص۲۹۰)

"مروان کی عمر سات سال یا اس سے بھی کم تھی۔ لامحالہ ان کا کوئی ایسا گناہ ہو نہیں سکتا تھا کہ ان کو نکالا جائے۔ پھر یہ بات معلوم نہیں ہے کہ ان کے باپ (حکم بن ابی العاص) ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے کہ وہاں سے ان کو نکالا جاتا، کیونکہ طلقاء میں کوئی ایسا نہیں ہے جس نے ہجرت کی ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے ہی مکہ فتح کیا اعلان فرما دیا تھا کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے اور جب حضرت صفوان بن امیہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی مکہ واپس چلے جانے کا حکم دے دیا اور الحکم بن ابی العاص کے نکال دینے کا قصہ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا اس کی کوئی سند ایسی نہیں ہے جس کی صحت معلوم ہو"۔ (میزان الاعتدال ص۴۹۵)

اور خود صاحب واقعہ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا گیا تو آپ نے اہل مدینہ کے مجمع عام میں جس میں مدینہ طیبہ کے علاوہ کوفہ اور بصرہ کے بہت سے عمائدین موجود تھے فرمایا۔

قالوا انی رددت الحکم وقد سیره رسول الله صلی الله علیه وسلم والحکم مکی سیره رسول الله صلی الله علیه وسلم من مکة الی الطائف ثم رده رسول الله صلی الله علیه وسلم فرسول الله صلی الله علیه وسلم سیره ورسول الله صلی الله علیه وسلم رده اکذالک قالوا اللهم نعم (طبری ص۱۰۲ ج۵ وص۱۰۳)

''اعتراض کرنے والوں نے اعتراض کیا ہے کہ میں نے حکم کو واپس لوٹا لیا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نکال دیا تھا۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کہ مکہ سے طائف روانہ کر دیا تھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی اس کو واپس بھی کر لیا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی اس کو روانہ کیا تھا آپ ہی نے اس کو واپسی کی اجازت دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حاضرین سے فرمایا (بولو) واقعہ یہی ہے؟ سب نے کہا بے شک خدا شاہد ہے واقعہ یہی ہے''

اب سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ مودودی صاحب یا جن کی وہ تقلید کرتے ہیں وہ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بیان کو تسلیم کیوں نہیں کرتے۔ حالانکہ آپ نے مدینہ طیبہ کے مجمع عام میں یہ ارشاد فرمایا۔ پھر مجمع سے اس کی تصدیق چاہی اور پورے مجمع نے ''اللھم'' کہہ کر اس کی تصدیق کی۔

روایت کرنے والے حافظ ابن جریر طبری ہیں، جن کو مودودی صاحب مستند ترین مؤرخ مانتے ہیں۔ ہمارے خیال میں حقیقت وہی ہے جو سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی۔ ان کی کسی غلطی کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے خارج کر کے طائف میں قیام کا حکم فرمایا۔ پھر از خود یا حضرت حکم کی معافی کی درخواست پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ واپس آ جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد ان کی درخواست تھی کہ مدینہ میں آ کر قیام کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہیں دی۔ کیونکہ ہجرت کا سلسلہ اب بند ہو گیا تھا اور آپ اعلان فرما چکے تھے کہ

لا هجرة بعد الفتح

پھر انہوں نے حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں بھی مدینہ آ کر قیام کرنے کی اجازت چاہی، ان حضرات نے بھی اجازت نہیں دی۔ اجازت نہ دینے کا سبب معتوبیت نہیں ہے۔ وہ تو اس وقت ختم ہو گیا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مکہ میں واپس آ کر قیام کرنے کی اجازت دی۔ اب تو سوال یہ تھا کہ جب سلسلۂ ہجرت منقطع ہو چکا ہے تو مکہ کے کسی باشندے کو مدینہ آ کر قیام کرنے کی اجازت دی جائے یا نہیں۔ اس اجازت میں پہلے سختی برتی گئی حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفوان بن اُمیہ کو مکہ واپس کر دیا۔ یہی سختی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور تک رہی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اب اس ممانعت کی ضرورت نہیں سمجھی، آپ نے اجازت دے دی۔ اس قسم کے احکام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں پھر حضرات شیخین کے دور میں بدلتے رہے۔

افتراء پردازوں نے اس واقعہ پر حاشیہ آرائی کی اور مودودی صاحب نے انہی حاشیوں کو اس طرح لے لیا گویا یہی واقعات ہیں۔

تعجب ہوتا ہے مودودی صاحب خود فرماتے ہیں، لیپ پوت سے بات بنتی نہیں بگڑ جاتی ہے۔ (ص ۳۰۷) اور یہاں سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ملزم گرداننے کے لیے خود لیپ پوت کر رہے ہیں۔

(مولانا اسحاق صاحب سندیلوی نے اپنی تصنیف تجدید سبائیت میں اس قضیہ کے تمام پہلو بڑی وضاحت سے بیان فرمائے ہیں، دلچسپی رکھنے والے حضرات ملاحظہ فرمالیں)۔

ہم یہاں مودودی صاحب کی ایک نکتہ آفرینی کی طرف توجہ دلا کر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ مودودی صاحب کی باریک بینی ملاحظہ فرمائیے، آپ فرماتے ہیں۔

> ''خصوصاً جب کہ اس کا معتوب باپ موجود تھا اور اپنے بیٹے کے ذریعہ حکومت کے کاموں پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔'' (ص ۱۱۱)

ہمارے لیے تو مودودی صاحب کا یہ اندازِ تحریر بھی لرزہ خیز ہے۔ مروان اور حکم جیسے بھی ہوں ان کو یہ سعادت حاصل تھی کہ سیّد الانبیاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور کی

زیارت حاصل ہوئی تھی۔ متاع ایمان بھی ان کے پاس تھا۔ شرف مشافہت بھی حاصل ہوا تھا۔ دنیا بھر کے اربوں اور کھربوں انسانوں میں صرف ڈیڑھ یا دو لاکھ انسان ہیں جن کو متاع ایمان کے ساتھ سعادت زیارت اور شرفِ ہم کلامی حاصل ہوا ان کی یہ سعادت باعثِ رشک اور موجب صد احترام ہے۔ یہ مودودی صاحب ہی کی جسارت ہے کہ ان کے متعلق وہ انداز اختیار کر رہے ہیں جیسے کسی بازاری شخص کے ساتھ، جو مجرم اور ملزم بھی ہو۔

بہرحال حکومت پر اثر انداز ہونے کا جو نکتہ ان کے دماغ نے اختراع کیا وہ قابل توجہ ہے۔ حضرت حکم کی وفات ۳۲ھ میں ہو چکی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش ۳۴ھ میں شروع ہوئی یعنی حضرت حکم کی وفات سے دو سال بعد گویا وہ وفات سے دو سال بعد بھی اپنے بیٹے کے ذریعہ حکومت کے کاموں پر اثر ڈالتے رہے۔

عطیہ اور رعایت:

حکم بن ابی العاص کے معاملہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں قابل اعتراض بنانے کے لیے جس طرح لیپ پوت کی، اس سے بھی زیادہ قابل نفرت وہ لیپ پوت ہے جو عطیہ اور رعایت کا الزام ثابت کرنے میں مودودی صاحب نے خود اپنے دست مبارک سے کی ہے۔

کتنی رقم تھی جو مروان کو دی گئی جو بقول مودودی صاحب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش کا سبب اور ہدف اعتراض بنی۔ (ص ۱۰۶) کس مد سے دی گئی؟ کس بہانہ سے دی گئی؟ کب دی گئی؟ یہ سوالات ہیں۔

روایتیں ملاحظہ فرمائیے جو مودودی صاحب نے پیش فرمائی ہیں اور جن کی کترنوں سے قباء اعتراض تیار کیا ہے۔

(الف) یہ رقم مروان کو پندرہ ہزار کی مقدار میں دی گئی۔ (خلافت وملوکیت ۳۲۸)

(ب) مروان کے لیے مصر کا خمس لکھ دیا (ص ۳۲۶)

سوال یہ تھا کہ جب مروان اس حملہ میں شریک ہی نہیں تھے جو مصر پر کیا گیا تھا تو اس کا خمس مروان کو کیسے مل سکتا تھا تو مودودی صاحب اس کی تاویل یہ فرما رہے ہیں یعنی افریقہ کے

اموال غنیمت کا خمس، جو مصر کے صوبہ کی طرف سے آیا تھا۔ (ص ۳۲۶)

(ج) تو کیا جنگِ افریقہ میں مروان شریک تھے؟ شریک نہیں تھے تو خمس کیسا؟ جواب کے لیے آپ نے ابن خلدون کا دامن پکڑا کہ:

''ابن خلدون نے یہ لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ مروان نے یہ خمس پانچ لاکھ کی رقم میں خرید لیا تھا اور حضرت عثمان نے یہ قیمت اسے معاف کر دی۔'' (ص ۳۲۶ حاشیہ)

(د) یہ خرید وفروخت کب ہوئی؟ اور اس کا کیا ثبوت کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے معاف فرمادی اور کیا معاف کر دینے کا ان کو حق پہنچتا تھا؟

سوالات پیچیدہ تھے، مودودی صاحب نے اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارے تو اتفاق سے ابن اثیر کا دامن ہاتھ آ گیا۔ فرماتے ہیں اس واقعہ کے متعلق ابن اثیر نے اپنی تحقیق اس طرح بیان کی ہے۔

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح افریقہ کا خمس مدینہ لائے اور مروان بن حکم نے اسے پانچ لاکھ میں خرید لیا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ قیمت اس کو معاف کر دی۔ یہ بھی ان امور میں سے ہے جن کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا جاتا تھا۔ افریقہ کے خمس کے معاملہ میں جتنی روایات بیان کی جاتی ہیں یہ روایت ان میں سب سے زیادہ درست ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے افریقہ کا خمس عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ کو دے دیا تھا اور بعض دوسرے لوگ بیان کرتے ہیں کہ مروان بن حکم کو عطا کر دیا تھا۔ اس روایت سے حقیقت یہ ظاہر ہوئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے افریقہ کی پہلی جنگ کا خمس عبداللہ بن سعد کو عطا کیا تھا اور دوسری جنگ کا (جس میں افریقہ کا پورا علاقہ فتح ہوا اس کا) خمس مروان کو عطا کیا (تاریخ الکامل ج ۳ ص ۱۴۶ ابن اثیر)

مودودی صاحب سے دریافت کیا جائے کہ آپ پہلے تو فرماتے ہیں کہ مروان نے پانچ لاکھ میں خرید لیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ پانچ لاکھ معاف فرمادیے۔ پھر فرماتے ہیں دوسری جنگ میں جس میں افریقہ کا پورا علاقہ فتح ہوا اس کا خمس مروان کو عطا کیا۔

خمس عطاء کر دیا تھا تو اس کو فروخت کرنے، پھر قیمت معاف کر دینے کے کیا معنی؟ اور کیا مروان اس دوسری جنگ میں شریک تھے جو ان پر یہ مہربانی فرمائی گئی کہ پورا خمس ان کو بخش دیا۔

اگر فروخت کیا تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قیمت معاف کر دینے کا کیا حق تھا۔ اگر اس کا کوئی بھی قابل اعتماد ثبوت ہوتا تو فقہاء کرام کے لیے یہ عمل ایک فقہی نظیر ہوتا، کیونکہ خلیفۂ راشد کا عمل بھی دلیل ہوتا ہے۔

تعجب ہے ان کو حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کس قدر بعد ہے، اور انہیں خلیفہ مظلوم سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اُوپر الزام ثابت کرنے کا کتنا شوق ہے کہ اس شوق میں وہ اپنی فہم وفراست کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

انتہا ہوگئی کہ الزام ثابت کرنے کے لیے تو مضحکہ انگیز متضاد بیانات کو بھی جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ارشادِ گرامی کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے جو آپ نے مدینہ طیبہ میں اجتماع عظیم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا اور پورے مجمع نے اس کی تصدیق کی تھی۔ کوئی ایک آواز بھی اس کے خلاف نہیں اُٹھی تھی۔ آپ نے فرمایا:

اما اعطاء هم فانی ما اعطیهم من مالی ولا استحل اموال المسلمین لنفسی ولا لاحد من الناس

”جہاں تک ان کو دینے کا تعلق ہے تو میں جو کچھ ان کو دیتا ہوں اپنے مال میں سے دیتا ہوں اور مسلمانوں کے مال نہ میں اپنے لیے جائز سمجھتا ہوں نہ کسی بھی انسان کے لیے۔“ (طبری ص ۱۰۳ ج ۵)

ہر ایک ذی علم جانتا ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں تنقید کا طریقہ نہیں ہے۔ وہ اس جنگل میں ہر ایک رطب ویابس کو جگہ دے دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ امام بخاری رحمہ اللہ جن کی تحقیق وتنقید کا یہ عالم ہے کہ ان کی کتاب بخاری شریف کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ مانا جاتا ہے۔ وہ جب تاریخ کے میدان میں آتے ہیں تو انہیں کی مرتب فرمودہ ”تاریخ کبیر“ گویا ایک نخلستان ہے جس میں درختوں سے زیادہ جھاڑ ہیں اور درختوں میں بارآور بھی اور بے برگ وبار بھی۔

لیکن مودودی صاحب جن کا بلند بانگ دعویٰ یہ ہے:

''میں کسی بزرگ کے کسی غلط کام کو غلط اسی وقت کہتا ہوں جب وہ قابل اعتماد ذرائع سے ثابت ہو اور کسی معقول دلیل سے اس کی تاویل نہ کی جا سکتی ہو۔'' (ص ۳۰۷)

کیا یہ روایتیں جو قیاس اور درایت کے بھی خلاف ہیں اور خود آپس میں بھی متضاد اور متناقض، کیا اس قابل ہیں کہ ان پر اعتماد کر کے اس مقدس شخصیت پر الزام ثابت کیا جائے جس کو سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین سوم ہونے کا شرف حاصل ہے اور جس کو صادق مصدوق کی لسانِ رسالت نے الشہید فرمایا۔ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ان بے سروپا روایتوں پر اعتماد کیا جائے اور خود اس شہید مظلوم کی بات کو تسلیم نہ کیا جائے جو اس نے مجمع عام میں فرمائی تھی اور پورے مجمع نے اس کی تصدیق کی تھی کہ:

''مسلمانوں کے مال نہ میں اپنے لیے جائز سمجھتا ہوں نہ کسی بھی انسان کے لیے'' (طبری ص ۱۰۳ ج ۵)

کیا کوئی بھی صاحبِ انصاف اس ظلم کی اجازت دے سکتا ہے۔ (معاذ اللہ)

بیت المال سے اقرباء کی امداد کا معاملہ

اس سلسلہ میں جو کچھ اُوپر لکھا گیا ہے وہ (انشاء اللہ) ہر ایک انصاف پسند طالب حق کے اطمینان کے لیے کافی ہے۔ مزید بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے مگر چونکہ یہ نہایت کریہہ اور شرمناک عنوان ہے جس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتے کہ معاذ اللہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے بیت المال میں تصرفِ بے جا اور قومی امانت میں خیانت کی۔ اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ مودودی صاحب کے پیش کردہ دلائل کا تفصیلی جائزہ لیں۔ یہ جائزہ ہی انشاء اللہ جواب ہو جائے گا۔

اس عنوان کے تحت مودودی صاحب نے دو قول پیش کیے ہیں۔

(۱) زہری کا قول (۲) خود سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول۔

زہری رحمہ اللہ کا قول:

مودودی صاحب نے ''طبقات ابن سعد'' کے حوالہ سے زہری رحمہ اللہ کا قول نقل کر کے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ہم یہ ترجمہ ہی بلفظہ نقل کرتے ہیں۔

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی حکومت کے آخری چھ سالوں میں اپنے رشتہ داروں اور خاندان کے لوگوں کو حکومت کے عہدے دیے اور مروان کے لیے مصر کا خمس (یعنی افریقہ کے اموالِ غنیمت کا خمس جو مصر کے صوبے کی طرف سے آیا تھا) لکھ دیا اور اپنے رشتہ داروں کو مالی عطیے دیے اور اس معاملہ میں یہ تاویل کی کہ یہ وہ صلہ رحمی ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ انہوں نے بیت المال سے روپیہ بھی لیا اور قرض رقمیں بھی لیں اور کہا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ نے اس مال میں سے اپنا حق چھوڑ دیا تھا اور میں نے اس کو لے کر اقرباء میں تقسیم کیا ہے۔ اسی چیز کو لوگوں نے ناپسند کیا۔ (ص ۳۲۶ وص ۳۲۷)

جائزہ:

زہری رحمہ اللہ مشہور محدث بلکہ فن حدیث کے امام ہیں۔ ان کا قول لامحالہ وزن رکھتا ہے لیکن یہ کہ آیا فی الواقع یہ امام زہری کا قول ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے مودودی صاحب نے بہت سے عمل کیے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

(۱) یہ قول ابن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے تو مودودی صاحب کا ایک عمل تو یہ ہے کہ آپ علامہ ابن سعد کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

''ابن سعد کو تمام محدثین نے ثقہ اور قابل اعتماد مانا ہے اور ان کے متعلق

یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ روایات کو جانچ پرکھ کر لیتے ہیں اور اسی بنا پر ان
کی کتاب طبقات تاریخ اسلام کے معتبر ترین مآخذ میں مانی جاتی ہے
(خلافت وملوکیت حاشیہ ص ۱۰۷) تفسیر ومغازی کے معاملہ میں ان کی
ثقاہت پر تمام محدثین ومفسرین نے اعتماد کیا ہے۔'' (ص ۳۱۱)

مودودی صاحب خود تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقدی کے تلامذہ میں سے ہیں (ص ۳۱۱) اور تلمیذ بھی ایسے مخصوص کہ آپ کے نام کے ساتھ ''کاتب[۱۸] الواقدی'' لکھا جاتا ہے لیکن طبقات کے اعتبار سے وہ بہت بعد کے بن جاتے ہیں۔ ''تقریب التہذیب'' میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے کہا ہے ''من العاشرہ'' کہ وہ دسویں طبقہ کے ہیں۔ علاوہ اس کے انہوں نے امام زہری کا جو قول پیش کیا ہے وہ خود اس کا ثبوت ہے کہ ابن سعد نقل روایت کے بارے میں قطعاً غیر محتاط ہیں۔ (تفصیل آگے آرہی ہے)

یہ بات قابل تسلیم ہے کہ ان کی کتاب ''طبقات کبریٰ'' تاریخ اسلام کی کتابوں میں اہمیت رکھتی ہے اور بہتر کتاب مانی جاتی ہے، مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں جس طرح غیر مرتب طور پر ضعیف وموضوعات کا ڈھیر لگا دیا جاتا ہے اور اختصار کا لحاظ نہیں رکھا جاتا طبقات کی ترتیب مناسب ہے۔ اس میں اختصار سے کام لیا گیا ہے اور موضوعات کا بھی ڈھیر نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ ضعیف اور موضوع روایتوں سے یکسر پاک ہے۔

پہلے عمل کے بعد مودودی صاحب کا دوسرا عمل ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں:

''یہ امام زہری کا بیان ہے جن کا زمانہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد
سے قریب ترین تھا اور محمد بن سعد کا زمانہ امام زہری کے زمانہ سے بہت
قریب ہے۔ ابن سعد نے صرف دو واسطوں سے ان کا یہ قول نقل کیا
ہے۔'' (ص ۳۲۷)

یہ دوسرا مغالطہ یا دھول جھونکنے کی دوسری کوشش ہے۔ کسی تعمیر کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ حال کی تعمیر ہے۔ صرف دو پشتیں گزری ہیں اس کی تعمیر ہوئی تھی۔ لہٰذا ابھی مضبوط ہوگی،

مگر کسی روایت کے متعلق یہ کہنا سراسر مغالطہ میں ڈالنا ہے کہ صرف دو راویوں کا واسطہ ہے یا فلاں کا زمانہ فلاں سے بہت قریب ہے۔

اگر قربِ زمانہ کا اعتبار ہوا کرتا تو وہ تمام روایتیں صحیح مان لی جاتیں جو تبع تابعین کے زمانہ میں بیان کی گئیں۔ کیونکہ ان کی روایتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک صرف دو واسطے ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام، پھر تابعین۔ حالانکہ موضوع روایتیں اسی زمانہ میں گھڑی گئیں۔

عبداللہ بن سبا سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک صرف ایک واسطہ پڑتا تھا، حضرات صحابہ کا واسطہ۔ تو عبداللہ بن سبا اور اس کے تمام جعل ساز دوستوں کی تمام روایتیں صحیح تسلیم ہونی چاہئیں ان میں چون وچرا قطعاً نہ ہونی چاہیے۔

حضرت محترم مودودی صاحب! اس مغالطہ سے کیا فائدہ؟ روایت کے سلسلہ میں تو اگر ایک واسطہ بھی ہو تب بھی ضرورت توثیق کی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ واسطہ ثقہ اور قابل اعتماد ہو ورنہ وہ روایت، روایت نہیں بلکہ اختراع اور افتراء ہوگی۔ دنیا جانتی ہے تل اوجھل پہاڑ اوجھل۔

(۳) تیسرا عمل ملاحظہ فرمائیے، فرماتے ہیں:

> ''اگر یہ بات ابن سعد نے امام زہری کی طرف یا امام زہری نے حضرت عثمانؓ کی طرف غلط منسوب کی ہوتی تو محدثین اس پر ضرور اعتراض کرتے۔''

حضرت مودودی صاحب کی یہ عبرت آموز نادانی ہے۔ آپ کو محدثین کے اعتراض کا علم نہیں ہے۔ حضرات محدثین جب واقدی کو ناقابل اعتماد قرار دیتے ہیں تو اُن کا اعتراض تو کھلا ہوا ہے اور برابر چل رہا ہے کہ واقدی کی روایتیں قابل اعتبار نہیں ہیں اور اگر واقدی کسی ایسے شخص کے ذریعہ بیان کریں جس کے ثقہ ہونے کا علم نہ ہو تو وہ ایسی ساقط اور بے کار روایت ہے کہ اس کی تردید کی بھی ضرورت نہیں۔

معترضہ:

بڑی خرابی یہ ہے کہ حضرت مودودی صاحب اور ان جیسے حضرات حدیث و تاریخ میں دخل تو دیتے ہیں، لیکن مؤرخین خصوصاً محدث مؤرخین کے مذاق سے واقف نہیں ہیں۔ ان کے

زمانہ میں حدیث و تاریخ سے جو بھی دلچسپی رکھتا تھا وہ سندوں سے بھی واقف ہوتا تھا اور رجال سند سے بھی۔ وہ سند کو دیکھ کر روایت کے صحیح یا سقیم ہونے کا فیصلہ کر لیتا تھا اور یہ مؤرخ یا محدث جب سند پیش کر دیتا تھا تو سمجھتا تھا کہ اس نے اپنا فرض انجام دے دیا۔ اب ہمارے سامنے سندیں آتی ہیں، مگر ہم رجال سند سے واقف نہیں ہوتے ہیں تو ہم ضعیف اور موضوع روایت کو بھی مستند سمجھ لیتے ہیں اور یہی پروپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں کہ ہم جو پیش کر رہے ہیں اس کی سند موجود ہے۔ حالانکہ سند ردّی میں ڈال دینے کے قابل ہوتی ہے۔

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

(۴) یہ عمل پوری فنی مہارت سے کیا ہے کہ الفاظ کی بھول بھلیوں میں رکھ کر (کہ عہد سے قریب ترین تھا اور صرف دو واسطے ہیں اس لیے اس بیان کو صحیح تسلیم کرنا ہی ہوگا) اس روایت کی اصل کمزوری اور خرابی پر پردہ ڈال دیا یعنی اس سوال کو سامنے آنے ہی نہیں دیا کہ یہ دو واسطے کون ہیں؟ یہ سوال سامنے آتا ہے تو ساری فنکاری ختم ہو جاتی ہے۔

ان دو واسطوں میں پہلے صاحب جوزہری کا یہ قول نقل کرتے ہیں محمد بن عبداللہ ہیں۔ محمد بن عبداللہ کون ہیں۔ ثقہ ہیں یا غیر ثقہ کچھ پتہ نہیں۔ ''تقریب التہذیب'' میں محمد بن عبداللہ ستتر ہیں۔ ان کا امتیاز دادا یا قبیلہ وغیرہ کے انتساب سے ہوتا ہے۔ جب تک قبیلہ یا دادا وغیرہ کا علم نہ ہو تو محمد بن عبداللہ فرضی شخص بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی شخص اپنا نام محمد رکھ سکتا ہے اور اس کا باپ اللہ کا بندہ ہی ہوگا۔ لہٰذا کوئی شخص بھی محمد بن عبداللہ ہو سکتا ہے۔ ایسے راوی کو مجہول کہا جاتا ہے اور سند میں اس طرح مبہم اور مجہول نام پیش کر دینا یا اصلی نام چھپا لینا تدلیس کہلاتا ہے، جو ائمہ حدیث کی نظر میں ایک ایسا عیب ہے جس کی بنا پر نہ صرف وہ روایت ساقط ہوتی ہے بلکہ اس راوی پر بھی اعتراض آ جاتا ہے۔ دوسرے راوی محمد بن عمر ہیں جو واقدی کے لقب سے مشہور ہیں۔

مودودی صاحب نے غیر معتبر کو معتبر گرداننے اور اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے واقدی کی بھی توثیق کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''واقدی کے متعلق یہ بات اہل علم کو معلوم ہے کہ صرف احکام و سنن

کے معاملہ میں ان کی احادیث کو رد کیا گیا ہے۔ باقی رہی تاریخ اور خصوصاً مغازی اور سیر کا باب، تو اس میں آخر کون ہے جس نے واقدی کی روایات نہیں لیں۔'' (ص ۱۰۷ خلافت وملوکیت)

اس ارشاد میں بھی پہلا مغالطہ تو یہ ہے کہ واقدی کی روایات تاریخ ومغازی کے باب میں تسلیم کی جاتی ہیں۔ حالانکہ تاریخ میں بھی واقدی کی روایت اس وقت لی جاتی ہے جبکہ واقدی کسی ثقہ یا کم از کم معروف یعنی غیر مجہول سے روایت کریں تو اس صورت میں اس روایت کو صرف اس بنا پر کہ واقدی روایت کر رہے ہیں، ساقط نہیں کریں گے لیکن اگر واقدی کسی مجہول شخص سے روایت کریں یا کسی ایسے شخص سے جو مجروح قرار دیا گیا ہو یعنی کاذب یا مدلس وغیرہ مانا گیا ہو تو یہاں تو ''کریلا نیم چڑھا'' ہو جاتا ہے خود واقدی مجروح اور مجروح اور مجہول سے روایت کریں تو وہ روایت تو کسی بھی صاحبِ بصیرت کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہوگی۔ یہاں یہی صورت ہے کہ واقدی جس سے روایت کر رہے ہیں وہ مجہول ہے لہٰذا روایت ناقابل اعتبار۔

اس کے علاوہ قابل توجہ یہ ہے کہ جب احکام وسنن کے بارے میں واقدی کی روایت ناقابل اعتبار ہے تو کیا ایسے معاملہ میں واقدی کی روایت معتبر ہوگی جو احکام وسنن سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ اس بارے میں کہ مسجد سے کون سا پیر پہلے باہر نکالیں اور کون سا پہلے اندر رکھیں اور غسل کرتے وقت وضو پہلے کریں یا بعد میں، ایسے مسائل میں تو واقدی کی روایت معتبر نہ ہو کہ یہ احکام وسنن کا معاملہ ہے اور ایسا شخص جو باتفاق اہل سنت والجماعت حضراتِ شیخین کے بعد پوری اُمت میں سب سے افضل مانا جاتا ہو، جس کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ثالث ہونے کا شرف حاصل ہو، جس کے لیے جنت کی بشارت ہو، جس کو شہید کا خطاب دیا گیا ہو اُس کی عزت وعظمت، اس کی ثقاہت ودیانت پر حملہ ہو اس کے بارے میں واقدی کی روایت معتبر مان لی جائے۔ کیا یہ صحیح ہے۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

(۵) ایک اور عمل ملاحظہ ہو کہ الفاظ کے گورکھ دھندے میں ان خرابیوں کو نظر سے اوجھل کر دیا جو خود اس روایت کے اندر موجود ہیں جن کی بنا پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ یہ قول انہیں زہری کا ہوگا جو فنِ حدیث کے امام مانے جاتے ہیں۔ اس قول میں ہے ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی حکومت کے آخری چھ سالوں میں اپنے رشتہ داروں اور خاندان کے لوگوں کو عہدے دیے۔''

یہ کھلی غلط بیانی ہے۔ جن رشتہ داروں کے نام لیے جاتے ہیں اور جن عطیوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ آخری چھ سالوں میں نہیں ہیں۔ بلکہ پہلے چھ سالوں میں ہیں۔ تمام تفصیل پہلے گزر چکی ہے، یہاں اس کا اعادہ طوالت ہے۔

حضرات معاویہ، ولید بن عقبہ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہم (حاکم بصرہ) ان سب کے تقررات پہلے چھ سالوں میں ہو چکے ہیں فتح افریقہ اور افریقہ یا مصر کے خمس کا قصہ بھی پہلے چھ سالوں میں ہوا۔ ولید بن عقبہ کے بعد حضرت سعید بن العاص کے تقرر کے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آخری چھ سالوں میں ہوا۔ یہ تقرر خلافتِ عثانی کے چھٹے سال کے آخر میں یا ساتویں کے شروع میں ہوا۔

بہر حال آخری چھ سالوں میں رشتہ داروں کے تقرر کا قول ایک ایسا غلط قول ہے جو اس زہری کا تو نہیں ہو سکتا جو فنِ حدیث کے امام مانے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی علت ہے کہ فنِ حدیث کے اصول کے لحاظ سے اس علت کی بناء پر یہ قول معلول ہو گیا۔ معلول قول قابل اعتبار نہیں ہوتا۔

اس قول میں دوسری علت (خرابی) یہ ہے کہ قول میں یہ ہے کہ مروان کے لیے مصر کا خمس لکھ دیا جو سراسر غلط ہے۔ اگر خمس دینے کی روایت ہے بھی تو افریقہ کے مالِ غنیمت کی ہے۔ مصر کے خمس کی نہیں۔ مودودی صاحب نے اس بگاڑ کو درست کرنے کی کوشش کی اور ''یعنی'' کہہ کر غلط کو صحیح کرنا چاہا، مگر یہ کھلی ہوئی جنبہ داری ہے روایت میں خمس مصر ہے جو یقیناً غلط ہے۔ زہری رحمۃ اللہ علیہ ایسی غلط بات نہیں کہہ سکتے۔

تیسری علت یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا ہے کہ انہوں نے بیت

المال سے روپیہ بھی لیا اور قرض رقمیں بھی لیں۔ یہ ایسی بات ہے جو کسی محدث یا مؤرخ نے نہیں کہی، خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی مشہور تقریر میں اس کی تردید کی ہے۔ (طبری ص ۱۰۳ ج ۵) اور جس کو پوری ملت نے غنی کا خطاب دیا درایۃً اس کی سیرت کے خلاف ہے۔ ایسی بات جو عام محدثین کی روایات اور اُن کے مسلمات سے ہٹ کر کہی جائے اصولِ روایت کے لحاظ سے ''شاذ'' اور ''منکر'' کہلاتی ہے۔ شاذ اور منکر روایت ضعیف ہوتی ہے قابل استناد نہیں ہوتی۔

اسی طرح یہ علت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اقرباء کو خود اپنی دولت تقسیم کی۔ اس طرح کہ اپنے لڑکوں کو بھی دس ہزار ہی دیے جو دوسروں کو ملے تھے۔ یہ ایک مستند اور مشہور روایت ہے سب ہی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ مودودی صاحب نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ (خلافت وملوکیت ص ۳۲۱) لہٰذا اس مشہور اور مسلم کے خلاف اس قول میں جو کچھ کہا گیا ہے کہ بیت المال میں سے اپنا حق لے کر ورثاء میں تقسیم کیا۔ اصولِ روایت کے لحاظ سے شاذ و منکر اور نا قابل اعتبار ہے۔

مودودی صاحب نے الفاظ کے گورکھ دھندے میں روایت کی ان تمام کمزوریوں پر پردہ ڈال دیا۔ کیا اس کا نام دیانت ہے؟

(۶) مودودی صاحب کی چابکدستی ملاحظہ ہو۔ آپ تردید کو تائید فرما رہے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

> ''اس کی تائید ابن جریر طبری کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ افریقہ میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے وہاں کے بطریق سے تین سو قنطار سونے پر مصالحت کی تھی (فامربها عثمان لآل الحکم) پھر حضرت عثمان نے یہ رقم الحکم یعنی مروان کے باپ حکم کے خاندان کو عطا کر دینے کا حکم دیا۔ (خلافت وملوکیت ص ۳۲۷)

اس بیان کے نقل کرنے میں مودودی صاحب نے کمال یہ کیا ہے کہ اس بیان کا آخری لفظ جس سے روایت کا بوگس اور متضاد ہونا ثابت ہو وہ نقل ہی نہیں کیا۔ **قلت اولمروان قال لا ادری** (طبری ص ۵۰ ج ۵)

مطلب یہ ہے کہ یہ روایت ابن کعب نے بیان کی تھی۔ اسامہ بن زید لیثی راوی ہیں۔ راوی یعنی اسامہ بن زید لیثی نے ابن کعب سے دریافت کیا۔ ''آل حکم'' سے مراد کون ہیں۔ کیا مروان کو یہ رقم دی تھی تو ابن کعب نے جواب دیا مجھے خبر نہیں۔

اب غور فرمایئے! افریقہ کے خمس کا معاملہ ہے۔ ابن کعب کہتے ہیں مجھے خبر نہیں کس کو یہ رقم دی۔ مشہور یہ ہے کہ افریقہ کا خمس مروان کو دیا گیا۔ اس بنا پر اسامہ بن زید بھی یہی فرماتے ہیں کہ کیا یہ رقم مروان کو دی۔ اگر ابن کعب کو معلوم نہیں کہ کس کو دی تو اسامہ بن زید کا قیاس صحیح ہوگا کہ مروان کو دی گئی۔ خود مودودی صاحب بھی یہی سمجھتے ہیں، اسی بناء پر بزعم خود اس کو تائید فرمارہے ہیں، لیکن اس صورت میں اس روایت سے تائید نہیں ہوتی۔ بلکہ تضاد اور اختلاف میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو روایتیں پیش کی گئی ہیں اب تک ان میں یہ اختلاف تھا کہ مروان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پندرہ ہزار روپے دیے یا خمس دیا۔ خمس دیا تو مصر کا یا افریقہ کا، یا افریقہ کا خمس مروان کے ہاتھ پانچ لاکھ میں فروخت کر دیا تھا۔ وہ رقم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے معاف کر دی۔ اب ایک اضافہ اور ہو گیا کہ یہ خمس نقد رقم تھی یا قابل فروخت سامان۔ اس روایت میں ہے کہ تین سو قنطار تھے۔ یعنی یہ خمس سونے کی شکل میں تھا اور تین سو قنطار تھا تو فروخت کرنے والی روایت کے بھی خلاف ہوا اور تعداد میں بھی اختلاف ہو گیا کہ پانچ لاکھ کے بجائے تین سو قنطار رہے۔ تین سو قنطار کتنا بھی ہوتا ہو پانچ لاکھ نہیں ہوتا۔

اب کوئی بھی انصاف پسند اس پوری روایت پر غور کرے گا تو وہ اس کو ''متضاد'' قرار دے گا۔ یہ مودودی صاحب کی خوش فہمی ہے کہ وہ اس کی تائید فرمارہے ہیں۔ مزید برآں کمال یہ ہے کہ ابن جریر طبری نے اس کو ۲۷ھ کے واقعات میں نقل کیا ہے اور قرینِ قیاس بھی یہی ہے کہ اگر یہ انعام دیا گیا ہے تو ۲۷ھ میں یعنی خلافت کے نصف اوّل میں عطا فرمایا گیا ہوگا۔ کیونکہ افریقہ انہیں ایام میں فتح ہوا تھا، مگر ابن سعد کے مصنوعی زہری فرمارہے ہیں کہ ست اواخر یعنی نصف ثانی کے چھ برسوں میں انعامات دیے اور بخششیں کیں۔

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

(۷) سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود بھی ایک موقع پر ایک مجلس میں جہاں حضرت علی، حضرت سعد ابن ابی وقاص، حضرت زبیر، حضرت طلحہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم موجود تھے اور اُن کے مالی عطایا پر اعتراضات زیر بحث تھے اپنے طرز عمل کی تشریح فرمائی:

میرے دونوں پیش رو اپنی ذات اور اپنے رشتہ داروں کے معاملہ میں سختی برتتے رہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے رشتہ داروں کو مال دیا کرتے تھے۔ میں ایک ایسے خاندان میں سے ہوں جس کے لوگ قلیل المعاش ہیں۔ میں نے اس خدمت کے بدلے میں جو میں اس حکومت کی کر رہا ہوں اس مال میں سے روپیہ لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ایسا کرنے کا حق ہے۔ اگر آپ لوگ اسے غلط سمجھتے ہیں تو اس روپیہ کو واپس کرنے کا فیصلہ کر دیجیے میں آپ کی بات مان لوں گا۔ سب لوگوں نے کہا آپ نے یہ بات بہت ٹھیک فرمائی۔ پھر حاضرین نے کہا آپ نے عبداللہ بن خالد بن اُسید اور مروان کو روپیہ دیا ہے ان کا بیان تھا کہ یہ رقم مروان کو پندرہ ہزار کی اور ابن سعد کو ۵۰ ہزار کی مقدار میں دی گئی۔ چنانچہ یہ رقم ان دونوں سے بیت المال کو واپس دلوائی گئی اور لوگ راضی ہو کر مجلس سے اُٹھے۔ (خلافت وملوکیت ص ۳۲۷، ۳۲۸)

اگر مودودی صاحب یا راویٔ روایت ان رشتہ داروں میں سے کسی ایک دو کا نام لے دیتے تو ہم یہ کہنے کی جرأت نہ کرتے کہ یہ روایت اپنی تردید آپ کر رہی ہے۔ تاریخ اسلام سے معمولی واقفیت رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ حضرت عثمان[19] رضی اللہ عنہ خود دولتمند تھے اور آپ کا خاندان بھی دولتمند تھا۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی امتیازی خصوصیات میں یہ کہا جاتا ہے کہ بنو ہاشم اتنے صاحب دولت نہیں تھے جتنے صاحب حوصلہ تھے اور بنو اُمیہ کے پاس دولت تھی، مگر

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے مستثنیٰ افراد کے علاوہ عام طور پر بنو اُمیہ خرچ کرنے کے حوصلے سے محروم تھے مثلاً حضرت ابوسفیان جو بنو اُمیہ ہی میں سے تھے ان کی بیوی نے (حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا نے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تھی کہ ابوسفیان بہت ہی ہاتھ روک کر خرچ کرتے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ بخیل (کنجوس [20]) آدمی ہیں۔

محترم مودودی صاحب نے مفہوم بیان کر دیا کہ میں ایسے خاندان سے ہوں جس کے لوگ قلیل المعاش ہیں۔ حالانکہ الفاظ یہ ہیں **انا فی رھط اھل عیلة وقلة معاش** (طبری ج ۵ ص ۱۰۱) یعنی صرف قلیل المعاش نہیں بلکہ یہ بھی کہ صاحبِ فقر و فاقہ ہیں۔ اھل عیلة (صاحب فقر وفاقہ) اور قلیل المعاش۔

اب اگر صاحب فقر وفاقہ اور قلیل المعاش مروان ہیں، کیونکہ بخشش کے سلسلہ میں انہیں کا نام لیا جاتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ یہی راوی حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ افریقہ کا خمس مروان نے پانچ لاکھ میں خرید لیا تھا (ابن خلدون وابن کثیر) تو یہ اہل عیلہ اور قلیل المعاش عجیب ہیں جو لاکھوں کی خرید وفروخت کرتے ہیں اور فقیر ومسکین [21] بھی ہیں۔

دوسرے صاحب خالد بن اُسید۔ وہ اتنے قریبی رشتہ دار نہیں ہیں کہ اُن کو خاندان کا فرد کہا جا سکے۔ اس کے علاوہ وہ تمام روایتیں اس روایت کی تردید کرتی ہیں جن میں خمس افریقہ کے عطا کرنے یا پانچ لاکھ میں فروخت کرنے پھر قیمت کو معاف کر دینے کا افسانہ ہے (جو پہلے گزر چکا ہے) یہ تضاد اور اہمال مفہوم کے لحاظ سے ہے باقی رہا سند کا معاملہ تو وہ اس سے بھی زیادہ عجیب بلکہ مضحکہ خیز ہے۔ اس سند میں یکے بعد دیگرے پانچ راوی ہیں۔

(۱) عبداللہ بن احمد بن شبویہ (۲) یہ عبداللہ اپنے والد احمد بن شبویہ سے نقل کرتے ہیں (۳) احمد بن شبویہ عبداللہ سے نقل کرتے ہیں۔ یہ تین بزرگ کون ہیں؟ بہت بہتر ہو اگر مودودی صاحب یا ان کے ہم نوا حضرات ان کا تعارف کرا دیں اگر وہ تعارف نہ کرا سکیں اور یقیناً نہیں کرا سکتے تو مجہول راویوں کی روایت کا مقام ردّی کی ٹوکری ہے۔ استدلال میں اس کو پیش کرنا استدلال کی توہین ہے۔

(۴) چوتھے راوی اسحاق بن یحییٰ ہیں، بسلسلہ اسماء الرجال ان کا تعارف کرایا گیا ہے۔

مگر اسی طرح یحیٰی بن سعید قطان فرماتے ہیں شبه لا شئ ''ایک دھوکا ہیں ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے'' اور ابن معین فرماتے ہیں لا یکتب حدیثه ''یہ اس قابل نہیں کہ ان کی حدیث لکھی جائے'' (میزان الاعتدال) بہر حال پہلے تین راوی اگر ان کا تعارف ہو جائے اور فرض کر لیجیے وہ سب ثقہ ثابت ہوں تو اسحاق بن یحیٰی کا واسطہ ایسا ہے جو ان کی ثقاہت کو ختم کر دے گا اور سند کو لامحالہ لاشئ بنا دے گا۔

(۵) پانچویں راوی موسیٰ بن طلحہ ہیں وہ بقول حافظ ذہبی رحمہ اللہ ثقہ جلیل ہیں، مگر جب ان تک رسائی کے واسطے ضعیف، کمزور، لاشئ اور بے حقیقت ہیں تو راوی اوّل کی ثقاہت اس لاشئ اور بے حقیقت کو قابل اعتماد نہیں بنا سکتی۔

تعجب ہوتا ہے مودودی صاحب اور ان کے ہم نوا حضرات سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام لگانے کے لیے تو ایسی ضعیف بلکہ مضحکہ خیز روایتوں پر بھی اعتماد کرتے ہیں اور خود سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا بیان بھی تسلیم نہیں کرتے۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ کون سا انصاف ہے کہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ارشاد کو تسلیم نہ کیا جائے جو آپ نے اہل مدینہ کے مجمع عام میں فرمایا تھا کہ:

''میں نے جو کچھ دیا، اپنے پاس سے دیا، میں مسلمانوں کے مال کو نہ اپنے لیے جائز سمجھتا ہوں نہ کسی بھی شخص کے لیے۔ (طبری ص ۱۰۳ ج ۵)

پری نہفتہ و دیو بکرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

انوکھا انداز صفائی نا قابل التفات الزام بہر حال درست

سیّدنا حضرت علی، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے بیانات

محترم سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ایک ایسی جماعت کے امیر اور امام ہیں جو یقیناً کسی طرح گوارا نہیں کرسکتی کہ اس جماعت کے فرد یا اس کے امام اور امیر کو شیعی کہا جائے لیکن یہ تضاد بیانی نا قابل فہم ہے کہ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام لگانے کے لیے تو مودودی صاحب کمزور سے کمزور روایت بڑی شان سے پیش فرماتے ہیں اور اس کے برخلاف جن بیانات سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی صفائی اور براءت ثابت ہو، مودودی صاحب اس کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں گویا وہ تاریخ کے ذخیرہ میں موجود ہی نہیں ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وہ تقریر جو طبری ص ۱۰۳ ج ۵ کے حوالہ سے ہم پہلے نقل کر چکے ہیں جو آپ نے اہل مدینہ کے مجمع عام میں فرمائی تھی اور اس میں بڑی قوت سے ارشاد فرمایا تھا:

> ''اپنے کسی رشتہ دار کو جو کچھ میں نے دیا ہے وہ اپنے پاس سے اپنے مال میں سے میں نے دیا ہے، مسلمانوں کا مال میں نے نہ اپنے لیے کبھی جائز سمجھا نہ اپنے کسی رشتہ دار کے لیے۔''

(۲) اچھا رہنے دیجیے یہ خود (معاذ اللہ) ملزم کا بیان ہے، ملزم کا بیان نظر انداز کیجیے، مگر

عجیب بات یہ ہے کہ مودودی صاحب بھول جاتے ہیں کہ وہ خود یہ تحریر فرما چکے ہیں کہ:

> ''جب بلوائیوں کا ہجوم مدینہ پہنچا اور اُن لوگوں نے حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تو ان تینوں بزرگوں نے ان کو جھڑک دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ایک ایک الزام کا جواب دے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پوزیشن صاف کی۔'' (خلافت وملوکیت ص ۱۱۷)

غور فرمائیں کہ اسی کتاب کے ص ۱۱۷ پر پوزیشن کی صفائی کا اعتراف ہے، پھر کمزور اور ضعیف روایتیں پیش کر کے انہیں الزامات کو دہرایا جا رہا ہے۔ جن میں سے ایک ایک کا جواب حضرت علی رضی اللہ عنہ دے چکے تھے۔ (فیاللعجب)

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ سیّدنا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ایک بھرے مجمع میں خود خوارج کے منہ پر ان تمام الزامات کا دندان شکن جواب دیتے ہیں۔ جملہ مؤرخین جن کو مودودی صاحب تاریخ اسلام کے مستند ترین مؤرخ قرار دیتے ہیں وہ ان جوابات کو نقل کرتے ہیں، لیکن مودودی صاحب کے نزدیک تاریخ کا صحیح مطالعہ غالباً یہی ہے کہ جو واقعہ ان کی منشاء کے خلاف ہو اگر چہ وہ دوپہر کے چمکتے ہوئے آفتاب کی طرح روشن ہو، مگر مودودی صاحب وضاحت وصراحت کجا، اشارہ اور کنایہ میں بھی اس کا ذکر نہ کریں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ خوارج نے یزید کے مقابلہ پر سیدنا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا ساتھ دیا تھا۔ جب یزید کا انتقال ہو گیا اور اس کے جانشینوں نے پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما پر یورش کا ارادہ کیا اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ان کے مقابلے کی تیاری کرنے لگے تو اب بھی خوارج نے یہی ارادہ کیا کہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا ساتھ دیں، لیکن کچھ ہوش مندوں کو خیال آیا کہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا ساتھ دینے سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کریں۔ اگر وہ ہمارے ہم نوا نہیں ہیں تو ہمیں بھی کیا ضرورت ہے کہ ان کی امداد وحمایت میں جان کھپائیں۔

چنانچہ خوارج کے نمائندے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے یہاں پہنچے اور کہا:
جناب والا! ہم نے پہلے بغیر رائے معلوم کیے آپ کا ساتھ دیا تھا، اب ہم آپ کا ساتھ
جب دیں گے جب عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ کی رائے معلوم ہو جائے گی۔
حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے مجلس پر نظر ڈالی تو ان کے حامی بہت کم تھے آپ
نے اس وقت ان کو ٹال دیا کہ آپ صاحبان ایسے وقت آئے ہیں کہ مجلس برخاست ہو رہی
ہے۔ میں اُٹھ رہا ہوں آپ صاحبان شام کو تشریف لائیں، اس وقت اطمینان سے بات چیت
ہوگی۔ یہ لوگ چلے گئے تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے 'اصحاب' کو پیغام
بھیجا کہ وہ شام کو اپنے اسلحہ لگا کر یہاں آئیں۔ خوارج کے آنے کا وقت ہوا تو تمام اسلحہ بند
اصحاب کو دو قطاروں میں کھڑا کر دیا اور ایک جماعت جن کے ہاتھوں میں لوہے کے گرز تھے،
حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے گرد کھڑی ہوگئی۔ اب خوارج کی جماعت آئی ان کے
قائد ابن الارزق نے یہ شان دیکھی تو ساتھیوں سے کہا کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ اس نے اپنے
خطیب عبیدہ بن ہلال سے کہا کہ اپنا مقصد بیان کرو۔ عبیدہ نے نہایت فصیح و بلیغ پیرایہ میں حمد و
ثنا کے بعد سیّدنا حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی تعریف کی اور کہا کہ یہ دونوں
کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر عمل کرتے رہے۔ پھر لوگوں نے عثمان بن
عفان کو خلیفہ بنا دیا۔

فحمى الاحماء فآثر القربىٰ واستعمل الغنى [۲۲] ورفع [۲۳] الدرة
ووضع السوط ومزق الكتاب وحقر المسلم وضرب منكرى
الجور. وآوى طريد رسول الله صلى الله عليه وسلم وضرب
السابقين بالفضل وسيرهم و حرمهم ثم اخذ فى الله الذى افاء
عليهم فقسمه بين فساق القريش و مجان العرب فسارت اليه
طائفة من المسلمين اخذ الله ميثاقهم على طاعته لا يبالون فى
الله لومة لائم فقتلوه فنحن لهم اولياء ومن ابن عفان واولياء ٥
براء فما تقول انت يا ابن الزبير.

''اس شخص نے بہت سی زمینوں کو حمی (سرکاری چراگاہ) بنایا، اپنے رشتہ داروں کو ترجیح دی، دولتمندی کا مظاہرہ کیا، درّہ ختم کر دیا، کوڑے سے پٹوانا شروع کیا، کتاب کو پھڑوا دیا (ایک متفق علیہ مصحف کے علاوہ باقی تمام مصاحف کو جلوا دیا۔ محمد میاں) مسلم کو ذلیل کیا اور جو ظلم کرنے سے انکار کرتے تھے ان کو پیٹا، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکال دیا تھا اس کو سکونت کی اجازت دے دی جو حضرات اپنے علم و فضل میں نمایاں درجہ رکھتے ہیں ان کو مارا، جلاوطن کیا اور محروم کر دیا (ان کے وظیفے بند کر دیے) پھر وہ مال جو بطورِ فے آتا تھا اس کو لیا، ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جو قریش کے فاسق اور عرب کے آوارہ گرد اور لا اُبالی آدمی ہیں۔ پس مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت چلی جو اللہ کی اطاعت پر عہد و پیمان کیے ہوئے تھی۔ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اس کو خوف نہیں تھا، اس نے عثمان کو قتل کر دیا۔ ہم اس جماعت کے حامی ہیں اور ولی ہیں اور جو لوگ عثمان کے حامی اور ولی ہیں ہم ان سے بے زار ہیں۔ اب آپ فرمائیے ابن زبیر آپ کیا رائے رکھتے ہیں۔''

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا جواب:

نہایت نازک موقع تھا جب خوارج نے یہ سوالات پیش کیے۔ دشمن مقابلہ پر تھا اور جن سے امداد کی توقع کی جا سکتی تھی وہ یہ سوال کر رہے تھے۔ مگر سیّدنا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے صداقت کو سیاست پر قربان نہیں کیا۔ آپ نے حمد و ثنا اور مسنون خطبہ کے بعد فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سیّدنا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق جو کچھ آپ نے کہا وہ اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں جو تم نے بیان کیا۔ باقی رہے سیّدنا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تو ان کے بارے میں۔

وقد فهمت الذی ذکرت به عثمان بن عفان رحمة الله علیه وانی لا اعلم مکان احدٍ من خلق الله الیوم اعلم بابن عفان وامره منی

كنت معه حيث نقم القوم عليه واستعتبوه فلم يدع شيئًا استعتبه القوم فيه الا اعتبهم منه ثم انهم رجعوا اليه بكتاب له يزعمون انه كتبه فيهم يا مرفيه بقتلهم فقال لهم ما كتبته فان شئتم فها توا ببينتكم فان لم تكن. حلفت لكم فوالله ما جاؤ وا ببينةٍ ولا استحلفوه. ولوثبوا عليه فقتلوه. وقد سمعت ما عبته به فليس كذلك بل هو لكل خير اهل وانا اشهدكم ومن حضر. انى ولى لابن عفان فى الدنيا والاخرة وولى اولياء ه وعدو اعداء ه قالوا فبرئ اللّٰه منك يا عدوا الله قال فبرئ الله منكم يااعداء الله وتفرق القوم.

''جو کچھ تم نے کہا میں نے اس کو خوب سمجھا اور میں نہیں جانتا کہ آج کے دن اللہ کی تمام مخلوق میں کوئی شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اوران کے معاملہ کا مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے۔ جب اعتراض کرنے والوں نے اپنے اعتراضات پیش کیے اور تدارک کا مطالبہ کیا اس وقت میں ان کے ساتھ تھا۔ ان لوگوں نے جس بات کا تدارک چاہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کا تدارک کر دیا۔ کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں رہی جس کا تدارک نہ کر دیا ہو۔ پھر وہ دوبارہ آئے ان کی (حضرت عثمان) ایک تحریر لے کر وہ یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ یہ تحریر ان کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھی ہے (رضی اللہ عنہ) اس تحریر میں ان لوگوں کو قتل کرنے کا حکم تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے یہ تحریر نہیں لکھی اگر تم چاہو تو ثبوت پیش کرو اور اگر تم ثبوت نہیں پیش کر سکتے تو میں تمہارے سامنے قسم کھا سکتا ہوں۔ خدا کی قسم! نہ انہوں نے کوئی ثبوت پیش کیا اور نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قسم لی (بلکہ) دفعۃً وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کود پڑے اوران

کو شہید کر دیا اور میں نے ان الزاموں کو سنا جو تم نے اُن پر لگائے ہیں
جیسا تم کہتے ہو وہ ایسے ہرگز نہیں تھے بلکہ وہ ہر ایک خوبی اور خیر کے
مستحق تھے اور میں تم کو اور جو بھی موجود ہیں ان سب کو گواہ بناتا ہوں کہ
میں ابن عفان کا ولی اور حامی ہوں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور
جو اُن کے حامی ہوں ان کا میں حامی ہوں اور جو ان کے دشمن
(مخالف) ہیں اُن کا میں دشمن ہوں (حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ
عنہما کے اس واشگاف جواب کے بعد آپ کو خطاب کرتے ہوئے)
خوارج نے کہا تجھ سے اللہ بیزار ہے اے دشمن خدا!۔ حضرت ابن زبیر
رضی اللہ عنہما نے جواب دیا۔ خدا کے دشمنو! خدا تم سے بیزار۔ پھر یہ لوگ
حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے جدا ہو گئے۔" (ابن جریر ص ۵۵ و ص
۵۶ ج ۷، تاریخ الکامل لابن اثیر ص ۶۵ ج ۴ و ص ۳۳۶ مطبوعہ الادارۃ المنیریہ)

معلوم ہوتا ہے کچھ اعتراضات رٹا دیے گئے تھے۔ خوارج کے خطیب نے انہیں رٹے ہوئے اعتراضات کو دُہرا دیا۔ سیّدنا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اس وقت ان کا جواب نہیں دیا کیونکہ پہلے بار بار دیے جا چکے تھے مختصر طور پر تردید کر دی کہ ان پر کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ ہر ایک الزام سے بری ہیں۔ اب تعجب یہ ہے کہ حضرت علامہ مودودی صاحب سوا تیرہ سو برس پہلے خوارج کے رٹے ہوئے سبق کو نہ صرف دہرا رہے ہیں بلکہ اس کو ثابت کرنے کے لیے قلم کی جولانیوں کو کام میں لا رہے ہیں اور ان کے برخلاف سیّدنا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے جو صفائی پیش کی وہ سب گاؤ خورد۔ گویا کسی کتاب میں موجود ہی نہیں۔ یعنی الزام بہرحال ثابت اور ان کا جواب ناقابل التفات۔

مروان کی شرارتیں اور فتنہ انگیزیاں:

مودودی صاحب فرماتے ہیں:

"دوسری چیز جو اس سے زیادہ فتنہ انگیز ثابت ہوئی وہ خلیفہ کے سیکرٹری
کی اہم پوزیشن پر مروان بن الحکم کی ماموریت تھی۔ ان صاحب نے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرم مزاجی اور ان کے اعتماد سے فائدہ اُٹھا کر بہت سے ایسے کام کیے جن کی ذمہ داری لامحالہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر پڑتی تھی۔ حالانکہ ان کی اجازت اور علم کے بغیر ہی وہ کام کرڈالے جاتے تھے۔ علاوہ بریں یہ صاحب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور اکابر صحابہ کے باہمی خوشگوار تعلقات کو خراب کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے۔ تاکہ خلیفہ برحق اپنے پرانے رفیقوں کے بجائے ان کو اپنا زیادہ خیر خواہ اور حامی سمجھنے لگیں۔ یہی نہیں بلکہ متعدد مرتبہ انہوں نے صحابہ کے مجمع میں ایسی تہدید آمیز تقریریں کیں جنہیں طلقاء کی زبان سے سننا سابقین اوّلین کے لیے بمشکل ہی قابل برداشت ہو سکتا تھا۔ اسی بنا پر دوسرے لوگ تو درکنار خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہ بھی یہی رائے رکھتی تھیں۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شوہر محترم سے صاف صاف کہا کہ اگر آپ مروان کے کہے پر چلیں گے تو یہ آپ کو قتل کرا کے چھوڑے گا۔ اس شخص کے اندر نہ اللہ کی قدر ہے، نہ ہیبت نہ محبت۔" (ص ۱۱۵ و ص ۱۱۶)

تبصرہ:

اس تحریر کے متعلق مودودی صاحب نے کتابوں کے حوالے تو دیے کہ فلاں فلاں کتاب سے یہ مضمون اخذ کیا ہے۔ مگر ایسی مثال جس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بے محل نرم مزاجی یا مروان کی جرأتِ بے جا اور فتنہ انگیزی وغیرہ ثابت ہو، نہ مودودی صاحب نے پیش کی نہ ان کتابوں میں کوئی ایسی مثال دی گئی ہے جن سے یہ مضمون اخذ کیا ہے۔ فقط کہہ دینے اور لکھ دینے سے الزام ثابت نہیں ہوتا اور جو باتیں ان کتابوں میں لکھی گئی ہیں اگر انہیں کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اس الزام کے سلسلہ میں بھی مودودی صاحب نے اور ان لوگوں نے جن کی تقلید مودودی صاحب کر رہے ہیں سراسر غلط بیانی کی ہے۔

مودودی صاحب مروان کی ان باتوں کو شورش کے اسباب میں شمار فرما رہے ہیں اور

انداز بیان یہ ہے کہ گویا مروان کی یہ حرکتیں عرصہ دراز تک مسلسل ہوتی رہیں۔ حالانکہ وہ باتیں جو بطور مثال پیش کی جاتی ہیں اس وقت کی ہیں جب شورش برپا ہو چکی تھی اور وہ صورت پیدا ہو گئی تھی جس کا نقشہ خود مودودی صاحب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

(۱) اس تحریک (حضرت خلیفہ سوم کو معزول کرنے ورنہ شہید کر دینے) کے علمبردار مصر، کوفہ اور بصرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے باہم خط و کتابت کر کے خفیہ طریقہ یہ طے کیا کہ اچانک مدینہ پہنچ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر دباؤ ڈالیں۔

(۲) انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست مرتب کی جو زیادہ تر بالکل بے بنیاد ایسے کمزور الزامات پر مشتمل تھی جن کے معقول جوابات دیے جا سکتے تھے اور بعد میں دیے گئے (جو پچھلے صفحات پر گزر چکے ہیں۔ محمد میاں) پھر باہمی قرارداد کے مطابق یہ لوگ جن کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ مصر، کوفہ اور بصرہ سے بیک وقت مدینہ پہنچے۔

(۳) یہ کسی علاقے کے بھی نمائندے نہیں تھے بلکہ ساز باز سے انہوں نے ایک پارٹی بنائی تھی۔

(۴) جب یہ مدینہ کے باہر پہنچے تو حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو انہوں نے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی مگر تینوں بزرگوں نے ان کو جھڑک دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک ایک الزام کا جواب دے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پوزیشن صاف کی، مدینہ کے مہاجرین و انصار بھی جو دراصل اس وقت مملکت اسلامیہ میں اہل حل و عقد کی حیثیت رکھتے تھے ان کے ہمنوا بننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

(۵) مگر یہ لوگ اپنی ضد پر قائم رہے اور بالآخر انہوں نے مدینہ میں گھس کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو گھیر لیا۔ اُن کا مطالبہ یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جواب یہ تھا کہ میں تمہاری ہر شکایت کو دُور کرنے کے لیے تیار ہوں جو صحیح اور جائز ہو، مگر تمہارے کہنے سے میں معزول نہیں ہو سکتا۔

(۶) اس پر ان لوگوں نے چالیس روز تک ایک ہنگامہ برپا کیے رکھا جس کے دوران میں

ایسی ایسی حرکات ان سے سرزد ہوئیں جو مدینۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے اُم المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی توہین کی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ کہہ کر مدینہ سے چلی گئیں کہ اس طوفان بدتمیزی میں کیا میں اپنی بھی توہین کرواؤں۔ آخر کار ان لوگوں نے ہجوم کر کے سخت ظلم کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ تین دن تک ان کا جسد مبارک تدفین سے محروم رہا اور قتل کرنے کے بعد ظالموں نے ان کا گھر بھی لوٹ لیا۔ (ص ۱۱۷ و ص ۱۱۸)

معترضہ:

(۱) مودودی صاحب کی اصل عبارت میں نمبر نہیں ہیں نمبر ہم نے لگا دیے ہیں۔

(۲) یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بلوائیوں کے گروہ کی آمد تک مروان کی کسی تحریر تقریر یا فتنہ انگیزی کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

(۳) مودودی صاحب کی اس تحریر کو دوبارہ ملاحظہ فرمایئے۔ نمبر ۲ و نمبر ۳ میں مودودی صاحب اعتراف کر رہے ہیں کہ شورش برپا کرنے والے تقریباً دو ہزار افراد تھے۔ یہ کسی علاقے کے بھی نمائندے نہیں تھے۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست مرتب کی جو زیادہ تر بالکل بے بنیاد تھی۔

(۱) اب انصاف فرمایئے، فتنہ کا سبب یہ لوگ تھے یا مروان کی سیکرٹری شپ اور ان کی فتنہ انگیز تقریریں وغیرہ۔

(۲) مودودی صاحب کے قلم سے ایک صحیح بات نکل گئی، مگر افسوس یہ ہے کہ مودودی صاحب خود اس صحیح بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مودودی صاحب اگر اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ یہ دو ہزار افراد جو کہ کسی کے بھی نمائندے نہیں تھے عبداللہ بن سبا کے تربیت دادہ اور اس کی پارٹی کے تھے۔ پھر خود ان کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو کچھ وہ الزامات لگا رہے ہیں وہ سب غلط ہیں اور یہ پوری کریپ جو انہوں نے لکھی ہے، دفتر بے معنی ہے۔

مروان کی یہ حرکتیں کب ہوئیں:

مودودی صاحب کا ارشاد ہے:

''ایک اور موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور اپنی قرابت کا واسطہ دے کر ان سے کہا کہ آپ اس فتنہ کو فرو کرنے کے لیے میری مدد کریں۔ انہوں نے جواب دیا سب کچھ مروان بن الحکم، سعید بن العاص، عبداللہ بن عامر اور معاویہ کی بدولت ہو رہا ہے۔ آپ ان لوگوں کی بات مانتے ہیں اور میری نہیں مانتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا اچھا اب میں تمہاری بات مانوں گا۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ، انصار و مہاجرین کے ایک گروہ کو ساتھ لے کر مصر سے آنے والے شورشیوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو واپس جانے کے لیے راضی کیا۔''

(خلافت وملوکیت ص ۳۳۲)

معترضہ:

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ لوگ واپس جانے کے لیے راضی ہو گئے اور واپس بھی ہو گئے لیکن پھر لوٹ آئے اور نعرے لگاتے ہوئے مدینہ میں داخل ہوئے اور یہ کہ جو ہمارے مقابلہ پر نہیں آئے گا وہ مامون ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا تم کیوں واپس آ گئے۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ ایک خط پکڑا گیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا خط وغیرہ کچھ نہیں یہ تمہاری سازش ہے۔ تم مدینہ ہی میں سے یہ طے کر کے گئے تھے کہ اس طرح ایک بہانہ بنا کر واپس ہوں گے۔ ان لوگوں نے کہا آپ جو کچھ بھی خیال کریں ہم تو اس کو معزول کرنا چاہتے ہیں۔ (تاریخ طبری ص ۱۰۵ ج ۵)

مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

''اسی زمانۂ فتنہ میں ایک اور موقع پر حضرت علی سخت شکایت کرتے ہیں کہ میں معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں اور مروان ان کو پھر بگاڑ دیتا ہے آپ خود منبر رسول پر کھڑے ہو کر لوگوں کو مطمئن کر دیتے ہیں اور آپ کے جانے کے بعد آپ ہی کے دروازے پر کھڑا ہو کر مروان لوگوں کو گالیاں دیتا ہے اور آگ پھر بھڑک اُٹھتی ہے۔

(خلافت وملوکیت ص ۱۳۲)

خلاصہ:

معاملہ کو سلجھانے اور مروان کے گالیاں دینے کی تفصیل تو بعد میں عرض کی جائے گی یہاں یہ بات واضح کرنی ہے کہ مروان کی یہ حرکتیں جو کچھ بھی ہوئیں شورش اور فتنہ کے زمانہ میں ہوئیں۔ لہٰذا ان کو اس انداز سے بیان کرنا کہ گویا ایک عرصے سے یہ باتیں مروان کی طرف سے ہو رہی تھیں حتیٰ کہ ان کی بناء پر شورش ہوئی یا شورش برپا کرنے میں وہ مددگار ثابت ہوئیں یہ قطعاً غلط ہے۔ شورش کے بانی تو وہی ہیں، جن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ شورہ پشت تھے۔ تخریب پسند جو بقول مودودی صاحب کسی کے بھی نمائندے نہیں تھے، جب وہ مدینہ پر چھا گئے تب یہ باتیں ہوئیں جن کو مروان کی فتنہ انگیزی کہا جا رہا ہے۔ مروان کی یہ باتیں اگر ثابت بھی ہو جائیں جو بیان کی جاتی ہیں تو وہ دفاع کے وقت کی ہیں ان کو بلوائیوں کے اقدام کا سبب بتانا قطعاً غلط ہے۔

مروان کی تقریر اور فتنہ انگیزی کا افسانہ:

مودودی صاحب کی یہ تمام تحریر جو اس بحث کے آغاز میں پیش کی گئی جس پر یہ تبصرہ چل رہا ہے۔ اس کا ماخذ واقدی کی ایک طویل روایت ہے۔ ابن اثیر، حافظ ابن کثیر اور ابن خلدون وغیرہ نے اس کے اقتباسات لیے ہیں۔ طبری نے اس پوری روایت کو نقل کر دیا ہے۔ (از ص ۱۰۸ تا ۱۱۳ ج ۵)

علامہ ابن جریر طبری نے اس کو اہمیت نہیں دی بلکہ اس کو آخر میں نقل کیا ہے اور ممکن ہے

ان کا خیال یہ ہو کہ "نقل کفر کفر نہ باشد"۔ مگر مودودی صاحب جیسے حضرات کے لیے یہ روایت ایک مستند اور مقدس دستاویز ہے۔ پوری روایت کو نقل کرنا یا پوری روایت کا ترجمہ کرنا تضیع اوقات ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بلوائی جب ایک خط کا بہانہ لے کر دوبارہ مدینہ پر چڑھ آئے اور یہ اعلان کر دیا کہ جو اُن پر حملہ نہیں کرے گا اس کو وہ بھی نہ ستائیں گے تو اس وقت ایک گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اس میں واسطہ تھے۔ اس گفتگو میں یہ بھی طے ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ، حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہما وغیرہ سے واسطہ نہیں رکھیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورے پر عمل کیا کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ

اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ بھی اصرار کیا کہ وہ مجمع عام میں تقریر کر کے لوگوں کو اطمینان دلا دیں۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تقریر فرمائی اور جیسا کہ وہ تقریباً ایک سال پہلے حضرت سعید بن العاص کے معاملہ میں کوفہ والوں کو لکھ چکے تھے کہ تمہارے مطالبہ کے بموجب میں نے سعید بن العاص کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کو مقرر کر دیا ہے اور واللہ میں معاملہ کو ختم کرنے اور حالات کی اصلاح کے لیے پورے صبر سے کام لوں گا اور تمہارے لیے کوئی حجت باقی نہیں چھوڑوں گا۔ (طبری ص ۹۶ ج ۵)

ایسے ہی اس تقریر میں بھی آخری حد تک اپنی تیاری کا اظہار کیا کہ وہ اتمام حجت کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ آپ نے اپنی غلطیوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور توبہ کی اور یہ بھی فرما دیا کہ اگر تقاضا حق یہ ہو کہ میں غلام کی حیثیت اختیار کر لوں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔

لَاذِلَّنَّ ذِلَّ الْعَبْد. ولا کونن کالعبد المرقوق ان ملک صبرو ان عتق شکر (طبری ص ۱۱۱ ج ۵، ابن اثیر ص ۸۲ ج ۳)

میں وہ ذلت برداشت کر لوں گا جو غلام برداشت کرتا ہے، میں اس زر خرید غلام کی طرح ہو جاؤں گا جو اگر مملوک رکھا جائے تو صبر کرتا ہے اور اگر اسے آزاد کر دیا جائے تو شکر ادا کیا کرتا

ہے۔ آپ صاحبان آئیں، مجھے مشورہ دیں میں مشورہ پر عمل کروں گا۔ لئن ابت یمینی لتتابعن شمالی۔ اگر میرا داہنا ہاتھ عمل نہیں کرے گا تو میرا بایاں ہاتھ عمل کرے گا اور مشورہ کی پیروی کرے گا۔ (طبری ص ۱۱۱ ج ۵)

اس تقریر کے بعد وہ مکان پر واپس تشریف لائے تو وہاں مروان اور خاندان کے کچھ اور لوگ موجود تھے۔ مروان منہ چڑھے خادم تھے۔ انہوں نے عرض کیا حضرت اگر آپ بااختیار اور اپنی جگہ پر محفوظ اور مضبوط ہوتے اور اس وقت یہ تقریر فرماتے تو سب سے پہلے میں آپ کے حوصلہ اور حق پسندی کی تعریف کرتا اور اب جبکہ آپ ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں اور ایسے پابند ہیں کہ گویا آپ کی نکیل دوسروں کے ہاتھ میں ہے آپ کی اس تقریر سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ اس کا اثر اُلٹا پڑے گا۔ (طبری ص ۱۱۱، ۱۱۲ ج ۵)

ہمیں یقین نہیں آتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ تقریر فرمائی ہوگی اور سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسی تقریر کا مشورہ دیا ہوگا۔ بہر حال اگر واقدی کی روایت تسلیم کی جاتی ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ نقطۂ اختلاف ہے۔ اس وقت تک کی کارروائی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ درست سمجھ رہی ہیں اور ان کو یہ توقع ہے کہ اس سے معاملہ سلجھ جائے گا اور فتنہ دب جائے گا اور مروان کی رائے یہ ہے کہ یہ فتنہ پرداز جن کا منشا تخریب اور جن کا مقصد شر انگیزی ہے جواب تک ''پر کا کوا'' بلکہ ''بلا پر کے کوے بناتے'' رہے ہیں اور حال ہی میں یہ بدعہدی کر چکے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سب کچھ وعدہ کر کے گئے اور تین روز بعد خط کا بہانہ لے کر دوبارہ آ گئے۔ وہ اس نرمی اور انکسار سے درست نہیں ہوں گے اُن کے حوصلے اور بلند ہوں گے۔ مروان کی اس گفتگو کو آپ مخلصانہ اظہار رائے بھی کہہ سکتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے، لیکن اس گفتگو پر یہ حاشیہ چڑھایا گیا کہ یہ صاحب حضرت عثمان اور اکابر صحابہ کے باہمی خوشگوار تعلقات کو خراب کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے تا کہ خلیفہ برحق اپنے پرانے رفیقوں کے بجائے ان کو اپنا زیادہ خیر خواہ اور حامی سمجھنے لگیں۔ (خلافت و ملوکیت ص ۱۱۵)

مروان نے سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اگر واقعی

کوئی غلطی ہوئی ہے تو میرے نزدیک اس غلطی پر قائم رہنا ایسی توبہ سے بہتر ہے جس کا انداز مرعوبانہ ہو۔ گویا آپ لوگوں سے ڈر کر توبہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا تقرب تقریر کی توبہ سے حاصل نہیں ہوتا، وہ اس توبہ سے حاصل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ہو۔ (طبری ص ۱۱۱ ج ۵)

مروان نے کہا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ آپ سمجھ رہے ہیں کہ معاملہ دب گیا۔ حالانکہ اب بھی آپ کے دروازہ پر لوگوں کا ہجوم ہے اور ان فتنہ پردازوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تو جو کچھ کہہ چکا ہوں اب اس کی تردید کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ تم چاہتے ہو تو اس مجمع سے خطاب کر لو۔

اب مروان پھاٹک پر پہنچے تو مجمع پہلے سے بھی زیادہ ہو چکا تھا اور بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ مجمع نہ صحابہ کرام کا تھا نہ فرزندان صحابہ یا اہل مدینہ کا بلکہ انہیں کا تھا جو مدینہ کو گھیرے ہوئے تھے اور بقول مودودی صاحب کسی کے بھی نمائندہ نہیں تھے۔

مروان نے ان کے سامنے بے شک ایک سخت تقریر[۲۴] کی کہ:

> ''تمہارے چہرے جھلس جائیں۔ تم لوگوں نے یہاں کیوں بھیڑ لگائی ہے۔ تم لوٹ مار کرنا چاہتے ہو کہ خلافت کو ختم کر دو۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر تم نے کوئی برا ارادہ کیا تو یاد رکھو ہم بھی وہ کریں گے جو تمہیں پسند نہیں ہوگا۔ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔ یاد رکھو ہم مغلوب نہیں ہیں۔'' (طبری ص ۱۱۴ ج ۵)

مروان کی یہ تقریر لامحالہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی ناگوار ہوئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نائلہ کو بھی ناگوار ہوئی۔ اس تقریر کی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مروان تم کو قتل کرا کے چھوڑے گا اور اسی تقریر کی بنا پر یہ بھی کہا گیا کہ مروان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حاوی ہے جو چاہتا ہے کر لیتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کا کچھ نہیں کر سکتے۔

اور یہی تقریر ہے جس کا تذکرہ مذکورہ بالا اقتباس میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

شکایت کی۔ آپ خود منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کھڑے ہو کر لوگوں کو مطمئن کرتے ہیں اور آپ کے جانے کے بعد آپ ہی کے دروازے پر کھڑا ہو کر مروان لوگوں کو گالیاں دیتا ہے اور آگ پھر بھڑک اُٹھتی ہے۔ (ص ۳۳۲)

(دروازے پر کھڑے ہو کر مروان نے یہی تقریر کی تھی جس کا پس منظر ہم نے اُوپر بیان کیا)۔

نتیجہ:

(۱) قطع نظر اس سے کہ تقریر برمحل تھی یا بے محل اور غیر موزوں تھی۔ یہ کھلے طور پر ثابت ہو گیا کہ اس تقریر کو فتنہ کا ثمرہ کہا جا سکتا ہے سبب نہیں کہا جا سکتا۔

(۲) اس تقریر کے مخاطب نہ صحابہ کرام ہیں نہ اولاد صحابہ یا اہل مدینہ۔ اس تقریر کے مخاطب وہی بے مہار بلوائی ہیں جو بقول مودودی صاحب کے کسی کے بھی نمائندے نہیں تھے۔ لہٰذا مودودی صاحب کا یہ الزام قطعاً غلط ہے کہ مروان نے متعدد مرتبہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع میں ایسی تہدید آمیز تقریریں کیں جنہیں طلقاء کی زبان سے سننا سابقین اوّل کے لیے بمشکل قابل برداشت ہو سکتا تھا۔ (ص ۱۱۶) متعدد بار نہیں صرف ایک مرتبہ اور صحابہ کے مجمع میں نہیں بلکہ ان شورہ پشتوں کے مجمع میں جو مدینہ پر اس وقت چھائے ہوئے تھے اور خلیفہ مظلوم کے شہید کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔

(۳) بے شک نائلہ اس تقریر سے ناراض ہوئیں۔ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وہی پالیسی پسند کرتی تھیں جس کا اعلان انہوں نے اپنی تقریر میں کیا تھا (اگر اس تقریر کے متعلق روایتوں کو صحیح مانا جائے) جس میں توبہ واستغفار کرتے ہوئے بزعم خود اتمام حجت کے لیے نہایت دبا ہوا انداز اختیار کیا تھا کہ میں غلاموں جیسی ذلت بھی برداشت کرنے کو تیار ہوں، میں زرخرید غلام کی طرح بننے کو تیار ہوں جس کو اگر مملوک رکھا جائے تو وہ صبر کرتا ہے اور اگر اُس کو آزاد کر دیا جائے تو وہ شکر کرتا ہے۔

پھر یہ بھی فرمایا تھا کہ آپ صاحبان آئیں مجھے مشورہ دیں اس پر عمل کروں گا لیکن اس تقریر کے کیا معنے تھے۔ کیا اس حوالگی کے معنے یہ نہیں تھے کہ آپ اپنے ہاتھوں وہ خلعت اُتار رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو پہنایا تھا اور جس کے بارے میں آپ بار بار فرما چکے تھے

کہ میں کبھی نہیں اُتاروں گا۔ خواہ جان جاتی رہے مجھے میرے حبیب کی وصیت ہی یہ ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

اور کیا اس تقریر کے معنے یہ نہیں تھے کہ آپ اپنے آپ کو اُن کے حوالے کر رہے ہیں جو بقول مودودی صاحب کسی کے نمائندے نہیں تھے۔ جن کا قائد عبداللہ بن سبا اور وہ حکیم بن جبلہ تھا جو چوروں اور ڈاکوؤں کی پارٹی کا مکھیا اور سرغنہ رہا تھا۔ (طبری ص ۹۰ ج ۵) اور اس کی یہی پارٹی اس وقت بھی پیش پیش تھی۔

(۴) اس تقریر کی بنا پر کہا گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مروان کے تابع ہو گئے۔ نائلہ نے بھی طعنہ دیا تھا۔ اطعت مروان یقودک حیث شاء (طبری ص ۱۱۲ ج ۵) (مروان کے تابع ہو گئے جدھر چاہتا ہے تمہیں کھینچ لے جاتا ہے)

لیکن معمولی توجہ سے بھی کام لیا جائے تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مروان کے تابع نہیں ہوئے تھے بلکہ اس تقریر کی بنا پر وہ اپنے مؤقف سے ہٹ گئے تھے اور مروان نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے راستہ پر نہیں چلایا بلکہ اس صراطِ مستقیم کی طرف اشارہ کر دیا جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ گامزن تھے اور آخر تک اسی پر گامزن رہنے کا عزم کر چکے تھے۔

واقدی کی روایت خلافِ قیاس اور خلافِ درایت

سمجھ میں نہیں آتا واقدی کی اس روایت کو کیسے تسلیم کر لیا جائے اور مودودی صاحب کو کیسے ہمت ہوئی کہ انہوں نے اس روایت کی بنیاد پر سخت ترین الزام لگا دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی محولہ بالا تقریر دوبارہ پڑھیے۔ اس پر مروان کے اعتراض نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس شکایت پر بھی نظر فرمایئے کہ میں جن معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں، مروان ان کو پھر بگاڑ دیتا ہے۔ (خلافت وملوکیت ص ۳۳۲)

اگر یہ تقریر صحیح ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ بموجب روایت واقدی یہ تقریر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منشا کے مطابق تھی اور مروان نے اس کے خلاف لب کشائی کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ

بہت ناراض ہوئے۔ (طبری ص ۱۱۳۳ وص ۱۱۲ ج ۵)

تو اس کا حاصل یہ ہے کہ سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ راضی ہو گئے تھے کہ سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے نظریات قربان کر دیں اور جامِ شہادت کے مقابلہ میں نظریات کی قربانی منظور کر لیں۔ مگر مروان کا قدم استقامت نہیں ڈگمگایا۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی قربانی کی تلقین کی اور اگرچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زندگی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ممانعت کے سبب سے وہ اپنا حوصلہ پورا نہیں کر سکے مگر جیسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی قربانی دی مروان بھی قربان ہونے کے لیے میدان میں آ گئے۔ بلوائیوں کا مقابلہ کیا اور ایسے زخمی ہوئے کہ بلوائی ان کو مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ (طبری ص ۱۲۴ ج ۵)

حضرت مودودی صاحب تو شاید یہ ہمت نہ کر سکیں البتہ حضرات ناظرین فیصلہ فرمائیں کہ اگر واقدی کی یہ ڈرامائی روایت تسلیم کی جاتی ہے تو مستحق مبارکباد کون ہوتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ یا مروان؟

خاتمۂ کلام

خلافتِ راشدہ سے ملوکیت کیوں اور کس طرح؟

مودودی صاحب کی اس تصنیف کا آخری عنوان ہے: خاتمہ کلام (صفحہ ۳۴۸) اس عنوان کے تحت آپ فرماتے ہیں:

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے میں معترض حضرات سے گزارش کرتا ہوں کہ اگر ان کے نزدیک میرا استدلال اور وہ مواد جس پر استدلال مبنی ہے اور وہ نتائج جو میں نے اس استدلال سے اخذ کیے ہیں سب کچھ غلط ہے تو بخوشی اس کی نفی کر دیں، مگر صرف نفی کر دینے سے کام نہیں چل سکتا۔ ان کو خود مثبت طریقے سے صاف صاف یہ بتا دینا چاہیے کہ:

(۱) قرآن وسنت کی رو سے اسلامی ریاست کے قواعد اور اسلامی اصولِ حکمرانی فی الواقع کیا ہیں؟

(۲) خلافت راشدہ کی وہ اصل خصوصیات کیا ہیں، جن کی بنا پر وہ خلافت علیٰ منہاج النبوت قرار دی جاتی ہے؟

(۳) اس خلافت کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت آئی یا نہیں؟

(۴) اگر آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ ملوکیت نہیں آئی، تو کیا بعد کی حکومتوں میں خلافت علیٰ منہاج النبوت کی خصوصیات موجود تھیں؟

(۵) اگر آپ مانتے ہیں کہ ملوکیت آ گئی تو وہ کن اسباب سے کس طرح آئی؟

(۶) کس مرحلے پر آپ یہ کہیں گے کہ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔

(۷) خلافتِ راشدہ اور اس ملوکیت میں وجوہ امتیاز کیا ہیں اور ایک کی جگہ دوسری کے آنے سے فی الواقع فرق کیا واقع ہوا؟

(۸) کیا اسلام میں خلافت اور ملوکیت دونوں یکساں ہیں یا ان میں سے ایک نظام اس کی نگاہ میں مطلوب ہے اور دوسرا نظام صرف ایسی صورت میں قابل برداشت ہے جبکہ اس کو تبدیل کرنے کی کوشش زیادہ بڑے فتنے کی موجب نظر آتی ہو؟

مودودی صاحب کے چیلنج کا جواب:

مودودی صاحب نے خاتمۂ کلام میں یہ سوالات کیے ہیں۔ ان کا جواب دینے سے پہلے ہم ایک سوال مودودی صاحب سے کرتے ہیں کہ آپ کا خطاب کس سے ہے۔ جہاں تک ہمارا علم ہے وہ معترض صاحبان جن سے آپ یہ سوالات کر رہے ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ماننے والے حنفی المسلک ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق آپ خود فرما چکے ہیں کہ ان کا مسلک یہ ہے کہ سب سے پہلے خلیفہ ابوبکر، پھر عمر فاروق، پھر عثمان غنی پھر حضرت علی رضی اللہ عنہم اور یہ خلفاء راشدین ائمہ مہدیین ہیں۔ (خلافت وملوکیت ص ۲۳۲)

پھر سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق آپ فرما چکے ہیں:

”حافظ ابن کثیر کے بقول سنت بھی یہی ہے کہ ان کو خلیفہ کے بجائے

بادشاہ کہا جائے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی۔ پھر بادشاہی ہوگی اور یہ مدت ربیع الاول ۴۱ھ میں ختم ہوگئی جب کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوگئے۔''

(خلافت وملوکیت ص ۱۴۸)

نیز آپ فرما چکے ہیں کہ خلافت کے متعلق امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے یہ تھی کہ:

''پہلے بزور اقتدار پر قبضہ کرنا اور بعد میں دباؤ کے تحت بیعت لینا اس کے انعقاد کی جائز صورت نہیں ہے۔ صحیح خلافت وہ ہے جو اہل رائے لوگوں کے اجتماع اور مشورے سے قائم ہو۔'' (خلافت وملوکیت ص ۲۴۹)

علاوہ ازیں آپ نے ایک عنوان قائم کیا ہے:

''خلافت اور اس کے متعلق مسائل میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک'' (ص ۲۴۷)

اس عنوان کے تحت آپ نے امام صاحب کا جو مسلک بیان کیا ہے اس سے خلافت راشدہ کی خصوصیات، نیز خلافتِ راشدہ اور ملوکیت کے درمیان وجوہِ امتیاز کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں خلافت اور ملوکیت ایک نہیں۔ خلافت اصل ہے اور ملوکیت بدرجہ مجبوری کہ اگر بغاوت کی جائے تو اُمت کو خطرات عظیمہ برداشت کرنے پڑیں۔

ان وضاحتوں کے بعد بھی کسی حنفی المسلک (اور دیگر ائمہ کے متبعین بھی ان مسائل میں احناف سے متفق ہی ہیں) کے سامنے یہ سوالات رکھنا طول لاطائل اور خلط مبحث ہے۔ ممکن ہے کوئی سادہ لوح ان سوالات سے مرعوب ہو جائے اور بہت ممکن ہے آپ کا منشاء بھی یہی ہو کہ اس طرح مرعوب کر کے آپ ان الزامات کو صحیح تسلیم کرا لیں جو آپ نے خلیفہ مظلوم سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر لگائے ہیں۔

بہرحال ہر سنجیدہ شخص یہی فیصلہ کرے گا کہ یہ سوالات بے معنی ہیں۔ ہاں سوال ۵ یقیناً قابل غور ہے کیونکہ اس سوال کا جواب آپ یہ دیتے ہیں کہ ملوکیت اس لیے آئی کہ:

(الف) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پے در پے اپنے رشتہ داروں کو بڑے

بڑے اہم عہدے عطا کیے اور ان کے ساتھ دوسری رعایات ایسی کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدف اعتراض بن کر رہیں۔ (خلافت وملوکیت ص ۱۰۶)

(ب) اس کا نتیجہ آخر کار وہی ہوا۔ ان کے خلاف شورش برپا ہوئی اور صرف یہی نہیں کہ وہ خود شہید ہو گئے بلکہ قبائلیت کی دبی چنگاریاں پھر سلگ اُٹھیں جن کا شعلہ خلافتِ راشدہ کے نظام کو ہی پھونک کر رہا۔ (ایضاً ص ۱۰۰)

(ج) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس صوبے (شام) کی حکومت پر اتنی طویل مدت تک رکھے گئے کہ انہوں نے اپنی جڑیں پوری طرح جمالیں اور مرکز کے قابو میں نہ رہے بلکہ مرکز ان کے رحم وکرم پر منحصر ہو گیا۔ (ص ۱۱۵)

(د) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں چار سال سے دمشق کی ولایت پر مامور چلے آرہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایلیہ سے سرحد روم تک اور الجزیرہ سے ساحل بحر ابیض تک کا پورا علاقہ ان کی ولایت میں جمع کر کے اپنے پورے زمانہ خلافت (بارہ سال) میں ان کو اسی صوبہ پر برقرار رکھا۔ یہی چیز ہے جس کا خمیازہ آخر کار حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھگتنا پڑا۔ (ص ۱۱۵)

یہ بندہ ضعیف اپنی سابق طویل تحریر میں خود ان مؤرخین اور ان کتب تاریخ کے حوالوں سے جن کو مودودی صاحب مستند ترین مؤرخ اور مستند ترین کتب تاریخ مانتے ہیں، ثابت کر چکا ہے کہ یہ تمام الزامات غلط ہیں، خلیفہ شہید ومظلوم سیّدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ پر افترا ہیں بہتان ہیں۔

لیکن جبکہ یہ ایک ناقابل انکار واقعہ ہے کہ خلافت راشدہ ختم ہوئی اور اس کی جگہ ملوکیت آئی اور مودودی صاحب کی یہ بات بھی تسلیم ہے کہ صرف نفی کر دینے سے کام نہیں چل سکتا اس انقلاب کی کوئی مثبت وجہ بیان کرنی چاہیے تو ہمارے سامنے سب سے پہلے ایک تنقیح آئی ہے کہ وہ تغیرات جو قوموں اور جماعتوں کے حالات اور اطوار میں ماحول کے تقاضوں کے بموجب قدرتی طور پر ہوتے رہتے ہیں، ان تغیرات کے پیش نظر قدرتی اور طبعی بات یہ تھی کہ

خلافت راشدہ ختم ہوا اور ملوکیت اس کی جگہ لے یا ملوکیت کا خاتمہ ہمیشہ کے لیے ہو گیا تھا؟ ایسے حالات اور ایسے تغیر کا بھی امکان نہیں رہا تھا کہ ''ملوکیت'' آسکے۔ پھر کسی صاحب اقتدار کی غلط کاری نے اس چیز کو زندہ کر دیا۔ جو ہمیشہ کے لیے فنا کے گھاٹ اُتر چکی تھی۔

اس کا جواب ہم کسی صاحبِ منطق یا کسی مدعی فہم و دانش سے نہیں مانگتے بلکہ اس کے جواب کے لیے اس ذات اقدس کے اقوال کا مطالعہ کرتے ہیں جس نے اپنی شان یہ بیان فرمائی تھی **اوتیت علم الاولین والاخرین** یعنی جس کو ماضی اور مستقبل کے تمام ربانیین اور اہل اللہ کا علم عطا کر دیا گیا تھا (صلی اللہ علیہ وسلم) اور جس نے ان تمام فتنوں کو بیان کر دیا تھا جن میں اس کی اُمت مبتلا ہونے والی تھی۔

ان کے دو ارشاد ہمارے سامنے آتے ہیں جو کتب احادیث میں دائر و سائر ہیں اور جن کو تلقی بالقبول بھی حاصل ہے۔ گویا ان کی صحت پر اُمت کا اجماع و اتفاق ہو گیا ہے کہ یہ اقوال فی الواقع ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کسی وضع یا اختراع کو ان میں دخل نہیں ہیں۔

پہلا ارشاد:

خیر القرون قرنی. ثم الذین یلونهم. ثم الذین یلونهم (صحاح)

''سب سے بہتر دور، میرا دور ہے۔ پھر اس کے بعد کا، پھر اس کے بعد کا۔''

دوسرا ارشاد:

الخلافة فی امتی ثلاثون سنة ثم ملک بعد ذالک (ترمذی شریف ج۲ص۴۵)

''خلافت میری اُمت میں تیس سال رہے گی۔ پھر اس کے بعد ملوکیت ہو جائے گی۔''

ان ارشادوں میں دونوں سوالوں کا جواب موجود ہے کہ ملوکیت کا خاتمہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہوا۔ اس کا سلسلہ ماضی کی طرح مستقبل میں بھی رہے گا۔ صرف تیس سال کا دور اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس دور میں بھی خیر تنزل پذیر رہے گا اور تنزل کی رفتار یہ ہوگی کہ وہ رشد جو خلیفہ کو خلیفہ راشد قرار دے سکے تیس سال تک باقی رہے گا۔ تیس سال بعد یا سرے سے رشد ہی نہیں رہے گا یا رہے گا تو اس درجہ کا نہیں کہ صاحب اقتدار کو خلیفۂ راشد قرار دے سکے۔ بہت سے بہت اس درجہ کا رہے گا کہ صاحبِ اقتدار کو ملک راشد یا ملک عادل قرار دے دے۔

وجہ اور باعث:

یہ دونوں ارشاد صاحبِ ایمان کو عقیدہ کی حد تک مطمئن کرنے کے لیے کافی ہیں لیکن استدلالی اور منطقی شخص کی ''کیوں'' پھر بھی باقی رہتی ہے۔

مصر کے مشہور صاحبِ قلم ''الاستاد عباس محمود العقاد'' دورِ حاضر کے جلیل القدر فاضل ہیں۔ آپ نے نہایت فصیح و بلیغ عبارت میں جو جواب اس ''کیوں'' کا دیا ہے، ہم اس کا خلاصہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ اس جواب کی خوبی یہ ہے کہ مودودی صاحب کے جواب کی طرح خوارج یا روافض کے اختراع کردہ الزامات پر نہیں بلکہ یہ جواب آیات کتاب اللہ اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر مبنی ہے اور حقیقت کا آئینہ دار ہے۔

عقاد صاحب فرماتے ہیں:

یہ تبدیلی کہ خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت آئی، لوگ اس کو بھی انقلاب کہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ انقلاب نہیں بلکہ ایک عظیم ترین انقلاب کا ردِ عمل تھا۔

دعوت نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) نے قوم عرب کو روحانی کمالات اور اخلاق و کردار کی اس غیر معمولی بلندی پر پہنچا دیا تھا کہ نوع بشر میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اس بلندی پر باقی رہ سکے۔

سیّد الکونین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انفاس قدسیہ کا مہر تاباں اور شمس منیر جب تک درخشاں تھا، اُمت عربیہ کے اخلاق و کردار کی سطح بلندی کی سب سے اُونچی چوٹی پر قائم رہی اور جب یہ آفتاب اُفق سے اوجھل ہوا تو لامحالہ اس بلندی میں تنزل شروع ہو گیا (یہ انقلاب نہیں تھا بلکہ انقلاب کا ردِ عمل تھا)۔

دعوتِ نبویہ کی برکات میں سے ایک برکت یہ تھی کہ اُمت عربیہ کی اقتصادی بدحالی دُور ہوئی، رفاہیت اور خوشحالی میسر آئی (جو عموماً روحانی کمالات اور اخلاق و کردار کو روبتنزل کر دیتی ہے) لیکن اگر یہ رفاہیت اور خوشحالی نہ آتی اور اُمت عربیہ اسی طرح اقتصادی مشکلات میں مبتلاء و تباہ و شکستہ حال رہتی، تب بھی نفوس بشریہ میں طاقت نہیں تھی کہ وہ اس بلندی پر قائم رہ سکے۔ (العبقریۃ الاسلامیہ ص ۸۳۰، ۸۳۱)

عقاد صاحب کا منشاء سمجھنے کے لیے ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

ایک بے ڈول کچی عمارت ہے جس کے اُوپر کھجور کے پتوں کی چھت ہے۔ اس کو آپ چھپر بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ وہ ڈھلواں ہے۔ نیچے کنکریوں کا فرش ہے۔ کوئی آرائش یا آراستگی نہیں۔ یہاں تک کہ فرش پر پٹیاں بھی باقاعدہ نہیں ہیں۔ اسی سادہ اور بے ڈھنگی عمارت میں کنکریوں کے فرش پر ایک سن رسیدہ آدمی بیٹھا ہے۔ کپڑے اگرچہ میلے نہیں مگر شاندار بھی نہیں۔ کہیں سے پھٹے ہوئے ہیں کہیں سے پیوند لگے ہوئے ہیں۔ اسی لباس میں یہ شخص خداپرست اور بے لوث سچے، سادہ اور دلیر انسان کی تمکنت کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ چہرے سے خداپرستی کی علامتوں کے ساتھ خلق خدا سے استغناء اور بے نیازی کی وہ شان نمایاں ہے جو بڑے بڑے شاہنشاہوں اور بادشاہوں کو نصیب نہیں۔ آنکھوں میں خمار ہے، مگر خلق خدا کی ہمدردی، کمزوروں کی محبت اور مظلوموں کی مددگاری کا خما۔ اس کے برابر میں ایک دُرّہ رکھا ہوا ہے۔ آس پاس اسی طرح کے کچھ سادہ اور بے لوث انسان فداکاری کے جذبات کو اپنا شعار بنائے بیٹھے ہیں۔ ایک اور صاحب آتے ہیں، سادہ وضع مگر چہرے پر رعب داب اور بہادرانہ شان وشوکت۔ انداز اگرچہ شاہانہ نہیں ہے، مگر قبیلہ کے ایک ایسے شخص کا انداز ہے جو اپنے حلقہ میں بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صاحب ایک دُور دراز علاقے سے آرہے ہیں، عراق سے یا مصر سے یا شام سے۔ وہاں کی حکومت جو شاہانہ عظمت کے ساتھ اس علاقہ میں صدہا سال سے قائم تھی۔ بے شمار خزانوں کی مالک اور عظیم الشان قلعے اس کے زیر نگیں تھے، جس کو اپنی عظمت اور فوجوں کی شجاعت و بہادری پر ناز تھا۔ ان صاحب نے وہاں ایک انقلاب برپا کیا۔ ان جیسے مجاہدین کی جماعت ان کے زیر قیادت تھی۔ یہ اس کے سپہ سالار تھے۔ انہوں نے وہاں نہایت خوفناک اور بہادر حکومت کے مقابلہ پر ایسی شجاعت، جنگی مہارت اور ایسے حوصلہ کا مظاہرہ کیا جو ایک فاتح کر سکتا ہے۔ فاتح جو عظیم الشان فاتح ہوا انہوں نے صرف فوجوں کو شکست نہیں دی بلکہ اس علاقہ کے ان بڑے بڑے خاندانوں کو جو عظیم ترین تاریخی روایات کے حامل تھے، اس طرح سرنگوں کیا کہ ان کی ساری عظمتیں ختم ہو گئیں، رؤسا، فقیر اور امراء غلام، اور ان کی خواتین باندیاں بن گئیں۔

یہ باعظمت اور باشوکت فاتح اس گلیم پوش کے سامنے جو چھپر کے نیچے کنکریوں کے فرش پر بیٹھا ہے اس طرح حاضر ہوتا ہے جیسے ایک شاگرد اُستاد کے سامنے، وہ گلیم پوش اس فاتح اعظم سے سوالات کر رہا ہے۔ فوجی نظم ونسق کیا رہا؟ مالِ غنیمت کتنا حاصل ہوا؟ کس طرح تقسیم کیا گیا؟ مفتوحہ علاقہ کا کیا انتظام کیا گیا؟ کیا وہاں کے باشندوں سے کوئی معاہدہ کیا گیا؟ معاہدہ کی شرائط کیا ہیں؟ کیا ان پر صحیح صحیح عمل ہوا؟ یہ ثابت کرو کہ جو مطالبات ان پر ڈالے گئے وہ ان کی طاقت واستطاعت سے زائد نہیں ہیں۔ تم نے یہ کثیر رقم بیت المال کے لیے بھیج دی۔ تم نے اس کے وصول کرنے میں دباؤ سے کام لیا ہے؟

اس طرح کے سوالات ایک گلیم پوش درویش کر رہا ہے اور یہ فاتح جو افواج اسلام کا قائد اعظم ہے ہر ایک سوال کا صحیح صحیح جواب اس طرح دے رہا ہے کہ اس کے دل پر ہیبت طاری ہے کہ غلطی کی سزا درہ ہوگی۔

یہ گلیم پوش درویش کون ہے۔ یہ ہیں عمر بن الخطاب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ خلیفہ دوم، یہ قائد افواج فاتح فیلڈ مارشل جو میدانِ جہاد میں وہ کارنامے انجام دے چکے ہیں جن کی نظیر تاریخ میں نہیں کون ہیں؟ یہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں جن کو دنیا ہی میں جنت کی بشارت مل چکی ہے۔ جن کا شمار عشرہ مبشرہ میں سے ہوتا ہے۔ جو السابقین الاولین میں ہیں۔ جنہوں نے اپنی زندگی اسلام وایمان کے لیے تج دی ہے۔

مقامِ غور ہے۔ یہ گلیم پوش درویش کس بلند کردار کا مالک ہوگا کہ دُرّہ ہاتھ میں لیے ہوئے ان سے محاسبہ کر رہا ہے جو اخلاص وللّٰہیت، اللہ اور اس کے رسول کی محبت، ترقی اسلام کے لیے جانفشانی اور فداکاری میں وہ شان رکھتے ہیں کہ وحی الٰہی بھی اس کی مدح خواں ہے اور [۲۵] رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کی بشارت دے رہی ہے اور یہ اکابر دین، اساطین اُمت اس کے محاسبہ سے خائف ہیں اور اس کو اس احتساب کا مستحق سمجھتے ہیں، کیونکہ اس کا کردار حرف گیری سے بلند ہے۔ غور فرمائیے کیا بشر میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اس بلندی کو حاصل کر سکے۔

یہ شان ہے خلیفہ دوم کی جس کا دور اگرچہ خیر القرون ہے مگر تیسرے نمبر پر ہے۔ غور فرمائیے کیا شان ہوگی دورِ اوّل اور دورِ دوم کی۔ ظاہر ہے یہ سب طاقت بشری سے بالا صرف

عطا خداوندی اور انعامِ ربانی ہیں۔

خلیفۂ رابع سیّدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب آفتابِ نیم روز ہیں۔ باجماع اُمت آپ امام الاتقیاء ہیں۔ سلوک وطریقت کے سلسلے زیادہ تر آپ ہی سے وابستہ ہیں۔ آپ ان کے مرکز و منبع اور قطب ارشاد ہیں۔ آپ مدینۃ العلم کے باب ہیں۔ مدینۃ العلم (سیّدنا رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم) لانظیر ولاثانی ہے تو اس کا باب بھی لانظیر و لاثانی۔ لہٰذا بحیثیت خلیفہ آپ کا کردار بھی لانظیر ولاثانی۔ طاقت بشر سے بالا، صرف انعام خداوندی۔

باقی رہے خلیفۂ سوم ذی النورین سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جن کے متعلق مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ ''معیار مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے۔'' ان کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد یہ بھی ہے:

> واقعہ یہ ہے کہ اس ایک پہلو کو چھوڑ کر باقی جملہ پہلوؤں سے ان کا کردار بحیثیت خلیفہ مثالی تھا جس پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ (ص ۱۱۶)

یہ ایک پہلو تو مودودی صاحب کا مفروضہ ہے۔ جس کی غلطی وضاحت سے ثابت کی جا چکی ہے اور خود مودودی صاحب کی تحریر سے ثابت ہے کہ آپ کا یہ مثالی کردار بھی ایسا تھا جو خلافتِ راشدہ کو ملوکیت سے ممتاز کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ طاقت بشر سے بالا صرف تائید خداوندی ہے۔

مدینہ طیبہ پر بلوائیوں نے ہجوم کیا تو اہل مدینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی باغیانہ حرکتوں کو برداشت کرتے رہے۔ ان کی خاموشی کی وجہ بیان کرتے ہوئے مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود اس امر میں مانع تھے کہ ان کے اقتدار کو بچانے کے لیے مدینۃ الرسول میں مسلمان ایک دوسرے سے لڑیں۔ وہ تمام صوبوں سے فوجیں بلا کر محاصرین کی تکہ بوٹی کرا سکتے تھے۔ مگر انہوں نے اس سے پرہیز کیا۔ حضرت زید بن

ثابت رضی اللہ عنہما نے ان سے کہا کہ تمام انصار آپ کی حمایت میں لڑنے کو تیار ہیں، مگر انہوں نے فرمایا۔ ''اما القتال فلا''

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی انہوں نے کہا کہ میں لڑنے کو تیار نہیں ہوں۔

ان کے محل میں سات سو آدمی لڑنے مرنے کے لیے موجود تھے، مگر انہیں بھی وہ آخر وقت تک روکتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس انتہائی نازک موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک خلیفہ اور ایک بادشاہ کے فرق کو صاف نمایاں کر کے رکھ دیتا ہے۔

ان کی جگہ کوئی بادشاہ ہوتا تو اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے کوئی بازی کھیل جانے میں بھی اسے باک نہ ہوتا اس کی طرف سے اگر مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔ انصار و مہاجرین کا قتل عام ہو جاتا، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی توہین ہوتی اور مسجد نبوی بھی مسمار ہو جاتی تو وہ کوئی پروا نہ کرتا۔ مگر وہ خلیفہ راشد تھے انہوں نے سخت سے سخت لمحوں میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھا کہ خدا ترس فرمانروا اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے کہاں تک جا سکتا ہے اور کس حد پر پہنچ کر اسے رُک جانا چاہیے۔ وہ اپنی جان دینے کو اس سے ہلکی چیز سمجھتے تھے کہ ان کی بدولت وہ حرمتیں پامال ہوں جو ایک مسلمان کو ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہونی چاہییں۔ (خلافت وملوکیت ص ۱۲۰)

مودودی صاحب دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

''سب سے زیادہ تنقیدوں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سابقہ پیش آیا اور انہوں نے کبھی کسی کا منہ زبردستی بند کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ اعتراضات اور تنقیدوں کے جواب میں برسرِ عام اپنی صفائی پیش کی۔'' (خلافت وملوکیت ص ۱۰۱)

تنقید پر ضبط و تحمل کی عجیب و غریب شان ملاحظہ ہو:

مخالفین نے جو الزامات تراشے تھے سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مدینہ طیبہ کے ایک اجتماع عام میں جس میں مخالف و موافق سب تھے ہر ایک کا واضح جواب دیا۔ ان جوابات کی تصدیق خود حاضرین سے کرائی اور حاضرین کو یقین ہو گیا کہ یہ تمام الزامات باغیانہ سازش ہیں تو اب عام مسلمانوں کا اصرار تھا کہ ان کو تہ تیغ کیا جائے اور ان کے خلاف سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا پختہ فیصلہ عفو و درگزر کا تھا۔ وہ مضبوطی سے اسی فیصلہ پر قائم رہے۔ مؤرخ طبری کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔ **وابی المسلمون الا قتلهم. وابی الا ترکهم** مسلمان ان کو قتل کر دینے کے سوا اور کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ درگزر کر دینے کے سوا اور کسی بات کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ (طبری ص ۱۰۳ ج ۵)

بہرحال سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا وہ مثالی کردار جس کی ایک جھلک یہ ضبط و تحمل، یہ عفو و درگزر اور تسلیم و رضا ہے۔ کیا کوئی ظرف ہے جو تائید خداوندی کے بغیر اس کی مثال پیش کر سکے۔ عقاد صاحب اس کو غیر معمولی رفعت و بلندی فرما رہے ہیں جس کے زریں جھالر تک قدرت انسانی کی انگلیاں نہیں پہنچ سکتیں۔

ابن خلدون کا جواب:

مؤرخ ابن خلدون نے اسی مفہوم [۲۶] کو اس انداز میں ادا کیا ہے کہ تاریخ کا ایک فلسفہ بھی سامنے آ جاتا ہے۔

آپ فطرت انسان کو سامنے رکھ کر بحث کرتے ہیں کہ یہ نظام جس کو ملک یا حکومت کہتے ہیں اس کا تعلق انسان سے عارضی ہے یا مستقل، اس کا جواب خود اس کی ضرورت پر موقوف ہے کہ انسان کو حکومت و مملکت یا ملک کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔ علامہ توجہ دلاتے ہیں کہ انسان کی فطرت اُنس ہے۔ تنہائی انسان کے لیے موت ہے اور مل کر رہنا اس کی زندگی۔ اُنس کی طرح ارتقاء یعنی ترقی کرنا اور آگے بڑھنا بھی اس کی فطرت کے جوہر ہیں۔ انہیں اوصاف اور خصلتوں پر قدرتی طور سے عمل ہوا جس سے مدنیت کی بنیاد پڑی۔ مدنیت یعنی میل ملاپ اور امداد باہمی والی زندگی حقوق کو جنم دیتی ہے۔ جب حقوق کا دامن پھیلتا ہے تو فیصلہ کرنے والی

طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی ہے حکم، حکومت۔ اسی کو ملک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ قابل لعنت نہیں بلکہ اہم ترین خدمت ہے جس کو میسر آ جائے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا انعام واحسان ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اسی انعام کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ فرماتے ہیں:

رب قد اٰتیتنی من الملک (سورہ ۱۲ یوسف، آیت ۱۰۱)

سیّدنا حضرت سلیمان علیہ السلام دعا فرماتے ہیں کہ یہ نعمت ان کو ایسی بھرپور عطاء ہو جس کی نظیر دنیا میں نہ ہو۔

رب هب لی ملکا لا ینبغی لاحدٍ من بعدی. (سورہ ص)

''اے رب مجھے ایسا ملک عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو وہ میسر نہ آئے۔''

لیکن ظاہر ہے ایک فرد تنہا اس نعمت عظمیٰ کو سر کا تاج بنا کر اس کے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ اس کو مددگاروں کی ضرورت ہوتی ہے اور مددگار بھی ایسے کہ دانا اور جان نثار ہوں۔ مددگاروں کی ایسی حمایت جو جذبہ فدائیت رکھتی ہو اس کو عصبیت کہا جاتا ہے۔

یہ عصبیت اگر اعلیٰ مقاصد کے لیے ہے تو بہت مبارک ومقدس ہے لیکن اپنی برادری، اپنے قبیلے، اپنے رنگ ونسل کی برتری، فراوانیٔ دولت جیسے مقاصد اس عصبیت کے محرک ہوں تو یہ عصبیت ایک لعنت ہوتی ہے اور اس کی بنا پر جو اقتدار حاصل ہو یا جو حکومت قائم ہو وہ سب جبر وقہر ہوتا ہے۔ لسانِ رسالت نے اس کو ''ملک عضوض'' کٹکھنی حکومت فرمایا ہے۔

مودودی صاحب کی نظر ان حقائق پر نہیں ہے، وہ آج کل کی رو میں بہہ رہے ہیں کہ ملوکیت لعنت ہے۔ ہم یہاں اس بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتے۔ ہمیں یہ واضح کرنا ہے کہ ملک اور حکومت نوع انسان کی فطرت کا تقاضا ہے جو بقائے انسانیت کے ساتھ باقی رہنے والا ہے اور جس طرح مدنیت لازمہ ٔ فطرت ہے یہ بھی لازمہ ٔ فطرت ہے لیکن ایک دوسرا باب ہے مکارم اخلاق اور ان کی تکمیل کا یا روحانیت اور اس کے عروج کا۔

یہ کام اربابِ تاریخ یا اہل سیاست کا نہیں ہے کہ حقیقت انسان اور اس کے مقاصد اور کمالات پر بحث کرے، یہ کام ان دور بینان بارگاہ الست کا ہے جن کی بعثت اس لیے ہوتی ہے

کہ انسان کو اس کی حقیقت اور مقصد پیدائش سے آگاہ کریں، انسان کا انجام کیا ہوگا، وہ ایک لافانی حقیقت ہے جو اس وقت ختم ہو جائے گی جب اس کی جان اس کے قالب سے جدا ہوگی یا وہ ایک لازوال حقیقت ہے جس کا مستقبل غیر محدود ہے، وہ مستقبل کس طرح کامیاب اور خوشگوار ہوگا جو ہادیانِ برحق، رہنمایان حقیقت ان سوالات کا جواب دے سکتے ہیں۔ وہی بتا سکتے ہیں کہ سیاست کا کوئی رابطہ اخلاق، روحانیت اور انسان کے دائمی مستقبل کی کامیابی، ناکامی سے ہے یا نہیں۔

مذہب کے ماننے والے مانتے ہیں کہ جس طرح تمدن نے ترقی کی، اخلاق اور روحانیت نے بھی ترقی کی ہے، مادیات کی ترقی ابھی تک آخری نقطہ تک نہیں پہنچ سکی، لیکن فضلِ خداوندی نے یہ گوارا نہ کیا کہ انسان روحانی کمال و ترقی کے میدان میں ناقص رہے اور وہ درجہ حاصل نہ کر سکے جو مقصد پیدائش کے لحاظ سے سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانیت اور اخلاق سے متعلق جو سب سے اعلیٰ تعلیم تھی وہ خاتم الانبیاء علیہ السلام کے ذریعہ سے نوع انسان کو عطا کر دی گئی اور اعلان کر دیا گیا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ

سیّد الانبیاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

بعثت من خير قرون بني آدم قرناً فقرناً حتى كنت من القرن الذى كنت منه. (بخاری شریف)

''ابنائے آدم کے تمام ادوار میں سے سب سے بہتر دور میں میری بعثت ہوئی ہے۔ خیر (روحانی کمالات اور مکارم اخلاق) ترقی پذیر رہے۔ اگلا دور پچھلے دور سے بہتر ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ میں اس دور میں مبعوث ہوا جس کا میں ہوں''۔

ہماری تحریر بالا اسی ارشاد کی روشنی میں ہے۔

ع من بندہ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

بہر حال علامہ ابن خلدون نے دقیق النظر محقق کی حیثیت سے یہ واضح کرتے ہوئے کہ ملک اور حکومت فطرتِ انسان کا تقاضا ہیں۔ یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ خیر بھی ہے اور شر بھی۔ ان کے

خیر کا نقطہ عروج وہ ہے جس کو خلافت راشدہ کہا جاتا ہے اور جس طرح نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عروج کے آخری نقطہ پر پہنچی اور اب اس کا اعادہ ممکن نہیں۔ اسی طرح نظام سیاسی بھی آپ کے دور میں خیر کے بلند ترین درجہ پر پہنچا۔ پھر وہ دور جس کو خلافتِ راشدہ کہا جاتا ہے پرتو تھا اسی عروج یافتہ دور کا۔ سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے پر جس طرح دورِ نبوت کا اعادہ ممکن نہیں اسی طرح اس کے پرتو یعنی خلافت راشدہ کا اعادہ ممکن نہیں ہے۔

یہ پرتو یعنی خلافتِ راشدہ کا دورِ مقدس ایک مثال ہے نوع انسان کے سبق کے لیے۔

آپ سورہ فتح کی آخری آیتیں مطالعہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ یہ دورِ مسعود صرف آنے والی نسلوں کے لیے نہیں بلکہ اُمم سابقہ کے لیے بھی بطور مثال پیش کیا گیا ہے اور تمثیل کے لیے مختلف تعبیریں [۲۷] اختیار کی گئی ہیں۔

خلاصۂ بحث یہ کہ جس طرح دورِ نبوت ختم ہونے والا تھا اسی طرح خلافتِ راشدہ بھی ایک محدود المیعاد سعادت تھی جس کی مدت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس سال بیان فرما دی۔ (ترمذی شریف ج ۲ ص ۴۵)

آیت استخلاف میں اس سعادت کا مقصد یہ بیان فرمایا گیا ہے۔

ولیمکنن دینھم الذی ارتضٰی لھم [۲۸]

''تا کہ جما دے ان کے دین کو جو پسند کیا ہے ان کے لیے''

واقفِ اسرار شریعت فلیسوفِ اسلام حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

> بیان علت غائت استخلاف ست۔ کما قال من قائل ذلک مثلھم فی التوراۃ ومثلھم فی الانجیل کزرعٍ اخرج شطئہ۔ گویا می فرماید۔ استخلاف برائے آں مطلوب شد کہ دین مرتضٰی ممکن شود۔ واعلاء کلمۃ اللہ بظہور رسد وظہور دین حق بر جمیع ادیان محقق گردد۔ (ازالۃ الخفاء ص ۲۱)
>
> ''اس آیت میں خلافتِ راشدہ کی علت غایۃ اور اس کے غرض ومقصد کا بیان ہے جیسا کہ آیت مثلھم فی التوراۃ میں اس کی طرف اشارہ

ہے۔حاصل یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا سلسلہ اس لیے مطلوب اور مقصود
تھا کہ وہ دین جو اس وقت کے لیے پسند کیا گیا ہے اس میں پوری طرح
جماؤ اور استقلال واستحکام ہو جائے اور کلمۃ اللہ کی بلندی ظاہر اور نمایاں
چیز بن جائے اور باقی تمام دینوں پر دین حق کا غلبہ متحقق ہو جائے۔
اسی آیت کی تفسیر میں حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔
تفسیر این آیت در حدیث آمده **الخلافة بعدی ثلاثون سنة**
(واللہ اعلم بالصواب)

اسباب خاتمہ:

اس تمام تفصیل وتوضیح کے بعد بھی شاید مودودی صاحب کا کوئی مقلد جامد یہ سوال کر بیٹھے کہ اس عالم اسباب میں ہر ایک واقعہ اور حادثہ کا کوئی سبب ہوا کرتا ہے۔پس خلافت راشدہ اگرچہ ازل سے محدود المیعاد تھی، تاہم عالم ظاہر میں اس کے خاتمہ کا سبب ہوگا۔مودودی صاحب نے اسی سبب کو بیان فرمایا ہے۔جواباً ہمیں تسلیم ہے کہ اس نعمت عظمیٰ کے خاتمہ کا بھی کوئی سبب ہونا چاہیے۔مگر ہم یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ خود نعمت عظمیٰ اپنے خاتمہ کا سبب ہوئی۔

خلفائے راشدین خود نعمت ورنہ حاملین نعمت ہیں۔پس سبب خاتمہ ان کا کردار نہیں ہو سکتا۔اُن کے کردار میں سبب خاتمہ کو تلاش کرنا ایسا ہی ہے کہ آفتاب نیمروز کی کرنوں میں آپ شب تاریک کی جھلکیاں تلاش کریں۔بہتر ہو کہ آپ سببِ خاتمہ کی تحقیق اس سے کریں جس نے نعمت اور زوالِ نعمت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔

یہ کتاب اللہ ہے۔قرآن حکیم تبیاناً لکل شیٍٔ اس کا واضح اعلان ہے۔

ذلک بان اللہ لم یک مغیرا نعمۃ انعمھا علی قوم حتی یغیروا ما بانفسھم (سورہ انفال ۸ آیت ۵۳)

''اللہ تعالیٰ جو نعمت کسی قوم کو عطا فرما دیتا ہے اس میں تبدیلی نہیں کرتا۔
یہاں تک کہ وہ قوم خود اپنے آپ کو بدل لیتی ہے۔''

خلافت راشدہ جیسی نعمت عظمیٰ کے زوال کا سبب مودودی صاحب خلیفہ سوم کے کردار

میں تلاش کر رہے ہیں اور قرآن حکیم کی ہدایت یہ ہے کہ خلیفہ اور امام میں نہیں، بلکہ جس قوم کے وہ خلیفہ اور امام ہیں، ان کی حالت دیکھو ان میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی؟ مودودی صاحب موضوع روایات کے پائے چوبین سے جست لگا کر ایک سبب تلاش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''اس تغیر کا آغاز ٹھیک اسی مقام سے ہوا جہاں سے اس کے رونما ہونے کا حضرت عمر کو اندیشہ تھا کہ ان کے جانشین اپنے قبیلے اور اپنے اقربا کے معاملہ میں اس پالیسی کو نہ بدل دیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے چلی آ رہی تھی'' (ص ۱۰۵ و ص ۱۰۶)

سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اندیشہ اور جانشینوں پر اقربا پروری کا الزام تو موضوع روایات کے جنگل کی گھاس ہے۔ جس کی طرف التفات کرنا قوت التفات کو ضائع کرنا ہے۔ لیکن اگر کسی درجہ صحیح مان بھی لیا جائے تو احقر عرض کرے گا کہ یہ بہت بعد کی بات ہے۔ یہ دور عثمانی کی بات ہے۔ تغیر کا آغاز اس سے کئی سال پہلے ہو چکا ہے۔ واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ تغیر کا آغاز اس وقت ہوا جب تقویٰ کے مقابلہ میں طاقت کو ترجیح دی گئی اور زیادہ متقی کے بجائے چاق و چوبند اور ماہر سیاسیات کو امیر اور والی منتخب کیا گیا۔

کوفہ کے حالات تفصیل سے پہلے لکھے جا چکے ہیں:

یاد کیجیے۔ اہل کوفہ نے کس طرح سیدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے خلاف بے بنیاد شکایتوں کا طوفان برپا کیا۔ حتیٰ کہ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ان کو واپس بلا لیا۔ پھر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا تو اہل کوفہ نے کہہ دیا لا نریدہ (ہم ان کو نہیں چاہتے) سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا نام سامنے آیا تو اہل کوفہ نے کہہ دیا لا یحسن السیاسۃ سیاست (ڈپلومیسی) نہیں جانتے۔

اب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پریشان تھے۔

کیف اهل الکوفة مائة الف لا یرضون عن امیر و لا یرضی عنهم امیر

''کیا کیا جائے یہ اہل کوفہ ایک لاکھ ہیں نہ وہ کسی سے راضی اور نہ کوئی امیر ان سے راضی''

ان تینوں بزرگوں کے نام تقویٰ کی بنیاد پر سامنے آئے تھے۔ اہل کوفہ نے سب کو مسترد کر دیا۔ جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے قوی وشدید، چاق وچوبند اور ماہر سیاست ہونے کی بنا پر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا تو اہل کوفہ کی گردنیں جھک گئیں۔ (البدایہ والنہایہ ص ۱۲۵ و ۱۲۶ ج ۷)

اہل بصرہ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے حق میں گستاخی کی، اس کی تفصیل بھی پہلے گزر چکی ہے۔ ان بدبختوں کا اصرار تھا کہ کسی کو امیر بنا دو ہمیں منظور ہے۔ یہ اشعری بوڑھا ہمیں منظور نہیں۔ ہر شخص اس کا بدل ہو سکتا ہے۔ ہم اس اشعری کو برداشت نہیں کر سکتے۔ (تاریخ طبری ص ۵۵ ج ۵)

پہلے گزر چکا ہے کہ فرد واحد، ملک اور حکم یعنی اقتدار اعلیٰ کے مطالبات پورے نہیں کر سکتا۔ اس کو ایسے اعوان اور مددگاروں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس اقتدار اعلیٰ کے بقاء کے لیے جذبہ فدائیت اپنے اندر رکھتے ہوں۔ اسی کو عصبیت کہا جاتا ہے۔ یہ عصبیت اگر اعلیٰ مقاصد کے لیے ہو تو نہایت مقدس عصبیت ہے۔

خلافت راشدہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے اعوان و انصار میں یہ عصبیت "تقوے" کے لیے ہوتی ہے۔

قرآن حکیم نے یہ اصول مقرر فرما دیا۔

"ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم"

سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب اسی اصول کی بنیاد پر ہوا۔ اس دور کے تمام رہنما وہ تھے کہ اتقیٰ کو صاحب اقتدار بنانے کے لیے اپنے اندر جذبہ فدائیت رکھتے تھے۔

وہی عمر بن الخطاب ہیں۔ ان کی تقریر سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوتی ہے جس میں تقویٰ کے لحاظ سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی برتری بیان فرماتے ہیں کہ:

ارشاد ربانی ہے:

ثانی اثنین. اذھما فی الغار. اذ یقول لصاحبہ لا تحزن. ان اللہ معنا.

اس آیت سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تین فضیلتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) نازک ترین مقام پر سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق رہے۔

(۲) آپ کے لیے نص قرآنی میں ''صاحب'' کا لقب۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی معیت کی تصریح۔

آپ یہ آیت پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کون ہے جو ان فضائل کا حامل ہو۔ جملہ حاضرین کی گردنیں تسلیم کے لیے جھک جاتی ہیں اور ساتھ ہی بیعت کے لیے ہاتھ آگے بڑھ جاتے ہیں۔

لیکن یہی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اس موقع پر اسی قرآنی اصول پر کارفرما ہونا چاہتے ہیں۔ سیّدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا نام پیش فرماتے ہیں تو کہا جاتا ہے۔ لا نریدہ (ہم ان کو نہیں چاہتے) سیّدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی سامنے لاتے ہیں تو کہا جاتا ہے (لایحسن السیاسة) وہ ڈپلومیسی نہیں جانتے۔

''ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا''

تعجب ہے مودودی صاحب خوردبین لگا کر کردار خلیفہ میں تغیر تلاش کرتے ہیں اور یہ کھلا ہوا تغیر ان کی نظر میں نہیں آتا، کیونکہ اس تغیر کے ذمہ دار وہ ہیں جن سے آپ کو خاص ہمدردی ہے۔ آپ نہیں چاہتے ہیں کہ سامنے آئیں۔ مگر مودودی صاحب کے اخفاء سے کام نہیں چلا۔ کارپردازان قضا و قدر کا کارخانہ برابر کارفرما رہتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید (سورہ ابراہیم ۱۴ آیت ۷)

''اگر تم احسان شناس و شکرگزار رہے تو میں تم کو بڑھاؤں گا اور اگر تم نے ناسپاسی اور ناشکری کی تو یاد رکھو میرا عذاب سخت ہوتا ہے۔''

اہل کوفہ کے مذکورہ بالا واقعہ سے کچھ دنوں بعد سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو جامِ شہادت نوش کرادیا گیا۔ یہ تغیر کا پہلا نتیجہ تھا جو اس اُمت کے سامنے آیا۔ جس کے رجالِ خیر یعنی دربارِ رسالت کے تربیت یافتگان دن بدن کم ہو رہے تھے اور ان کا اضافہ ہو رہا تھا جن کو لسان رسالت نے احداث الاسنان و سفھاء الاحلام فرمایا تھا۔

غور فرمایئے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی شخصیت جس کی نظیر نوع انسان کی پوری تاریخ

میں نہیں ہے کتنی بڑی نعمت اور کتنی بڑی سعادت ہے پوری اُمت کے لیے پھر اس کی شہادت یعنی اس بے نظیر نعمت عظمیٰ کا سلب کیا جانا۔ کیا وہ محرومی نہیں ہے جس کو عذاب کہا جا سکے۔

ولئن کفرتم ان عذابی لشدید

آیت استخلاف کے چند کلموں کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے۔

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور صالح عمل کرتے رہے۔ ان سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان کو خلیفہ اور حاکم بنائے گا ملک میں، جیسے خلیفہ بنایا ان سے پہلے لوگوں کو اور جما دے گا ان کے لیے ان کا دین، جو پسند کیا ہے ان کے لیے اور لامحالہ ان کو خوف اور ڈر کے بدلے امن عطا فرمائے گا (شرط یہ ہے کہ) وہ میری عبادت کرتے رہیں۔ اس میں کسی کو شریک نہ گردانیں۔ اس کے بعد جو ناسپاسی کریں گے تو وہی ہیں فاسق۔" (سورہ النور۲۴ آیت ۵۵)

سیّدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب انہیں ناسپاس شورہ پشتوں کو فاسق قرار دے رہے ہیں، جو اس آیت کا مصداق ہیں۔

فرماتے ہیں یعنی چنانکہ قاتلان حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کردند (فتح الرحمٰن)

قبائلیت کی چنگاریاں:

حیرت ہوتی ہے کہ تفہیم القرآن کا لکھنے والا غلط اور موضوع روایتوں پر اعتماد کرتا ہے اور لکھتا ہے:

"بدقسمتی سے خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس معاملہ کے معیار مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے۔ اس کا نتیجہ آخر کار وہی ہوا جس کا اندیشہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تھا۔ ان کے خلاف شورش برپا ہوئی الخ" (ص ۱۰۰)

آپ قبائلیت کی دبی ہوئی چنگاریوں کے سلگنے کا سبب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی صلہ رحمی کو قرار دیتے ہیں اور آپ کی نظر قرآن حکیم پر نہیں جاتی۔

سورۂ اقرأ نبوت کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی۔ اس نے اس اُمت کے نشوونما کے آغاز ہی میں آگاہ کر دیا تھا۔

کلا ان الانسان لیطغیٰ ○ ان راہ استغنیٰ ○

"کوئی نہیں انسان سرچڑھتا ہے، اس لیے کہ دیکھے اپنے آپ کو محفوظ"[۲۹]

وحی الٰہی کے اس فقرہ میں جس طرح اہل بصیرت کے لیے بشارت تھی کہ ان کا فقر غنا سے بدلے گا، فاقہ مستی کی بجائے تو انگری کا ظہور ہوگا۔ اسی طرح اس میں تنبیہ بھی تھی کہ فطرت "غنا" یہ ہے کہ وہ طغیان وغیرہ پیدا کرے اور انسان کو اپنے آپے سے باہر کر دے۔

یہ مضمون پہلے بھی تفصیل سے گزر چکا ہے کہ صحابہ کرام جو وحی الٰہی کے رموز شناس تھے، ان کے ذہنوں میں سوال پیدا ہوا۔ "او یاتی الخیر بالشر" (کیا ممکن ہے کہ خیر محرک شر بنے) صحاح کی مستند[۳۰] ترین روایت ہے کہ اس کا جواب دینے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تامل ہوا اور ایسی تشویش لاحق ہوئی کہ جبین مبارک پر پسینہ کے دُرناسفتہ جھلکنے لگے۔ آپ نے پسینہ خشک فرما کر جواب دیا۔ آپ کے پرحکمت جواب کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ دولت و تو انگری کو خیر محض سمجھنا ہی صحیح نہیں ہے۔ اس کی فطرت ہے کہ عظمت انسانیت اور شرف روحانیت کے لیے سمِ قاتل[۳۱] اور زہر ہلاہل کا کام کرتی ہے۔ اِلا یہ کہ احتیاط اور تقویٰ سے کام لیا جائے۔ زیادہ کی ہوس نہ ہو اور جو حاصل ہو اس کا استعمال صحیح ہو۔

کتاب اللہ کا اشارہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی اپنی پوری صداقت کے ساتھ ظہور پذیر ہوا۔ دولت آئی صرف وہ جماعت اس کے مضر اثرات سے محفوظ رہی[۳۲] جو سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کیمیا اثر کے فیض سے کندن بن چکی تھی۔ (جس کی کچھ تفصیل انہی اوراق میں پہلے گزر چکی ہے) اور جن میں یہ پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی وہ کتاب اللہ کے اس ارشاد کا تماشہ گاہ بن گئی۔

کلا ان الانسان لیطغیٰ ان راہ استغنیٰ

"کوئی نہیں۔ انسان سرچڑھتا ہے اس پر کہ دیکھے آپ کو دولتمند"

علامہ ابن خلدون کے ایک فقرہ[۳۳] کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

انسانی جماعتوں (اُمتوں) میں سے کسی بھی اُمت کی حالت فاقہ مستی میں قبیلہ مضر سے بدتر نہیں تھی، کیونکہ اس کی سکونت حجاز کے اس علاقہ میں تھی جہاں نہ کاشت کا سلسلہ تھا اور نہ وہاں مویشی تھے۔ شاداب علاقوں تک ان کی پہنچ نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ ان پر قبیلہ ربیعہ اور اہل یمن کا قبضہ تھا۔ قبیلہ مضر کے لوگ بچھو اور کیڑے مکوڑے کھا جاتے تھے۔ اُونٹ کے بالوں کو بھگو کے رکھتے پھر خون میں ان کو گھوٹتے اور کھا لیتے تھے۔ اس کو وہ **علہز** کہا کرتے تھے اور یہ ان کا قابل فخر کھانا ہوتا تھا۔

دعوتِ اسلام نے جب ان میں انسانیت کی زندگی پیدا کی اور ان لوگوں نے غزوات میں حصہ لیا تو پھر دولت کی یہ فراوانی ہوئی کہ ''ایک ایک غازی کا حصہ ایک جہاد میں سونے کے تیس تیس ہزار دینار یا اس سے بھی زیادہ ہوتا تھا۔''

اب ان قبائل پر نظر ڈالیے جو کوفہ اور بصرہ جیسے شہروں میں آباد ہوئے جنہوں نے اپنے امراء اور کار پردازانِ حکومت کے خلاف شکایتوں کے دفتر تیار کیے اور ان کو پھیلایا۔ جن کے لیے نہ صرف قریش کا اقتدار ناقابل برداشت ہو گیا بلکہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عظمت بھی ان کو اُکھرنے لگی۔ چنانچہ ان کے حق میں زبان طعن بے لگام ہوگئی۔ یہ قبائل اسی قبیلہ مضر اور اس کے ہم دوش قبیلہ ربیعہ کی شاخیں ہیں۔ دولت کی فراوانی نے ان میں یہ طغیانی پیدا کی۔ جس کو عبداللہ بن سبا کی پارٹی نے یہاں تک ہوا دی کہ شہادت خلیفہ مظلوم کی نوبت آئی۔

ملوکیت کی بنیاد:

خلیفہ مظلوم کی شہادت کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ جب ناقدر شناس شورہ پشتوں کے گروہ نظامِ مملکت پر چھا چکے ہیں تو آیا آئندہ اس نظام میں وہی خلافت راشدہ کی احتیاط اور اس کا وہی رحم و کرم باقی رکھا جائے جو سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا اصول رہا تھا کہ جان عزیز قربان کر دی اور یہ گوارا نہ کیا کہ کسی کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرے۔

''اہل مدینہ اصرار کر رہے ہیں کہ ان بلوائیوں کو تہ تیغ کیا جائے۔'' (طبری ص۱۰۳ ج۵)

خصوصاً ذی مروہ، ذی خشب اور الاعوص میں قیام کرنے والوں کو جن کو لسانِ رسالت

(علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) ملعون قرار دے چکی ہے۔ (طبری ص ۱۰۴، ۱۰۵ ج ۵)

مگر خلیفۂ مظلوم کا انتہائی تقویٰ اجازت نہیں دے رہا کہ جہاں تک ان کا تعلق ہے قتل تو در کنار کسی کو ادنیٰ سزا بھی دی جائے۔

سوال یہ ہوا کہ آیا خلافت راشدہ اور اس کی یہ احتیاط باقی رکھی جائے یا اس احتیاط سے گزر کر سیاست کو بھی کام میں لایا جائے۔ جس میں بسا اوقات شبہ کو واقعہ اور حقیقت کی حیثیت دے دی جاتی ہے اور اس پر وہی کارروائی کی جاتی ہے جو کسی واقعہ کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے۔ بلاشبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی مشاجرت کا سبب مطالبہ قصاص تھا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس مشاجرت کی تہ میں یہ نظریاتی اختلاف بھی تھا:

خلیفۂ رابع امام الاتقیاء سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نظام مملکت کو اسی تقویٰ اور احتیاط پر باقی رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کی خلافت بلاشبہ اسی احتیاط اور تقویٰ پر مبنی تھی اور آپ کی خلافت بلاشبہ خلافتِ راشدہ تھی، لیکن سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور آپ کے رفقاء کا نظریہ پوری دیانت اور ایمانداری کے ساتھ یہ تھا کہ اندازِ ملوکیت اختیار کیا جائے۔

بقول علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ اس نظریے کو کامیاب بنانے کے لیے بھی جماعت کی ضرورت تھی۔ تقویٰ کی بنیاد پر اقتدار اعلیٰ کے لیے قربان ہونے والے ختم ہو چکے تھے۔ قبائلیت کی چنگاریاں بھڑک چکی تھیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاست نے اسی عصبیت سے کام لیا۔ علامہ فرماتے ہیں:

- انما اختلف اجتهادهم فی الحق وسفه کل واحد منهم نظر صاحبه باجتهاده فی الحق فاقتتلوا وان کان المصیب علیا فلم یکن معاویة قائما فیها بقصد الباطل انما قصد الحق واخطأ والکل کانوا فی مقاصد هم علی حق. (مقدمہ ابن خلدون ص ۲۰۵)

"حق کی تحقیق و تفتیش میں ان کا اجتہاد مختلف ہوگیا۔ ہر ایک نے اپنے مقابل کی رائے کو غلط اور نادانی قرار دیا۔ اسی پر آپس میں نبرد آزما ہو

گئے۔ اگر چہ مصیب سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی باطل کے علمبردار بن کر کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ ان کا مقصد اور نصب العین بھی حق ہی تھا۔ مگر غلطی کر گئے۔ واقعہ یہی ہے کہ سب حضرات اپنے مقاصد میں حق پر ہی تھے۔''

مودودی صاحب خلیفۂ مظلوم سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ملزم و مجرم قرار دینے کے لیے خوردبین استعمال کرتے ہیں، موضوع روایتوں کا سہارا لیتے ہیں، بظاہر آپ کا تاثر یہ ہے کہ ملوکیت چور دروازے سے آئی۔ پھر ان وہمی مقدمات کی بنیاد پر جو افسانہ تراشتے ہیں اس کو تحقیق قرار دے کر احسان فرماتے ہیں کہ مسلمان طلبہ کو مغربی مصنفین کے اثرات سے محفوظ کر لیا۔ جو ان واقعات کو نہایت غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو کچھ وہ فرما رہے ہیں وہ کوئی نا معلوم تاریخ نہیں جو کہیں چھپی ہوئی پڑی تھی اور وہ اس کو یکایک منظرِ عام پر لے آئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ (ص ۲۹۹،۳۰۰)

لیکن حضرت علامہ سے کوئی دریافت کرے کہ تاریخ کے کھلے ہوئے واقعات پر پردہ ڈال کر رطب و یابس کے طومار کو تحقیق سمجھنا کیا کوئی دیانتداری اور دانش مندی ہے۔ کیا اس طرح ملت یا تاریخ ملت کی کوئی خدمت انجام پا سکتی ہے اور کیا اس طرح مسلم طلبہ مؤرخین مغرب کے اثر سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ بالخصوص جبکہ مؤرخین مغرب کے منشاء کو آپ پورا کر رہے ہیں۔

تصنع اور تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ بات کھلی ہوئی واضح ہے۔ ملوکیت چور دروازے سے نہیں آئی وہ کھلے بندوں آئی۔ سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسی کو اختیار کیا۔ آپ نے کھلے بندوں ملوکیت قائم کی۔ آپ کی ملوکیت خلافت راشدہ نہیں تھی مگر اسی دورِ ملوکیت میں اُمت کا اندرونی انتشار ختم ہوا۔ تلواریں نیام میں داخل ہوئیں اور باہمی اتحاد و اتفاق کے پرچم لہرائے اور اُمت نے ہر شعبہ میں ترقی کی طرف قدم بڑھایا۔ اسی لیے آپ کی ملوکیت کو ملوکیت راشدہ کہا گیا۔ فرضی اللہ عنہ۔

بلاشبہ آپ نے اس ملک راشد کی شخصیت کو مجروح کرنے میں کوتاہی نہیں کی اور اہل علم آپ کے عمل کا تسلی بخش جواب دے رہے ہیں۔

شکر الله سعینا وسعیهم واٰخر دعوانا ان الحمد لله رب العٰلمین وصلی الله علٰی خیر خلقه محمد واله واصحابه اجمعین.

باقی سوالات کے جوابات

حافظ محمد افضل صاحب کے چار سوالات تھے جو ابتداء میں درج ہیں۔ ان میں سے پہلے سوال کا جواب یہ پوری کتاب ہے اور اس کتاب کے ملاحظہ کے بعد سوال نمبر ۲ و ۳ کا مختصر جواب یہ ہے:

"قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

باقی سوال نمبر ۴ کے بارے میں یہ ہے کہ جو حضرات مودودی صاحب سے تعاون کر رہے ہیں تو کن مقاصد کے لیے تعاون کر رہے ہیں اور کن کے مقابلہ میں کر رہے ہیں۔ تعاون کے مقاصد پر بھی غور کرنا ہوگا اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ تعاون کن کے مقابلہ میں ہے۔ روافض یا قادیانیوں کے مقابلہ میں اگر یہ تعاون ہو رہا ہے تو ظاہر ہے بہت مبارک ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبه العبد الضعیف

محمد میاں عفی عنہ

خادم درس حدیث وافتاء

مدرسہ امینیہ کشمیری گیٹ دہلی

۶ شوال ۱۳۹۰ھ/۶ دسمبر ۱۹۷۰ء

استدراک

تعداد احادیث وفتنہ وضع احادیث

کلکتہ کے طبیب حاذق مولانا الحاج حکیم محمد زمان الحسینی ان رجال عظیم میں ہیں کہ آپ کا مطب آپ کی علمی دلچسپیوں کے لیے حجاب نہیں۔ طبی مشاغل کے ساتھ مطالعہ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

یہی مضمون جو کتابی شکل میں آپ کے زیر مطالعہ ہے اس کی ابتدائی چند قسطیں روزنامہ الجمعیۃ میں شائع ہوئیں تو حکیم صاحب موصوف نے احقر کو لکھا:

"صحیح بخاری کے بارے میں آپ نے جس انداز سے تحریر فرمایا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں جتنی روایتیں درج فرمائی ہیں بس وہی صحیح ہیں۔ حالانکہ روایات مندرجہ فی البخاری کے علاوہ بھی روایات صحیح ہیں "عند البخاری" البتہ انہوں نے اپنی کتاب میں داخل نہیں فرمائیں طوالت کی بنا پر۔ بلکہ زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ ادخال فی الکتاب کے لیے انہوں نے صحت روایت کی عام شرائط کے علاوہ بھی کچھ خاص شرطیں رکھی ہیں۔ جو جو روایتیں ان خاص شرطوں کے معیار پر پوری نہیں تھیں اگرچہ وہ خود امام بخاری کے نزدیک بھی صحیح اور قابل استناد ہیں مگر امام نے ان کو اپنی کتاب میں داخل نہیں کیا۔ چنانچہ خود امام بخاری کا یہ مقولہ ہے۔

ما ادخلت فی کتاب الجامع الا ما صح وترکت کثیرًا من

الصحاح لحال الطول. (انتہی)

حکیم صاحب مدظلہ کی یہ تنبیہ و تذکیر بالکل صحیح ہے۔ احقر نے حکیم صاحب کی خدمت میں شکریہ کا خط لکھا اور عبارت میں ترمیم کردی۔ پہلے عبارت یہ تھی۔

''سو حدیثوں میں سے ایک حدیث اس قابل قرار پائی کہ اس کو وثوق کے ساتھ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا جا سکے۔''

ترمیم کے بعد یہ عبارت ہوگئی ہے۔

''سو حدیثوں میں سے ایک حدیث اس قابل قرار پائی کہ مصنف اس کو اپنی کتاب میں داخل کرسکیں باقی حدیثیں یا قابل اعتماد ہی نہیں یا اگر قابل اعتماد ہیں تو بخاری رحمہ اللہ کی شرائط کے مطابق نہیں۔''

(ملاحظہ ہو ص ۱۴ سطر ۱۷، ۱۸)

لطیفہ:

اس ترمیم و اصلاح میں ایک اور حقیقت بھی سامنے آ گئی کہ سات ہزار دو سو پچھتر کی جو تعداد بیان کی گئی ہے اس میں تین ہزار دو سو پچھتر حدیثیں مکرر ہیں۔ مکررات کو خارج کر دیا جائے تو جیسا کہ علامہ ابن صلاح اور شیخ محی الدین نووی رحمہما اللہ نے بیان کیا ہے صرف چار ہزار حدیثیں رہ جاتی ہیں۔ (مقدمہ فتح الباری الفصل العاشر)

تعداد احادیث:

لیکن بخاری رحمہ اللہ نے جو شرطیں لگائی ہیں ان کو نظر انداز کر کے محدثین کی شرائط کے بموجب احادیث کا انتخاب کیا جائے تب بھی تقریباً دس ہزار حدیثیں ہی ایسی ہیں جو قابل استناد اور قابل اعتماد ہیں جو صحاح اور سنن اور مسانید میں پھیلی ہوئی ہیں لیکن دوسری جانب یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عام احادیث کی تعداد دس لاکھ بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ مشہور محدث حضرت ابوزرعہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے پاس دس لاکھ حدیثیں محفوظ تھیں ان میں سے انتخاب کر کے انہوں نے اپنی مشہور تصنیف مسند احمد مرتب کی ہے۔

بہر حال بخاری شریف کی غیر مکرر احادیث کے لحاظ سے اگرچہ فرق ہو گیا، مگر مجموعہ احادیث کے لحاظ سے تناسب وہی رہا کہ سو روایتوں میں سے ایک روایت ایسی ثابت ہوئی جس کو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہا جائے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور تصنیف تدوین حدیث میں ان حضرات محدثین کے کتب خانوں کا ذکر کیا ہے جن میں وہ مجلدات رہتی تھیں جن میں یہ حدیثیں ہوتی تھیں جن کی تعداد دس لاکھ تک پہنچتی تھی۔

توضیح:

یہاں یہ وضاحت کر دینی بھی مناسب ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نہیں تھے بلکہ یہ سندوں کی تعداد ہوتی تھی۔ حضرات محدثین کی نظر چونکہ سندوں پر رہتی تھی اس لیے وہ ہر ایک سند کو حدیث کہا کرتے تھے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد انّما الاعْمَالُ بالنیّات اور دس سندوں سے روایت کیا گیا ہے تو اسی ایک ارشاد کو دس حدیثیں شمار کیا جاتا تھا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''باید دانست کہ نزد محدثین ہرگاہ کہ صحابی مختلف شد حدیث دیگر گشت گو الفاظ و معنی و قصہ متحد باشد برخلاف عرف فقہاء کہ نزد ایشاں اعتبار معنے ست فقط تاوقتیکہ اصل معنے واحد ست حدیث واحد ست بلکہ خصوصیات و اکراہ بر اصل معنی نزد ایشاں دخل ندارد و محض فائدہ و ماخذ حکم را می بینند۔ والحق نظر ایشاں کہ استنباط است ہمیں را تقاضاء صدمی کند۔
>
> (بستان المحدثین ص ۳۰)

فتنہ وضع احادیث، حق و باطل کا ایک معرکہ

اَنْزَلَ مِنَ السَّماء مَاءً تا كَذَالِكَ يَضْرِبُ اللہ الامثال (سورہ ۱۳ رعد، آیت ۱۷)

حق و باطل کی مثال اللہ اس طرح بیان فرماتا ہے۔

"آسمان سے بارش برستی ہے ندی اور نالے اس کو اپنی اپنی گنجائش کے بموجب اپنی آغوش میں لے کر سیلاب کی شکل اختیار کر لیتے ہیں کوڑا کرکٹ اور جھاگ اوپر آ جاتا ہے۔ دیکھنے والوں کے سامنے وہ جھاگ ہی ہوتا ہے۔ وہ اسی سے خوف زدہ ہوتے ہیں، لیکن سیلاب کی رو اس جھاگ کو بہا لے جاتی ہے۔ پھر وادی کا گوشہ گوشہ دیکھ جاؤ اس جھاگ کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔ اسی طرح جب چاندی سونا یا کسی اور طرح کی دھات آگ پر تپائی جاتی ہے تو جھاگ اوپر آ جاتا ہے پھر وہ جھاگ جو درحقیقت کھوٹ ہوتا ہے الگ ہو جاتا ہے اور خالص دھات الگ نکل آتی ہے۔ کھوٹ کے لیے نابود ہو جانا اور خالص دھات کے لیے باقی رہنا ہے۔"

سیّدنا حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز اس آیت کی وضاحت ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"یعنی لابدست کہ در ہر جنس خیر و شر باشد ہم چنیں لابدست کہ در آدمیاں نیکو کاراں و بدکاران باشند لیکن نیکو کاران را مستقرے سازد و کار ایشاں را پیش می رود و بدکاران را ہلاک میکند" (فتح الرحمٰن)

"مختصر یہ کہ حق و باطل کا معرکہ مسلسل رہتا ہے۔ باطل سینہ تان کر سامنے آتا ہے، لیکن اس کا یہ زور چند روزہ ہوتا ہے۔ پھر وہ ختم ہو کر بسا اوقات بے نام و نشان ہو جاتا ہے اور حق جو سراسر نفع ہوتا ہے وہ اپنی سادگی کے ساتھ قائم و دائم رہتا ہے۔"

غور فرمایئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ مبارک یعنی وہ دور جس میں حقیقت محمدی کا آفتاب بلا کسی حجاب کے کائناتِ ارضی پر ضیاپاش تھا۔ وہ مبارک دور جو بلاشبہ پوری کائنات کی آنکھ کا تارا اور جسم انسانیت کا قلب بیدار تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

بعثت من خير قرون بني آدم قرناً فقرناً حتى كنت من القرون الذى كنت منه (بخاری شریف ص ۵۳۰)

''یعنی اولاد آدم کی سعادت مندیوں (یا بالفاظ دیگر) نمود حق کے دور جو درجہ بدرجہ ترقی کرتے رہے۔ عروج کے اس نقطہ پر پہنچے کہ خود مرکز سعادت و ارشاد سیّد الانبیاء رحمۃ للعالمین صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا'' حتى كنت من القرون الذى كنت منه''۔

کیا کہنا اس دور کی سعادت مندی کا، اندازہ لگانا مشکل ہے فلاح انسانی اور سعادت روحانی کے اس عروج کا جو اس دور مسعود میں اس کو حاصل ہوا، مختصر طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ حق اپنے عروج کے آخری نقطہ پر پہنچ گیا تھا۔ اسی لیے اس کو خیر القرون فرمایا گیا۔

اچھا جب ''حق'' کو یہ عروج حاصل ہوا تو کیا باطل ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا تھا۔ نہیں، اس نے دوپہر کی چمکتی ہوئی روشنی میں اپنی دم سمیٹ لی اور ابھی وہ دور پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئے تھے جن کو خیر القرون فرمایا گیا تھا۔ ابھی تنزل کی دو [۳۴] ہی منزلیں گزری تھیں کہ یہ باطل انگڑائی لے کر سامنے آ گیا اور اس نے وہ روپ اختیار کیا جو خیر القرون کی طرح بے نظیر تھا۔ یعنی جس طرح کائنات کی تاریخ اس دور کی نظیر نہیں پیش کر سکتی جس کے متعلق ارشاد نبوی تھا (صلی اللہ علیہ وسلم) حتى كنت من القرون الذى كنت منه اسی طرح تاریخ عالم باطل کے اس روپ کی نظیر پیش نہیں کر سکتی جو اس نے اس وقت دھارا تھا اور اختیار کیا تھا۔

باطل کی زور آزمائی ملاحظہ ہو۔ ایک دو نہیں بلکہ ایک بہت بڑی جماعت وجود پذیر ہو گئی جن کی زبان پر ہر وقت کلام اللہ، کمریں رکوع میں جھکی ہوئی اور پیشانیاں زمین پر۔ ایسے قرآن خواں اور ایسے عبادت گزار کہ کسی اور دور کے نہیں، بلکہ خاص خیر القرون کے افراد، حضرات صحابہ کو بھی ان کی عبادت گزاری اور قرآن خوانی پر رشک آئے، لیکن دلوں کی حالت یہ کہ ایمان

سے بے بہرہ، خوف خدا سے نا آشنا، امین الانبیاء (صلوات اللہ علیہم اجمعین) کو ہدایت کریں کہ انصاف سے کام لیجیے۔ (معاذ اللہ) ان کے سچے پیروؤں کو (معاذ اللہ) کافر قرار دیں۔ کافروں پر رحم کریں اور اہلِ ایمان کے قتل کو ثواب سمجھیں (معاذ اللہ) کیا تماشا گاہ عالم میں اس طرح کا شعبدہ کبھی اور بھی دیکھا گیا ہے۔ اسلام کے بہت سے معجزوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خاتم الانبیاء سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اس باطل پرست گروہ کی خبر پہلے ہی دے چکے تھے۔[۳۵]

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سیّدنا علی، سیّدنا حضرت ابوسعید خدری اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہم کی ان روایتوں کو مختلف سندوں سے تقریباً بارہ مقام پر بیان کیا ہے۔ جن میں اس جماعت، اس کے بانی، پھر اس کے انجام کی وہ پیش گوئی جو لسانِ رسالت (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) سے صادر ہوئی تھی۔ الفاظ میں کہیں کہیں کسی قدر اختلاف ہے۔ مگر مضمون سب کا ایک ہی ہے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

> حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے کچھ سونا بھیجا۔ اقرع بن حابس، عینیہ بن بدر وغیرہما جو اپنے اپنے علاقوں کے بہادر اور نامور سردار تھے حال ہی میں مسلمان ہوئے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مانوس کرنا چاہتے تھے[۳۶]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سونا صرف انہیں سرداروں کو دے دیا۔ قبیلۂ قریش وغیرہ کے جو لوگ حاضر تھے ان میں سے کسی کو نہیں دیا۔ فوراً ایک شخص دامن سمیٹتے ہوئے کھڑا ہوا اور پکار کر کہا **اتق الله یا محمد**[۳۷]۔ محمد اللہ سے ڈرو۔ **یارسول الله اعدل**[۳۸]۔ اے رسول اللہ انصاف سے کام لیجیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس فقرے سے بہت صدمہ ہوا۔ فرمایا بندۂ خدا اگر میں انصاف سے کام نہیں لوں گا اور اگر میرے اندر خوف خدا نہیں ہوگا تو اور کس سے انصاف اور خوف خدا کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اگر میں بے انصاف ہوں تو بے شک میں خائب وخاسر ہوں۔[۳۹]

حضرت عمر[۴۰] رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد[۴۱] رضی اللہ عنہ وہاں حاضر تھے۔ (یکے بعد دیگرے) ہر ایک[۴۲] نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! اجازت دیجیے اس کی گردن اُڑا دوں۔ فرمایا نہیں! بہت ممکن ہے نماز پڑھتا ہو۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کتنے ہی نمازی ہوتے ہیں جن کی زبان پر وہ ہوتا ہے جو ان کے دل میں نہیں ہوتا۔

ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا:

مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ دلوں کو کریدوں اور نہ یہ حکم ہوا ہے کہ ان کے پیٹ چاک کروں، یہ شخص چل دیا۔ جب یہ پیٹھ پھیرے جا رہا تھا تو آنحضرت صلی اللہ نے اس پر نظر ڈالی۔ پھر فرمایا اس کے سلسلہ سے ایک قوم رونما ہوگی کہ جن کی زبانیں تلاوت کلام اللہ سے تر رہیں گی۔ مگر یہ تلاوت ان کے حلق سے آگے نہ بڑھے گی، نہ دل پر اثر انداز ہوگی اور نہ عنداللہ قبول ہوگی وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار کو پار کر کے نکل جاتا ہے[۴۳]۔

ارشاد ہوا کہ اس شخص کے ساتھی ہوں گے۔ ایسے نمازی، ایسے روزہ دار کہ تم اپنی نمازوں اور اپنے روزوں کو ان کی نمازوں اور روزوں کے مقابلہ میں حقیر سمجھو گے، مگر یہ دین سے ایسے نکل جائیں گے، جیسے تیر شکار کو پار کر کے نکل جاتا ہے۔ تیر کے پروں کو دیکھو۔ اس کی دھار دار نوک کو دیکھو۔ اس تانت کو دیکھو جس سے نوک (تیر کے پھل) کو کسا گیا ہے۔ پھر تیر کی اس سادی لکڑی کو دیکھو (جس میں تیر کا پھلکا لگا ہوا ہے) کہیں بھی کوئی نشان نہیں دیکھو گے۔ انتڑیوں میں بھری غلاظت اور رگوں میں دوڑنے والے خون کو پار کر کے یہ تیر نکلا ہے۔ مگر ان کا کوئی نشان اس تیر کے کسی حصہ[۴۴] پر نہیں ہے۔ (اسی طرح ایمان یا ان

کی اطاعت کے ثواب کا کوئی نشان ان ازلی مردودوں کے اُوپر نہیں ہوگا) یہ لوگ اہل اسلام کو قتل کریں گے اور بت پرستوں [45] کو چھوڑیں گے۔ [46]

نیز ارشاد ہوا۔ ان کا ظہور اس وقت ہوگا جب لوگوں میں پھوٹ پڑی ہوئی ہوگی [47]۔

چنانچہ ہادیٔ برحق، رسول برحق صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے بموجب اس جماعت کا ظہور عین اس وقت ہوا جب رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے وارث، حق وصداقت کے علمبردار، سفینۂ اُمت کے ناخدا، مقام صفین پر آپس میں نبرد آزما تھے اور ہر ایک نے اپنی طرف سے ایک حکم (پنچ) مقرر کر کے جنگ کو ملتوی کیا تھا۔ اس جماعت کا حشر اور انجام کیا ہوا۔ اس کو آگے بیان کیا جائے گا۔ اس وقت یہ عرض کرنا ہے کہ ۳۷ھ میں التوائے جنگ کے دور میں جب اس جماعت کا ظہور ہوا تو گویا ایک سیلاب تھا جو ملت اسلامیہ کی پوری وادی پر چھا گیا تھا۔ ایک دلکش جملہ ان الحکم الا للہ ان کی زبان پر تھا (کہ کسی ثالث یا پنچ کو فیصلہ کا کوئی حق نہیں فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ یہ دلکش جملہ (جس کی عملی [48] شکل اس کے سوا کچھ نہیں تھی۔ جس سے یہ لوگ گریز کر رہے تھے) صرف اس لیے ایجاد کیا گیا تھا کہ عقل وفہم سے بے بہرہ جذباتی لوگوں کو مغالطہ میں ڈال سکیں۔ چنانچہ اس مقصد میں یہ لوگ کامیاب ہوئے اور جیسا کہ صادق مصدوق جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی:

قوم حدثاء الاسنان سفہاء الاحلام [49]

(نوخیز ونوعمر اوچھی عقلوں والے جذباتی) لوگوں کی بھیڑ ان کے ساتھ ہوگئی۔

اب غور فرمایئے جو ان الحکم الا اللہ جیسی واضح آیات کے صاف مفہوم کو چھوڑ کر ایسے غلط اور مضحکہ خیز معنی اس کو پہنا رہے تھے جس کی وضاحت وہ خود نہیں کر سکتے۔ صرف اس لیے کہ ناسمجھ ونادان جذباتی انسانوں کو برانگیختہ کر کے اپنا ہم نوا بنا سکیں تو وہ قرآن پاک کی آیات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مبارکہ میں کیا کچھ ردوبدل اور تحریف نہیں کر سکتے تھے۔ ان سے کون کہہ سکتا تھا اور کوئی کہہ بھی دیتا تو ان بے گانگانِ صدق وصفا پر اس کا

اثر کیا ہوسکتا تھا کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب کرنے والے کا ٹھکانا جہنم ہے۔ بہت ہی پیچیدہ اور بہت ہی نازک صورت حال یہ تھی کہ جب یہ لوگ زہد و تقویٰ عبادت گزاری اور قرآن خوانی کے پورے مظاہرہ کے ساتھ پرہیز گاروں اور پاک بازوں کی شکل بنا کر کہتے قال رسول اللہ کذا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا) تو بجز ان کے جو ان کی سازشوں سے واقف تھے اور بھگت رہے تھے عام مسلمانوں کے لیے کب ممکن تھا کہ ان کی بات کو غلط گردانیں۔

اس جماعت کا زوال:

کلمہ خبیثہ اور دعوت باطل کی مثال اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں یہ دی ہے۔

كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ (سورۂ ابراہیم آیت ۲۶)

''جیسے گندہ درخت اُکھاڑ دیا گیا زمین کے اُوپر سے ہی (اس کی جڑ اوپر ہی رکھی تھی۔ جڑ سے اکھاڑنے کے لیے زمین کھودنی نہیں پڑی) نہیں ٹھہراؤ اُس کو۔

یہ حق کی نمائش کرنے والی باطل پرست جماعت نہ صرف اہل حق بلکہ خود حق و صداقت کے لیے خطرۂ عظیم تھی۔ منافقوں کا نفاق گناہ عظیم تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہنم کا سب سے نیچے کا طبقہ ان کے حصہ میں آیا، لیکن ان کے نفاق میں جارحیت نہیں تھی۔ انہوں نے اہل ایمان کے قتل کو اپنا نصب العین نہیں بنایا تھا، مگر اس جماعت کی خصوصیت یہ تھی:

یقتلون اهل الاسلام [۵۰]

''اہل اسلام کو قتل کریں گے''

تاریخ ایسے لرزہ خیز واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ ان بدبختوں نے بلاوجہ نیک بخت مومن کو قتل کیا اور اس کو جہادِ عظیم سمجھا۔ ابن ملجم وغیرہ اسی جماعت کے سورما تھے۔ جنہوں نے حرم مکہ معظمہ [۵۱] میں بیٹھ کر ہر سہ عمائدین یعنی سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ بظاہر اس جماعت کی یہ

جارحیت ہی تھی جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جماعت کی خصوصیات بیان فرمائیں تو یہ بھی فرمایا:

لَئِنْ ادر کتهم لا قتلنَّهُم قتل عاد [۵۲]

''اگر یہ لوگ میرے سامنے آ گئے تو یقیناً میں ان لوگوں کو ایسے ہی قتل کروں گا جیسے قوم عاد کو قتل کیا گیا۔'' [۵۳]

اُمت اسلامیہ کو یہ ہدایت فرمائی:

فمیهکم لقیتموهم فاقتلوهم فان فی قتلهم لاجرًا لمن قتلهم یوم القیامة [۵۴]

''جہاں ان سے مقابلہ ہو ان کو قتل کرو کیوں کہ جو ان کو قتل کرے گا قیامت کے روز اس کو اس قتل کرنے کا اجر ملے گا۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جماعت کی ایک علامت یہ بھی بتلائی تھی کہ اس جماعت میں ایک ایسا شخص ہوگا جو سیاہ فام ہوگا اور اس کا ایک بازو گوشت کے لوتھڑے یا پستان کی طرح ہوگا جو پھڑکتا رہے گا۔ [۵۵]

بہر حال یہ سعادت اللہ تعالیٰ نے فاتح خیبر سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص فرمادی تھی کہ اس جماعت سے آپ کی جنگ ہوئی اور آپ نے اس کا شیرازہ منتشر کردیا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ جو اس حدیث کے راوی ہیں جس طرح وہ اپنی روایت کی توثیق کے لیے فرمایا کرتے تھے۔

اشهد لسمعت من النبی صلی الله علیه وسلم

''میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے یہ ارشاد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہے۔''

ساتھ ہی آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔

واشهد ان علیًّا قتلهم وانا معه جیئ بالرجل علی النعت الذی نعت النبی صلی الله علیه وسلم. [۵۶]

''میں شہادت دیتا ہوں کہ سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو قتل کیا۔ میں آپ کے ساتھ تھا (جنگ ختم ہوئی) تو ایک مقتول لایا گیا جس کا حلیہ وہی تھا جس کی پیشین گوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔''

اس واقعہ کی تعبیر قرآنی الفاظ میں اس طرح کی جاسکتی ہے کہ یہ جماعت شجر خبیثہ تھی۔ زمین کی گہرائی میں نہیں بلکہ اُوپر کی سطح میں اس کی جڑ رکھی ہوئی تھی جس کو سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے اُکھاڑ کر پھینک دیا۔ (رضی اللہ عنہ)

واضعین حدیث:

بلاشبہ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے شجر خبیثہ کو اُکھاڑ کر پھینکا۔ ان کی سیاسی قوت کو چکنا چور کر دیا لیکن اس فرقہ کا آغاز جب فتویٰ تکفیر سے ہوا تھا تو اس کی سیاست ابتداء ہی سے مذہب بن گئی تھی۔ پھر اس میں اور عقائد کا بھی اضافہ ہوتا رہا۔ یہ مذہب آج تک باقی ہے اور جو اس مذہب سے وابستہ ہیں وہ ان تمام خصوصیات کے حامل ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''ان کی زبانوں پر اقوال ہوں گے جو خلق خدا کے اقوال میں بہتر مانے جاتے ہیں۔ **یقولون من خیر قول البریۃ**[۵۷]۔ یعنی آیات کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ زبانوں پر ہوں گی۔'' (خیر البریہ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دے کر بات کیا کریں گے)

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے بموجب ان کے دلوں میں ایمان کا نام و نشان نہ ہوگا تو لامحالہ جو آیات اور احادیث وہ استعمال کریں گے۔ بے محل استعمال کریں گے یعنی تحریف معنوی کریں گے اور یہ بھی ہوگا کہ جو قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہوگا۔ اس کے متعلق کہیں گے قال رسول اللہ یعنی احادیث وضع کریں گے۔

بہر حال ایک فرقہ یہ تھا جو وضع حدیث میں بے باک تھا۔ اس فرقہ کا ظہور ۳۷ھ میں ہوا اور اس سے بارہ سال پہلے عبداللہ بن سبا کی سازش شروع ہوگئی تھی۔ جس کی بنیاد ہی فرضی تحریروں پر تھی۔

مؤرخین کے متفقہ بیان کے بموجب (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے) عمال اور مقامی حکام کے متعلق وہ اپنی تحریروں میں غلط اطلاعات دیتے تھے۔ مثلاً کسی مقام پر کوئی مقدمہ ہوا نہ کوئی فیصلہ، مگر دوسری جگہ ظالمانہ فیصلہ کی اطلاع دے کر اپنے یہاں کے حاکم کو بدنام کر دیا۔ یہ ان کا ایک طے شدہ پروگرام تھا۔ اسی طرح وہ حضرات صحابہ کے نام سے خطوط لکھ کر لوگوں میں ہیجان پیدا کرتے تھے۔

جب یہ گمراہ اور باطل فرقے رونما ہو کر تلاطم برپا کر چکے تھے حتیٰ کہ سیاسی فرقہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے منصوبہ میں کامیاب بھی ہو چکا تھا تو کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق کوئی روایت صرف اسی صورت میں تسلیم کی جائے کہ وہ قرآن پاک کی تصریحات کے خلاف نہ ہو۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:

> ''بعض حضرات اس معاملہ میں یہ نرالا قاعدہ کلیہ پیش کرتے ہیں کہ ہم صحابہ کرام کے بارے میں صرف ایسی روایات قبول کریں گے جو ان کی شان کے مطابق ہوں اور اس بات کو رد کر دیں گے جس سے ان پر حرف آتا ہو۔ خواہ وہ کسی صحیح حدیث ہی میں وارد ہوئی ہو۔''

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں۔ بعض حضرات کا یہ قاعدہ کلیہ نرالا نہیں ہے۔ بلکہ اصول فقہ کا عام ضابطہ ہے کہ ایسی کوئی روایت قابل اعتماد نہیں ہوتی جو نصوص قرآن پاک کی آیات یا سنت مشہورہ کے خلاف ہو۔ قرآن پاک کی آیات صحابہ کرام کو ''راشد'' اور ایسا پاکباز قرار دیتی ہیں جنہیں کفر، فسق اور عصیاں سے گہری نفرت ہے جن کے دلوں میں ایمان سجا ہوا ہے۔ تو لامحالہ ایسی تمام روایتیں ناقابل تسلیم ہوں گی بلکہ ان کی تردید اور تغلیط لازم اور واجب ہوگی جن سے دامن صحابہ داغدار ہو۔ اگر وہ روایت بظاہر صحیح سند سے بھی ہو تب بھی وہ اس ''علت خفیہ'' کی وجہ سے سقیم ہوگی۔

دین متین کی حفاظت واستقامت

کلمہ طیبہ اور دعوت حق کی مثال کلام الٰہی نے یہ دی ہے۔

كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَا تؤتِي اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا (۱۳ سورہ ابراہیم آیت)

''جیسے پاکیزہ اور ستھرا درخت اس کی جڑ مضبوط زمین کی تہ میں اس کی پیلیں پھیلی ہوئیں اور اُس کی شاخ فلک بوس آسمان تک پہنچی ہوئی، لاتا ہے اپنا پھل ہر وقت اپنے رب کے حکم سے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے:

لایزال طائفة من امتی قائمة بامر الله لایضرهم من خذلهم ولا من خالفهم حتی یاتی امر الله وهم علی ذلک. (متفق علیہ)[۵۸]

''میری اُمت میں ایک ایسا گروہ ہمیشہ رہے گا جو خدا کے حکم پر قائم (اور ثابت قدم) رہے گا۔ کوئی ان کی مدد چھوڑ کر یا ان کی مخالفت کر کے اس کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔''

قسام ازل نے یہ سعادت عظمیٰ فاروق اعظم سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے لیے مقسوم فرمائی تھی کہ آپ کا فاتحانہ پرچم جہاں جہاں پہنچتا رہا۔ وہاں قرآن حکیم اور فرائض اسلام کی تعلیم کے ادارے آپ کے حکم سے قائم ہوتے رہے۔ یہ ادارے شہر اسلام کی پیلیں اور زمین کی رگوں میں گھسی ہوئی جڑ کی شاخیں تھیں جو نہ اس وقت اکھڑ سکیں اور چودہ صدیاں گزر چکنے کے بعد آج بھی ان کو اُکھاڑ پھینکنا کسی انسانی طاقت کے امکان میں نہیں ہے۔

علامہ ابن حزم تحریر فرماتے ہیں:

ولی عمر ففتحت بلاد الفارس طولاً وعرضًا فتحت الشام کلها والجزیرة ومصر ولم یبق بلد الا وبنیت فیه المساجد ونسخت فیه المصاحف وقرأ الائمة القرآن واعلموه الصبیان فی المکاتب

شرقاً وغرباً.

''زمام خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوئی تو فارس کے تمام شہر فتح ہو گئے۔ اس طرح پورا شام اور جزیرہ (دجلہ اور فرات کا درمیانی علاقہ) اور مصر فتح ہو گیا۔ ان علاقوں میں جو بھی شہر تھا اس میں مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ قرآن پاک نقل کیے گئے۔ ائمہ قرآن خود پڑھتے تھے اور مکتبوں میں بچوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔ شرقاً وغرباً (تمام مملکت میں یہی دستور تھا)۔ (الملل والنحل ج ۲ ص ۶۷)

کلهم قد اسلموا وبنوا المساجد ليس منها مدينة ولا قرية ولاحلة الاعراب الاوقد قرء فيه القرآن فى الصلوات وعلمه الصبيان والرجال والنساء.

''ممالک مفتوحہ کے تمام باشندے مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے مسجدیں تعمیر کرائیں۔ ان مفتوحہ علاقوں میں کوئی شہر کوئی گاؤں یا بدویوں کی کوئی فرودگاہ ایسی نہیں رہی تھی کہ جس میں نمازیں، قرآن شریف نہ پڑھا جاتا ہو اور بچوں، بڑوں اور عورتوں کو اس کی تعلیم نہ دی جاتی ہو۔'' (الملل والنحل ج ۲ ص ۶۶)

یہ قرآن پاک کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ تھا۔ احادیث مبارکہ اس وقت مرتب و مدون نہ تھیں کہ ان کو بھی مکاتب کے نصاب میں داخل کیا جاتا۔ البتہ روایت حدیث کے کچھ ضابطے مقرر فرما دیے اور کچھ حلقے قائم کر دیے۔ جہاں اکابر صحابہ احادیث بیان کرتے۔ مقدمات کا فیصلہ کرتے اور پیش آنے والے واقعات کے متعلق فتویٰ بھی صادر کیا کرتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''فاروق اعظم علماء صحابہ را با قالیم دارالاسلام روان ساخت و امر کرد با قامت در شہر ہا و بروایت حدیث در آنجا''[59]

اس طرح پوری مملکت میں بہت سے حلقے قائم ہو گئے۔ ان میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ

اور کوفہ مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ جہاں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے حضرات روایت حدیث اور افتاء اور قضاء کی خدمات انجام دیا کرتے تھے۔ ان حلقوں کی مرکزیت آج تک تسلیم کی جاتی ہے۔

حفاظت دین حق کے ان مرکزوں کے مقابلہ پر باطل نے بھی پر پھیلائے۔ وضع حدیث کی رفتار تیز ہوگئی۔ باطل پرستوں کی فن کاری کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ روایت حدیث کا ایک مدعی جابر بن یزید تھا۔ اس نے سلام بن مطیع سے کہا۔

عندی خمسون الف حدیث عن النبی صلی الله علیه وسلم.

''میرے پاس پچاس ہزار حدیثیں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔''

حضرت جراح بن ملیح سے بیان کیا کہ میرے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ستر ہزار حدیثیں ہیں جو جابر جعفی کے واسطے سے پہنچی ہیں۔ مگر اس جابر بن یزید کی شان یہ تھی کہ علماء کا خیال تھا کہ یہ خارجی ہے۔ اس کی تصدیق اس سے ہوئی کہ اس سورہ یوسف کی آیت فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰی یَاْذَنَ لِیْ اَبِیْ اَوْ یَحْکُمَ اللّٰہُ لِیْ وَھُوَ خَیْرُ الْحَاکِمِیْنَ کی تفسیر[60] وہ کی جو سبائی جماعت نے گھڑ رکھی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ زندہ ہیں یا دلوں میں ہیں اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے جو شخص امامت کا دعویٰ کرے ہم اس کا ساتھ نہ دیں یہاں تک کہ حضرت علی بادلوں میں سے یہ ندا دیں کہ فلاں کا ساتھ دو[61]۔

امام حدیث حضرت مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح مسلم کے مقدمہ میں حارث بن حصیرہ، ابوداؤد اعمٰی وغیرہ کے چند نام لیے ہیں اور فرمایا کہ اس طرح کے واضعین حدیث اور ان کے متعلق علماء حق کی تنقیدات اگر بیان کی جائیں تو ضخیم کتاب ہو جائے۔ یہاں چند نام بطور مثال پیش کیے ہیں تا کہ اصحاب فکر ونظر اصل صورت حال کا اندازہ کر سکیں[62]۔

لیکن وہ حضرات جو درس حدیث اور افتاء وغیرہ کے لیے ان مرکزوں میں قطب ارشاد تھے وہ اسلام اور دین حق کے مزاج شناس تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں

ان کی جو حاضری رہی تھی۔ اس نے ان کی فراست ایمانی کو کسوٹی بنا دیا تھا۔ وہ کھوٹ کو فوراً پہچان لیتے تھے۔ ظاہر ہے ارشادات صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار ان مخترعات کو کہاں میسر ہو سکتے تھے۔ بلکہ ان میں جو اختراع اور افترا کی تاریکی ہوتی تھی وہ فوراً ان روشن ضمیر حضرات کے آئینہ وجدان میں نظر آ جاتی تھی اور وہ ان روایتوں کی طرف التفات بھی نہیں کرتے تھے۔

روایت حدیث کا ایک مدعی بشیر بن کعب عدوی بھی تھا۔ وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور حدیثیں بیان کرنے لگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف التفات بھی نہیں فرمایا تو بشیر نے کہا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کر رہا ہوں اور آپ التفات بھی نہیں کرتے۔

سیّدنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یقیناً اس احترام کے مستحق ہیں کہ انسان سراپا گوش بن کر ان کو سنے اور یاد رکھے۔ ہماری بھی حالت یہ تھی کہ جب کوئی کہتا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ہمارے کان سراسر اشتیاق بن جاتے تھے۔ مگر جب لوگوں نے اس مقدس انتساب کے ساتھ رطب و یابس سب کچھ بیان کرنا شروع کر دیا تو اب ہم صرف انہیں روایتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن سے ہمارے کان پہلے سے آشنا ہوتے ہیں۔

ان پختہ کار بزرگوں کے طفیل سے وہ اہل علم بھی صراف بن گئے تھے جن کو ان اکابر سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ وہ فوراً پہچان لیتے تھے کہ یہ زر خالص ہے اور یہ کھوٹ ہے۔ چنانچہ یہی جابر بن یزید جس کا ذکر اُوپر گزرا، حضرت سفیان نے فرمایا کہ اس کی روایت کردہ تیس ہزار حدیثیں میرے پاس ہیں مگر میں قطعاً جائز نہیں سمجھتا کہ ان میں ایک روایت بھی بیان کروں۔[۶۳]

بہر حال ان علمی مراکز کی روشنی نے وضع حدیث کی تاریکی کو بڑھنے نہیں دیا لیکن سلسلہ احادیث میں یہ بات ضرور پیدا کر دی کہ ہر وہ روایت جس کو حدیث سے تعبیر کیا جائے اس قابل نہیں رہی کہ اس کو حدیث مان ہی لیا جائے۔ بلکہ اس کو حدیث اسی وقت مانا جائے گا جب وہ آیات قرآنی اور سنت مشہورہ کے مخالف نہ ہو۔

بہر حال سبائی پارٹی اور خوارج کی یہی فتنہ انگیزی اور ان کا یہی دجل و فریب تھا جس سے

بچنے کے لیے حضرات محدثین نے کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لیے ایک طرف یہ شرط لگادی کہ راوی صحیح العقیدہ ہو وہ خارجی، رافضی یا بدعت کا داعی اور بانی نہ ہو، دوسری طرف اس کا عملی پہلو یہ تھا کہ ہر ایک راوی کے ذاتی حالات واخلاق اور اس کے عقائد کی تحقیق شروع کردی۔ سینکڑوں پاک باز وخداترس طالبانِ حق ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں اس تحقیقات پر صرف کر دیں۔ تھوڑے سے راوی وہ ہیں جن کے بارے میں ان محققین کی آراء مختلف ہوئیں۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی زندگی کے تمام پہلوان کے سامنے نہیں آسکے۔ کسی کے سامنے زندگی کا وہ رُخ آیا کہ قابل اعتماد اور قابل تعریف تھا۔ کسی کے سامنے دوسرا رُخ آگیا جس نے اس کو نا قابل اعتماد گردان دیا۔ ان تھوڑے سے راویوں کے علاوہ تمام راوی وہی ہیں جن کے بارے میں حضرات محققین کی آراء متفق رہیں کہ وہ قابل اعتماد، ثقہ اور عادل ہیں یا نہیں۔ جن کے حالات معلوم نہیں ہو سکے ان کو مستور الحال یا مجہول قرار دیا اور ان کی روایتیں درجہ صحت سے ساقط مانی گئیں۔

اس تحقیقات کے سلسلہ میں ان حضرات کو ایک ایسی حقیقت کا انکشاف ہوا جس نے ان کے کام کو بہت پیچیدہ بنادیا۔ جس سے نجات پانے کے لیے ان کو ایک اور شرط کا اضافہ کرنا پڑا۔ یعنی صرف یہ بات کافی نہیں سمجھی گئی کہ راوی صحیح العقیدہ، صحیح الحافظہ اور پاک باز ہو، بلکہ یہ شرط بھی لگانی پڑی کہ ''متقن'' ہو۔ یعنی بیدار مغز ہو، تنقیدی نظر رکھتا ہو۔ مشتبہ حالات میں تحقیق و تنقید کے بعد کسی صحیح فیصلہ پر پہنچنے کی بھی صلاحیت اس میں ہو۔ کسی کی محض ظاہری حالت دیکھ کر اس کی ثقاہت اور عدالت کا فیصلہ نہ کردے بلکہ جو فیصلہ کرے وہ پوری طرح جانچ کر اور پرکھ کر فیصلہ کرے۔

پیچیدگی پیدا کرنے والی حقیقت یہ تھی کہ کچھ ایسے سادہ دل بزرگ سامنے آئے جنہوں نے ترغیب وترہیب کے لیے حدیثیں گھڑلیں۔ کہیں عبادت کا ثواب بہت مبالغہ سے بیان کیا تا کہ لوگوں میں شوق پیدا ہو اور اس اپنی تصنیف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا۔ کہیں کسی گناہ کا عذاب مبالغہ سے بیان کیا اور فرمادیا۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذا۔

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں:

والواضعون الحديث اصناف واعظمهم ضررا قوم من المنسوبين
الى الزهد وضعوا الحديث احتساباً فيما زعموا فتقبل الناس
موضوعا تهم ثقة منهم لهم وركونا اليهم ثم نهضت جهابذة
الحديث لكشف عوارها ومحوعارها والحمد لله (مقدمہ ابن صلاح)

''واضعین کی چند قسمیں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ ضرر رساں وہ
لوگ ہیں جو زہد کی طرف منسوب ہیں۔ (عابد وزاہد ہیں) مگر ایسے سادہ
کہ حدیث گھڑی لی اور سمجھتے یہ رہے کہ اس میں ثواب ملے گا۔ لوگوں
نے ان کی ظاہری حالت پر اعتماد کر کے ان سے عقیدت رکھتے ہوئے
ان کی موضوع روایتوں کو قبول کر لیا۔ پھر فن حدیث کے اعلیٰ ماہرین
اُٹھے تا کہ اس کمزوری کا پردہ چاک کر دیں اور اس کی خرابی کو مٹا دیں۔''

حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں احادیث کا اختلاط:

یہ سادہ مزاج اور عابد وزاہد۔ جیسے وضع حدیث میں سہل انگار تھے۔ روایت حدیث میں بھی ایسے ہی تھے۔ انہوں نے بہت سی وہ روایتیں بھی نقل کر دیں جو خوارج اور روافض کی موضوعات تھیں۔ اس وقت کتب تاریخ میں زیادہ تر روایتیں اسی قسم کی ہیں۔ اس لیے یہ درست ہے کہ آیات کلام اللہ اور احادیث رسول اللہ کے مقابلہ میں وہ ہیچ ہیں۔ نہ ان سے استسناد درست ہے نہ ان پر اعتماد کرنا صحیح۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حواشی

(۱) مودودی صاحب کی تصانیف سے جو برا اثر پڑتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک عالم جوان کی جماعت کے سرگرم ہیں ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ صحابہ کرام کو اگر حق کا معیار قرار دیا جائے تو صحابہ کرام نے تو چوری بھی کی ہے زنا بھی کیا ہے اسے بھی صحیح کہنا پڑے گا اور اس کی بھی پیروی کرنی پڑے گی۔

میں نے عرض کیا کہ صحابہ کرام میں فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے چوری کی تھی اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر سفارش رد کر کے سزا دی تھی۔ وہ تائب بھی ہو گئی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی تعریف میں فرماتی ہیں کہ وہ میرے پاس آیا کرتی تھیں اور حسنت توبتھا انہوں نے سچے دل سے توبہ کر لی تھی۔

اسی طرح حضرت ماعز رضی اللہ عنہ سے زنا سرزد ہوا اور ایک قبیلہ جہینہ کی عورت سے سرزد ہوا۔ ان دونوں نے نہایت سچے دل سے توبہ کی اور خود اپنے اوپر سنگساری کی سزا جاری کرائی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے اس عورت کو سنگسار کرایا ہے اور پھر اس کی نماز جنازہ پڑھا رہے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لقد تابت توبة لو قسمت بين سبعين من اهل المدينة وسعتهم وهل وجدت شيئا افضل من ان جادت بنفسها لله (ترمذی ج ا ص ۱۷۳)

”بلاشبہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ ستر اہل مدینہ میں تقسیم کی جاتی تو انہیں کافی ہوتی اور اس سے بھی افضل کوئی چیز تم نے دیکھی ہے کہ اس نے اپنی جان ہی خدا کے حکم کے لیے دے دی“۔

تو ان حضرات کا گناہ نہیں بلکہ سچی توبہ ہر گناہگار کے لیے مشعل ہدایت اور اُمید کا چراغ ہے۔ اس میں ان کا سچا ہونا گناہ سے پاک ہونے کا شدید رجحان اور خواہش ظاہر ہو رہی ہے جو

ان کے پاکیزہ اور کامل الایمان ہونے کی دلیل ہے اور حدیث شریف سکھانے والے میں اور دین پہنچانے والے میں سچائی اور گناہ سے بچنے کا رجحان ہونا اور توبہ وانابت میں مشغول رہنا یہی چیزیں شرط ہوتی ہیں۔ معصوم ہونا شرط نہیں وہ تو نبی کا خاصا ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ (سچی) توبہ کے بعد اللہ کا وعدہ ہے کہ گناہ بخش دیا جاتا ہے اور وہ ایسے ہو جاتا ہے جیسے اس نے گناہ ہی نہ کیا ہو۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

والذین اذا فعلوا فاحشةً او ظلموا انفسهم ذکروا اللّٰه فاستغفروا لذنوبهم ومن یغفر الذنوب الا اللّٰه ولم یصروا علٰی ما فعلوا وهم یعلمون اولٰئک جزاؤهم مغفرة من ربهم وجنات تجری من تحتها الانهار خالدین فیها. (پ۴، رکوع ۵)

"اور وہ لوگ کہ جب کوئی کھلا گناہ کر بیٹھیں یا اپنے حق میں برا کام کریں تو اللہ کو یاد کریں اور اپنے گناہوں کی بخشش چاہیں اور کون ہے گناہ بخشنے والا سوا اللہ کے اور وہ جانتے ہوئے اپنے کیے پر اڑے نہیں رہتے۔ انہیں کی جزاء ہے ان کے رب کی بخشش اور وہ باغ کہ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہ لوگ ہمیشہ ان باغات میں رہیں گے۔"

صحابہ کرام کو کسی نے گناہ سے معصوم نہیں کہا بلکہ ان کو سچا اور پاکیزہ طبیعت جاننا سب نے واجب قرار دیا ہے۔

(۲) ایک موقع پر جب آپ وصیت کی اجازت مانگ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا انا ذو مال میں صاحب دولت ہوں۔ (بخاری شریف ص ۲۳۲)

(۳) اسی طرح کے واقعات کے متعلق وحی الٰہی نے مسلمانوں کو تعلیم دی۔ ان جاء کم فاسق بنبأ (سورہ حجرات) اگر کوئی فاسق (ناقابل اعتماد شخص) تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو پہلے تحقیق کر لو۔ بظاہر حضرت ولید رضی اللہ عنہ کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ بلا تحقیق ایسے شخص کی خبر سے متاثر ہو کر واپس آ گئے تھے جس کو راوی نے شیطان کہا ہے۔ (واللہ اعلم)

(۴) یہ قاعدہ تھا کہ اہم گفتگو کے وقت بھی بات شروع کرنے سے پہلے خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ یعنی نحمدہ و نستعینہ الخ

(۵) مودودی صاحب ان مؤرخین کے بیان سے متاثر ہیں جنہوں نے کہا کہ چند کے سوا شہر میں کوئی صحابی ایسا نہیں تھا جو حضرت والا کی حمایت میں زبان کھولتا۔ (خلافت و ملوکیت ص

۳۳۰) لیکن غور کیا جائے تو ان دونوں بیانوں میں تضاد نہیں ہے جیسا کہ مودودی صاحب نے سمجھا ہے اور اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ اگر کوئی حامی نہیں تھا تو بلوائیوں سے گفتگو کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تیس آدمی کیسے چلے گئے۔ ہمارے خیال میں تضاد اس لیے نہیں ہے کہ بلوائیوں کے حامی اور ان کی سازش میں شریک صرف یہ تین آدمی تھے۔ باقی جملہ اہل مدینہ بلوائیوں کے دباؤ اور ان کے پروپیگنڈے سے ایسے متاثر اور دم بخود تھے کہ کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ مودودی صاحب دوسرے موقع پر خود یہی فرما رہے ہیں کہ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ اچانک مدینہ پہنچ گئے تھے اور انہوں نے اہم ناکوں پر قبضہ کر کے ایک حد تک اہل شہر کو بے بس کر دیا تھا۔ (خلافت وملوکیت ص ۱۱۹)

(۶) حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے ان لوگوں کی مخالفت کے اسباب کسی قدر وضاحت سے بیان فرمائے ہیں۔ آپ نے فرمایا محمد بن حذیفہ یتیم تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی پرورش کی۔ جب بڑے ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عہدہ کی فرمائش کی۔ آپ نے فرمایا بیٹا! اگر تمہارے اطوار اچھے ہوتے (لو کنت ادعی) پھر عہدہ طلب کرتے تو میں کوئی منصب دے دیتا، مگر خود تمہارے حالات اور اطوار ایسے نہیں ہیں کہ عہدہ تمہارے سپرد ہو (لست هناك) اس نے کہا مجھے اجازت دیجیے کہ میں کہیں باہر جا کر کوئی کام دیکھوں جس سے میرا گزران ہو سکے۔ فرمایا مناسب ہے جہاں مناسب سمجھو چلے جاؤ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے باہر جانے کی اجازت دی تو ان کو سامان بھی دیا، سواری کے لیے اُونٹ دیا اور نقد رقم دی۔ پھر جب مصر پہنچ گئے تو ان میں شامل ہو گئے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش کر رہے تھے اور حضرت عمار اس لیے ناراض تھے کہ ان کے اور عباس بن عقبہ کے درمیان بات چلی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دونوں کی تادیب کی۔ طبری ص ۱۳۵ ج ۵ محمد بن ابی بکر کی ناراضگی کی وجہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت سالم رضی اللہ عنہ نے یہ بیان کی کہ ان کی ناراضگی کا سبب تھا عجب اور طمع، عجب (خود پسندی) یہ کہ اسلام میں حیثیت تو ان کی وہ تھی جو سب جانتے تھے اور لوگوں نے ان کو چڑھا دیا کہ آپ کی شان بہت بڑی ہے۔ حالانکہ نہ عمر، نہ قابلیت، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ یعنی ۳۴ھ میں جب یہ شورش ہوئی ان کی عمر بیس سال کے قریب ہو گی۔ پھر ان میں ایک طرح کی اکڑ تھی (کانت دالة) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ مداہنت نہیں کی، بلکہ ان کی گرفت کی تو یہ ناراض ہو گئے۔ (طبری ص ۱۳۶ ج ۵)

یہ خیال رہنا چاہیے کہ حضرت سعید بن میسّب رضی اللہ عنہ اور حضرت سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اکابر تابعین میں سے ہیں۔ علماء کرام کے سرتاج ہیں۔ مدینہ کے ان سات فقہاء میں شمار ہوتے ہیں جو فقہ کی بنیاد مانے جاتے ہیں۔ محمد میاں۔

(۷) ملاحظہ فرمائیے۔ تاریخ طبری ص ۱۰۲ و ص ۱۰۳ ج ۵

(۸) چنانچہ محمد بن حذیفہ اور محمد بن ابی بکر میں اہلیت نہیں تھی، ان کو منصب نہیں دیا۔ اسی لیے وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش میں شریک ہو گئے۔ (محمد میاں)

(۹) الفاظ یہ ہیں۔ **اماحبی فانہ لم یمل معھم علی جور بل احمل الحقوق علیھم۔** (طبری ص ۱۰۳ ج ۵) یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری محبت ان کے ساتھ کسی ظلم پر مائل نہیں ہوئی۔ ان کی غلط بات کی میں نے کبھی حمایت نہیں کی بلکہ میں نے ان پر حقوق کا بوجھ ڈالا ہے۔

(۱۰) سیّدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے آپ کو یعنی حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور ایک دوسرے عزیز عبدالرحمٰن بن ثمرہ کو سیّدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور ہدایت کر دی کہ اُن کے یہاں جا کر دھرنا دے دو (واطلبا الیہ) کہ ہم صلح کیے بغیر نہیں جائیں گے اور جو شرطیں آپ پیش کریں گے سنرت معاویہ رضی اللہ عنہ اُن کو منظور کریں گے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔ ان دونوں نے کہا کہ ہم ہوں گے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان تمام شرائط کو منظور کریں۔ پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جو شرطیں پیش کیں، ان کو منظور کیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ان کو منظور کرایا۔ (بخاری شریف ص ۳۷۳)

(۱۱) روم نے مسلمانوں پر بڑے بڑے لشکروں سے چڑھائی کر دی ہے۔

(۱۲) ان کی وفات ہو گئی تو اس علاقہ کو بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے صوبہ میں داخل کر دیا۔ اسی طرح اردن کی شمولیت بھی حاکم اُردن کی وفات کے بعد ہوئی۔ (طبری ص ۶۹ ج ۵)

(۱۳) محمد بن ابی بکر کا واقعہ بھی تصدیق کے لیے کافی ہے۔ وہ بھی آپ کا رشتہ دار تھا۔ وہ بھی کوئی منصب چاہتا تھا مگر اس کے اطوار ناپسندیدہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ وہ اسی وجہ سے آپ کا دشمن ہو گیا۔ بلوہ میں پیش پیش رہا۔ ان میں وہ بھی تھا جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو گھر میں گھس کر شہید کیا۔ (محمد میاں)

(۱۴) علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح فتح مصر میں حضرت عمرو بن العاص کے ساتھ تھے اور ان کی فوج کے صاحب میمنہ تھے۔ تمام معرکوں میں ان کے شریک

رہے۔ وکان صاحب میمنه عمرو بن العاص فی افتتاحه مصر و فی حروبه هناک (الاستیعاب) حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ کان صاحب المیمنة فی الحرب مع عمرو بن العاص فی فتح مصر و له مواقف محمودة فی الفتوح (الاصابہ) ان دونوں حضرات کو مودودی صاحب بھی تاریخ اسلام کا بہترین مؤرخ مانتے ہیں۔

(۱۵) یعنی نہ طائف گئے نہ مدینہ آئے۔

(۱۶) بظاہر یہ مدت اتنی مختصر تھی کہ حضرت حکم سے جن کا قریبی تعلق نہیں تھا ان کو اس جانے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی چنانچہ ابن سعد کے مروی عنہ حضرات نے اس کا بھی ذکر نہیں کیا۔

(۱۷) خلفائے راشدین کے عمل یا قول دلیل ہوا کرتے ہیں۔ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ عطیہ ثابت ہو جاتا تو حضرات فقہاء اس دلیل سے کام لیتے۔ (محمد میاں)

(۱۸) اس زمانہ میں پریس نہیں تھا۔ کتابیں نقل کی جاتی تھیں اور وہی فروخت ہوتی تھیں، نقل کرنا بھی ایک باعزت پیشہ تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ جیسے اکابر اساتذہ کی کتابوں کے نقل کرنے والے معین ہوتے تھے، ان کو کاتب کہا جاتا تھا۔ ابن سعد کا یہی تعلق واقدی سے تھا اس لیے ان کو کاتب الواقدی کہتے ہیں۔ (محمد میاں)

(۱۹) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنو اُمیہ میں مستثنیٰ تھے کہ آپ کی سخاوت کے چشمے ہمیشہ موجزن رہے۔ جیسے ابولہب بنو ہاشم میں مستثنیٰ تھا کہ سود خوار بھی تھا اور حریص بھی ایسا کہ خزانہ کعبہ سے سونے کا ہرن چرا کر بیچ ڈالا۔ (معارف ابن قتیبہ)

(۲۰) ابو سفیان رجل سیک، بخاری ص ۸۰۷ رجل شحیح بخاری ص ۸۰۸

(۲۱) کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ پانچ لاکھ معاف فرما دیے تھے۔ اگر بفرض محال اس کو صحیح مان لیا جائے تو معافی تو بعد میں ہوئی سوال تو یہ ہے کہ ایک فقیر و مسکین کو یہ ہمت کیسے ہوئی کہ پانچ لاکھ کا سودا کرے۔

(۲۲) ابن اثیر وفی تاریخ ابن جریر الفتیٰ۔

(۲۳) عرب کے محاورہ میں اس جملہ کے یہ معنی بھی ہو سکتے کہ ایک خاص ڈھنگ پر حکم چلانا شروع کر دیا۔

(۲۴) واقدی نے ایک اور واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی طویل گفتگو ہوئی اس میں شکوے شکایتیں بھی تھیں۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منبر پر

رونق افروز ہو کر تقریر کی جس میں کچھ شکایتوں کا جواب تھا۔ کچھ اپنی پالیسی کی وضاحت تھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خاموش ہوئے تو مروان نے تقریر شروع کی۔ ''اگر آپ لوگ چاہتے ہیں تو ہمارے تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرسکتی ہے۔ پھر ایک شعر پڑھا، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آگے نہیں بولنے دیا۔ مروان کو خاموش کر دیا اور فرمایا یہ میرا اور میرے دوستوں کا معاملہ ہے۔ تمہیں بولنے کا حق نہیں ہے۔ میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تم کچھ نہ بولنا۔ (طبری ص ۹۸ ج ۵)

اگر یہ روایت صحیح ہے تو مودودی صاحب کا الزام اس سے بھی ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اوّل تو مروان کچھ کہہ ہی نہیں سکا اور اگر کہتا بھی تو یہ بھی ہنگامہ کے دوران کا واقعہ ہے۔ شورش پہلے سے شروع ہو چکی ہے۔ اس تقریر سے نہ شورش ہوئی نہ کسی صحابی کو شکایت کا موقع ملا۔

(۲۵) السابقون الاوّلون (تا) رضی الله عنهم ورضوا عنه (سورۃ توبہ، آیت ۷۰)

(۲۶) مقدمہ ابن خلدون فصل ۲۸ فی انقلاب الخلافة الی الملک.

(۲۷) مثلاً ذٰلک مثلهم فی التوراة ومثلهم فی الانجیل الخ (سورۂ فتح ۴۸ آیت ۲۹)

(۲۸) البتہ محکم کند برائے ایشاں دین ایشاں را کہ پسندیدہ است برائے ایشاں۔

(شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ)

(۲۹) محفوظ، تونگر، مستغنی اور بے نیاز، نصیبہ ور۔

(۳۰) بخاری شریف ص ۱۹۷ و ۳۹۸ و ۹۵۱ وغیرہ۔

(۳۱) انه کل ما ینبت الربیع یقتل اویلم ص ۳۹۸ بخاری شریف و ان کل ما انبت الربیع یقتل حبطا اویلم ص ۹۵۱ بخاری۔

(۳۲) سیّدنا خباب بن الارت رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے ان اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم مضوا ولم تنقصهم الدنیا بشیٔ۔ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم رخصت ہو گئے اور دنیا ان میں کوئی نقص پیدا نہ کرسکی۔ (بخاری شریف ص ۹۵۲)

(۳۳) مقدمہ ابن خلدون ص ۲۰۴۔

(۳۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم ثم یفشو الکذب ''سب سے بہتر میرا قرن ہے پھر ان کا دور جو اس قرن والوں سے اتصال رکھتے ہیں پھر ان کا جو اس قرن والوں سے متصل ہیں پھر کذب پھیل جائے گا۔'' حق و صداقت کی عام فضا باقی نہیں رہے گی۔ کذب اور باطل کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ پھر یہی فضا آگے بڑھتی رہے گی یہاں تک کہ وہ تاریکی آئے گی کہ ذکر اللہ ختم ہو جائے

گا۔ حق وصداقت کا نام نہ رہے گا بس قرون اول کا ختم ہو جانا تنزل کی پہلی منزل۔ پھر اسی طرح قرن ثانی کا ختم ہو جانا، تنزل کی دوسری منزل۔ (الی آخرہ)

(۳۵) پیشگی آگاہ کر دینے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کی خطرناکی بہت ہی غیر معمولی تھی۔

(۳۶) تاکہ ان کا ایمان پختہ اور یہ سرفروش و جان نثار مجاہدین وہ کارنامے انجام دیں جو انہوں نے بعد میں عہد فاروقی رضی اللہ عنہ اور دورِ عثمانی رضی اللہ عنہ میں انجام دیے۔ جن کے نقوش کتب تاریخ میں محفوظ و مرقوم ہیں۔

(۳۷) بخاری شریف ص ۴۷۲ اس شخص کا حلیہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ آنکھیں گڑی ہوئی، کلے چوڑے، پیشانی اُبھری ہوئی، گھنی ڈاڑھی سر گھٹا ہوا۔

(۳۸) بخاری شریف ص ۵۰۹ رسول اللہ، طنزاً کہا، یعنی آپ خدا کے رسول بنتے ہیں انصاف کیجیے۔

(۳۹) بخاری شریف ص ۵۰۹ وغیرہ۔

(۴۰) بخاری شریف ص ۵۰۹ وغیرہ۔

(۴۱) بخاری شریف ص ۶۲۴ وغیرہ۔

(۴۲) یکے بعد دیگرے۔

(۴۳) بخاری شریف ص ۶۲۴ وغیرہ۔

(۴۴) بخاری شریف ص ۱۰۲۴۔

(۴۵) یعنی سلسلہ قتل وقتال بت پرستوں کے بجائے مسلمانوں سے برپا کریں گے۔

(۴۶) بخاری شریف ص ۴۷۲۔

(۴۷) بخاری شریف ص ۱۰۲۴ و ص ۹۱۰۔

(۴۸) یعنی یہ صحیح ہے کہ فیصلہ وہی صحیح ہے جس کو خداوندی فیصلہ کہا جا سکے، لیکن خداوندی فیصلہ معلوم کرنے کی شکل یہی ہے کہ اہلِ علم معاملہ کی نوعیت کو سامنے رکھیں پھر ارشادات خداوندی یعنی قرآن پاک کی آیات پر نظر ڈال کر اس معاملہ کے متعلق کوئی حکم آیات واحادیث سے اخذ کریں اس وقت حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما اسی ارشاد کی تعمیل کر رہے تھے کہ ہر ایک نے اپنی طرف سے ایک حکم اور ثالث مقرر کر دیا تھا اور ان کے فیصلہ کے منتظر تھے۔

(۴۹) بخاری شریف ص ۵۱۰۔

(۵۰) بخاری شریف ص ۴۷۲۔

(۵۱) عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی، البرک بن عبداللہ التمیمی وعمر بن بکیر التمیمی۔

(۵۲) تاریخ الخلفاء ص ۱۲۳۔

(۵۳) بخاری شریف ص ۴۷۲۔

(۵۴) یعنی ان کو قوم عاد کی طرح بے نام ونشان کر دوں گا۔ (کرمانی والخیر الجاری)

(۵۵) بخاری شریف ص ۱۶۳۔

(۵۶) بخاری شریف ص ۵۰۹، ص ۱۰۲۴ وغیرہ

(۵۷) بخاری شریف ص ۱۰۳۴ ج ۲۔

(۵۸) بخاری شریف ص ۱۰۳۴ ج ۲، ترمذی شریف ص ۳۴ ج ۲ باب صفۃ الارقہ

(۵۹) مشکوٰۃ شریف باب ثواب ھذا الامۃ۔

(۶۰) ازالۃ الخفا ص ۲۱۵ ج ۲۔

(۶۱) یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بڑے بھائی کا قول ہے۔ جب یہ بھائی حضرت یامین کو لے گئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے یہ معاہدہ کر گئے تھے کہ ہم ان کے محافظ ہوں گے۔ اگر ہم سب ہی کہیں گھر جائیں تو مجبور رہیں گے ورنہ ہم عہد کرتے ہیں کہ ان کو پوری حفاظت کے ساتھ واپس لائیں گے۔ پھر صورت یہ پیش آئی کہ حضرت یامین بادشاہ کے پیالے کے چوری کے الزام میں روک لیے گئے تو بڑے بھائی جو سب کے سربراہ تھے انہوں نے باقی بھائیوں سے کہا کہ تم والد صاحب کے پاس جا کر واقعہ بیان کر دو اور اپنے متعلق کہا لن ابرح الارض یعنی میں تو یہاں سے اس وقت تک نہیں ہٹوں گا جب تک والد صاحب اجازت نہ دے دیں یا اللہ تعالیٰ کا کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔

(۶۲) مسلم شریف ص ۱۵ ج ۱۔

(۶۳) مسلم شریف ص ۲۰ ج ۱۔

(۶۴) مسلم شریف ص ۱۰۔